بسم اللہ الرحمن الرحیم

المنهاج الواضح

یعنی

راہ سنت

تالیف

محدث اعظم وامام اہل سنت و حامل علوم نبویہ

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ صفدریہ

نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (قرآن حکیم)

اور جو چیز تم کو رسول دے اُس کو لو اور جس چیز سے منع کرے اُس سے باز آ جاؤ!

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (متفق علیہ)

جس نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی چیز گھڑی، تو وہ مردود ہوگی!

(لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط (قرآن حکیم)

المنہاج الواضح

یعنی

راہِ سُنّت

جس میں بڑی تحقیق اور عرق ریزی سے اہل السُنّت والجماعت کے دلائل کا معیار اور بدعتِ لغوی اور شرعی کا مفہوم اور حکم، قرآن کریم، صحیح احادیث اور صدہا عبارات سے واضح کیا گیا ہے اور تمام مشہور بدعات (مثلاً میلاد، عُرس، قبروں پر چراغاں کرنا، قبروں کو پختہ بنانا، قبر پہ اذان کہنا، نماز جنازہ کے بعد دُعا کرنا، تیجہ، ساتواں، دسواں، چالیسواں، حیلۂ اسقاط، دورانِ قرآن وغیرہ وغیرہ) پر فرداً فرداً مفصل بحث کی گئی ہے، اور فریقِ مخالف کو مُسقط اور مسکت جوابات دیئے گئے ہیں اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اکابر علماء دیوبند پکے حنفی اور سُنّی مسلمان ہیں، ان کو وہابی وغیرہ کہنا سراسر بہتان، خالص افتراء اور سفید جھوٹ ہے!

مؤلفہ

ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر (فاضل دیوبند)

خطیب جامع مسجد گکھڑ، شیخ الحدیث و صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

ناشر: مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

طبع ۵۶ ....دسمبر ۲۰۰۹ء

۳۷

نام کتاب .... المنہاج الواضح (یعنی راہ سنت)

مصنف .... امام اہلسنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام مجدہم

مطبع .... مکی مدنی پرنٹرز لاہور

قیمت .... ۲۰۰/- (دوسو روپے)

ناشر .... مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

ملنے کے پتے

☆ ادارہ الانور بنوری ٹاؤن کراچی ☆ کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی

☆ مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان ☆ مکتبہ حقانیہ ملتان

☆ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور ☆ مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور ☆ مکتبہ الحسن اردو بازار لاہور

☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی ☆ کتب خانہ مجیدیہ بوہڑ گیٹ ملتان

☆ مکتبہ صفدریہ چوہڑ چوک راولپنڈی ☆ مکتبہ حلیمیہ درہ پیزو لکی مروت

☆ مکتبہ سلطان عالمگیر اردو بازار لاہور ☆ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور

☆ اسلامی کتب خانہ اڈا کامی ایبٹ آباد ☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

☆ مکتبہ عثمانیہ میانوالی روڈ تلہ گنگ ☆ مکتبہ الاظہر بانو بازار رحیم یار خان

☆ اقبال بک سنٹر نزد صالح مسجد صدر کراچی ☆ مکتبہ فاروقیہ ہزارہ روڈ حسن ابدال

☆ مکتبہ علمیہ جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک ☆ مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک

☆ مکتبہ رحمانیہ قصہ خوانی پشاور ☆ مکتبہ العارفی فیصل آباد

☆ مکتبہ فاروقیہ حنفیہ اردو بازار گوجرانوالہ ☆ والی کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ

☆ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ☆ ظفر اسلامی کتب خانہ جی ٹی روڈ گکھڑ

تصدیقاتِ اکابرینِ علماء دارُالعُلوم دیوبند

ضلع سہارن پور۔ ہند

(۱) فخر الاماثل حضرت مولانا الحاج القاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی اَمَّا بَعۡدُ : اسلام جامع اور کامل دین ہے نہ اس میں زیادتی کی گنجائش ہے نہ کمی کی۔ اس کے کامل ہونے کی شہادت تو قرآن کریم نے اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ سے دی ہے اور جامع ہونے کا ثبوت تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ سے پیش فرمایا ہے، جس سے اس دین کا جامع و کامل ہونا شہادتِ خداوندی سے ثابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب دین مجموعۂ علم و عمل کا نام ہے تو دین کے جامع و کامل ہونے کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے کہ اس کا علم بھی جامع و کامل ہے اور عمل بھی جامع و کامل ہے۔ اس کمال اور جامعیت کی تخصیص علمِ محض یا عملِ محض سے نہیں کی جا سکتی۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ قانون تو کامل ہو اور اس سے پیدا شدہ عمل ناقص اور ناتمام یا برعکس۔ پس ایک تکمیل دوسرے کی تکمیل کو طبعاً مقتضی ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ دین کے علم کا اساسی سرچشمہ قرآن حکیم ہے جس کا بیان حدیث ہے : فیہ نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم (الحدیث)۔ اور عمل کا سرچشمہ اسوۂ حسنہ ہے جس کی حامل ذاتِ بابرکات نبوی ہے :

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ (القرآن) بلاشبہ تمہارے لئے رسول اللہ میں نمونۂ عمل موجود ہے۔

پھر یہ دونوں باہم مطابق اور ایک دوسرے پر پورے پورے منطبق بھی ہیں چنانچہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب حضورؐ کے اخلاق کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ :

کے ساتھ عملاً قبول کیا جائے کہ اسی کا نام اتباعِ سنّت ہے۔ اس لئے اس دین کے کامل و جامع ہونے کی وجہ سے اس کے دو تقاضے نکلے۔ ایک **اخلاص** اور ایک **اتّباع**۔ اخلاص للہ سے عقیدہ وعمل خالص ہوتا ہے اور بعینہٖ وہی رہتا ہے جسے اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ پر اُتارا ہے۔ اور اتّباع سے عقیدہ وعمل باصواب ہوتا ہے اور ٹھیک اُس نمونہ کے مطابق رہتا ہے جو اُس کے رسولؐ نے کرکے دکھلایا ہے ظاہر ہے کہ یہی دو اصلیں دین کی بقاء و حفاظت اور انسان کی صلاح و فلاح کی ضامن ہوسکتی ہیں۔ اگر انمیں کمزوری راہ پا جائے گی تو اُسی حد تک ان کی ضدیں اُبھر کر دین کو فاسد بنا دیں گی۔ اگر اخلاص و توحید میں کمی آئے گی تو دین ایمان میں اُسی حد تک اُس کی ضد، شرک کی آمیزش ہو جائے گی:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ - (القرآن الحکیم) -	اور بہت سے ان میں مؤمن نہیں ہوتے کہ ساتھ ہی مشرک بھی بن جاتے ہیں۔

اور اگر اتباعِ سنّت میں کمی آجائے گی تو اُسی حد تک بدعت کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔

ما احدث قومٌ بدعةً الاّ رُفع مثلها من السنّة فتمسكٌ بسنّةٍ خيرٌ من احداث بدعة۔ (مسند احمد)	کسی بھی قوم نے کوئی بدعت (دین میں) ایجاد نہیں کی کہ اُس کی مثل سنّت اس قوم سے اُٹھا نہ لی گئی ہو۔ پس سنّت کو تھامے رہنے ہی میں خیر ہے بہ نسبت نئی نئی بدعات نکالنے کے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جیسے دین کی صلاح و فلاح کی دو اصلیں ہیں، **اخلاص اور اتّباع**، ایسے ہی دین کے فساد کی بھی دو ہی اصلیں ہیں جو اِن دو کی ضدّیں ہیں **شرك** اور **بدعة** پس جیسے اخلاص و اتّباع کے ہوتے ہوئے دین کبھی ضائع نہیں ہو سکتا، ایسے ہی اشراک و ابتداع کے ہوتے ہوئے دین کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے علماءِ اہل السنّت والجماعت نے ہمیشہ سنّت و بدعت میں امتیاز نمایاں رکھنے اور سنّت کو نکھار کر بدعت سے الگ کر دکھانے میں سرگرمی دکھلائی، اور کبھی تساہل اور سہل انگاری سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اُصول سے لے کر فروع تک سنّت و بدعت کو جُدا جُدا کرکے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے رکھ دیا ہے تاکہ دین اخلاص و اتّباع کی روشنی میں اپنے اصلی رُوپ کے ساتھ محفوظ رہے

وَ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن ۔ اور آپ کا اخلاق قرآن ہے ۔

اور ظاہر ہے کہ خُلُق عمل ہی کی قوّت کا نام ہے ۔ اس لئے حاصل یہ نکلا کہ کتاب و سنّت میں اس دین کے تمام علمی پہلو جمع ہیں اور ذاتِ نبوی میں اس کے تمام عملی پہلو مجتمع ہیں اور وہ بھی ایک دوسرے پر پورے پورے منطبق ۔ پس جو چیزیں قرآن میں علمی شکل میں ہیں وہی چیزیں ذاتِ نبوی میں عمل کی صُورت میں ہیں اور جن باتوں کو قرآن اصول و اقوال کی شکل میں پیش کرتا ہے انہی باتوں کو ذاتِ بابرکات نبوی احوال و اعمال کی شکل میں نمایاں کرتی ہے ۔ پس قرآن کا کہا ہوّا آپ کا کیا ہوّا ہے، اور آپ کا کیا ہوّا قرآن کا کہا ہوّا ہے ۔ اور یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے پر اس شان سے منطبق ہیں کہ نہ عملِ نبوی قرآن سے سرِ مُو منحرف ہے اور نہ علمِ قرآنی عملِ نبوی سے ذرہ برابر متجاوز ہے ۔ ورنہ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن کے کوئی معنی باقی نہیں رہ سکتے ۔

اس کمال مطابقت کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر قرآن کا علم اور قانون، جامع اور کامل ہے جس سے کوئی ہدایت چھوٹی ہوئی نہیں ہے تو نبوّت کا عملی اسوۂ حسنہ بھی یقیناً جامع اور کامل ہے جس سے دین کا کوئی عملی نمونہ رہا ہوّا نہیں ہے ۔ نیز اگر قرآن اور اس کے لائے ہوئے قانون میں کسی ادنیٰ کمی زیادتی کی گنجائش نہیں ہے تو عملی اسوۂ نبیؐ میں بھی کسی اضافہ و بیشی کی گنجائش نہیں ہوسکتی ۔ ورنہ وہ تطبیق و مطابقت باقی نہیں رہ سکتی جس کا دعویٰ قرآن پاک اور حرمِ پاک نبوی صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہے ۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جس طرح قرآن کے بعد نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے کسی جدید نمونۂ علم کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی نئی کتاب یا نوشتہ کی صورت میں نازل ہو، ایسے ہی نبوّت کے اُسوۂ حسنہ کے بعد کسی نئے نمونۂ عمل کی ضرورت نہیں ہوسکتی کہ اُسے لے کر کوئی مبعوث ہو یا اختراع کر کے عمل کا کوئی نیا ڈھنگ اور نیا رُوپ خود سے دین میں نکالے کیونکہ اگر اس دین کے علم یا عمل میں کمی بیشی کی گنجائش ہو تو یہ دین، دینِ کامل و جامع نہیں کہلایا جا سکتا، حالانکہ قرآن و حدیث اس کے کامل اور جامع ہونے کے مدّعی ہیں ۔ اندریں صُورت اس دینِ کامل کو ماننے کے معنی صرف یہی ہوسکتے ہیں کہ اس کے علم اور عقیدہ کو بھی بلا کمی بیشی اور بغیر اِدھر اُدھر جُھکے ہوئے یک رُخی کے ساتھ مانا جائے کہ اسی کا نام اخلاص و توحید ہے ۔ اور اسی کے نمونۂ عمل یعنی اسوۂ حسنہ نبوی کو بھی بغیر رسم و رواج کی آمیزش اور ایجاد و اختراع کے یکسوئی

اور شرک و بدعت کی آمیزشوں سے اُس کا نُورانی چہرہ داغ دار نہ ہونے پائے۔

ہندوستان کی ان آخری صدیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ اور ان کی نسبی اور حسبی اولاد کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُنہوں نے اس سُنّت و بدعت کی تفریق اور سُنّت کے دائرہ سے من گھڑت رسوم و رواج کے اخراج کو آخری حد تک پہنچایا، اور ان سارے اختراعات کو جنہیں دعویداران اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا دین کے پردہ میں پیش کر رہے تھے، دین کے مستحکم دلائل سے دفع کرنے کی عظیم مہم انجام دی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دَور میں یہ سعی عارفانہ رنگ سے نمایاں ہوئی، اُن کے فرزندِ جلیل حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے دَور میں فلسفیانہ انداز سے سامنے آئی، اُن کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کے دَور میں مجاہدانہ روش سے کھلی، اور اُن کے بعد جب دِلّی کی علمی مرکزیت ختم ہو کر دیوبند کی طرف منتقل ہوئی تو بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں علم و جہاد کے رُوپ میں آگے بڑھی، اور آخر کار دیوبند کے فیض یافتہ فضلاء کے ہاتھوں اُس نے جماعتی اور اجتماعی صُورت اختیار کر کے ہند و بیرونِ ہند میں پرے جما دیئے۔ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے، اور پھر اُن سے مستفیدین اگلے ہوں یا پچھلے، جو ہندوستان و پاکستان، افغانستان و ترکستان، برما و انڈونیشیا، حجاز و عراق میں لکھ ہا لکھ کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے کام کا مرکزی نقطہ یہی سنّت و بدعت کی تفریق اور یہی دین اور غیر دین کا امتیاز واضح کرنا ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند قدس سرّہٗ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) نے اِسی سنّت و بدعت کے فرق کو عقائد اور کلیاتِ دین میں نمایاں کیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرّہٗ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) نے اسی فرق کو فقہی جزئیات میں کھولا۔ حضرت تھانوی قدس سرّہٗ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) نے اسی فرق کو معاشرت و معاملات میں نمایاں کیا۔ ابنِ شیرِ خدا حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) نے اسی فرق کو مروّجہ رسوم میں واضح کیا، اور آج اُنہی اسلافِ صالحین کے ایک خلفِ رشید مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر نے اسی فرق کو اِس دَور کے ان عام مخترعات و محدثات میں مثبت و منفی پہلو سے محققانہ دلائل کی روشنی میں نہایت ہی واضح اور پاکیزہ انداز میں واشگاف کیا ہے جس کی

شاہدِ عدل ان کی حالیہ تصنیف "راہِ سُنّت" ہے۔

اس کتاب میں ممدوح نے محققانہ انداز میں سنن نبوی اور رسومِ مرّوجہ میں مدلّل اور موجّہ فرق دکھلاتے ہوئے بہت سے ایسے گوشے سلف کی عبارات، نبی اکرم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی روایات اور قرآن حکیم کی آیات سے کھول دیئے ہیں جو ابتک پس پردہ تھے، جن سے اخلاص و اتّباع کی دو اصلیں مضبوط سے مضبوط تر ہو کر سامنے آگئی ہیں اور شرک و بدعت کا حجّت و برہان کی رُو سے قلع قمع ہوگیا ہے۔ مولانائے ممدوح کا مطمحِ نظر کتاب زیرِ نظر میں ان مسائل کو جو مبتدعین کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں، اُن کے اصلی رُوپ میں پیش کرنا اور اُن پر بدعات کا جو سیاہ لبادہ ڈال دیا گیا ہے، اُسے اُتار پھینکنا ہے، جس میں وہ بحمداللہ تعالےٰ کامیاب ہیں اور اُن کے پیچھے حجّت و برہان کی زبردست کمک موجود ہے۔ مصنّف کی اَور دوسری لطیف تصانیف بھی جہاں تک نظر سے گذریں، محقّقانہ، منصفانہ اور متین اندازِ بیان کی حامل ہیں جو سنّت و بدعت اور دین و غیر دین کی تفریق کے سلسلہ میں مجادلہ و جدال کی دعوت نہیں دیتیں بلکہ شرحِ صدر، قوّتِ یقین اور عمل میں طمانیت و قناعت کی طرف لے آتی ہیں۔ یہ اسم بامسمّٰی کتاب "راہِ سنّت" بھی حقیقتاً راہِ سنّت کی داعی ہے جس سے جدل کا ذوق پیدا نہیں ہوتا کہ جدل بدعت اور گمراہی کا خاصہ ہے نہ کہ سُنّت اور ہدایت کا۔ ارشادِ نبوی ہے:

ماضل قوم بعد ھدیً کانوا علیہ الا اوتوا الجدل۔ (ترمذی)

کوئی قوم بھی ہدایت کے بعد جس پر وُہ تھی، گمراہی پر نہیں آتی کہ اس میں جدال و نزاع کے جراثیم پیدا نہ ہو جاتے ہوں۔

چنانچہ حضورؐ کی یہ پیش گوئی اہلِ بدعات کے حق میں سر کی آنکھوں سے مشاہدہ میں آرہی ہے کہ وہ رات دن بدگوئی، درشتت کلامی، تفریق بین المسلمین، گالم گلوچ، قتل و غارت گری، فساد و خون ریزی اور اشتعال انگیزی کے دبے ہوئے پنہانی غیظ و غضب کے ساتھ ہر وقت آمادۂ فساد نظر آتے ہیں۔ گویا اُن کی حجّت و برہان ہی زبان کی گالی اور ہاتھوں کی درازدستی ہے ع

درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں

بخلاف اہلِ سنّت کے کہ اُن کی زبانیں متین، کلام مہذّب، لب ولہجہ صادق اور انداز علم دانادہ کا ہے۔ تصانیف وتقاریر میں کسی غیظ وغضب کا اظہار نہیں کسی بھی موقعہ پر وہ جذباتی رنگ میں اشتعال انگیزی کرکے تفریقیں ڈلواتے نہیں پھرتے، کیونکہ ان کی حجّت وبرہان کتاب وسُنّت ہے۔ جس کی روشنی میں وُہ مدعا کا اثبات کرتے ہیں اور مدّعا بھی خود اپنا نہیں رکھتے، وہ مدّعا بھی اللہ ورسول کا ہوتا ہے جسے وُہ نقل کرکے اُس کے دلائل سے پردہ اُٹھا دیتے ہیں۔ اس عمل میں ظاہر ہے کہ بدتہذیبی اور ناشائستگی کی قدرتاً گنجائش ہی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ان خرافات کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ کیونکہ یہ اُمور از قسم جہالت ہیں اور دعوائے حق اور دلائلِ صادقہ از قسم علم ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ علم جہالتوں کی مدد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ان کا دستِ نگر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ رسالہ زیرِ نظر "راہِ سُنّت" کا اندازِ بیان، لب ولہجہ اور طریقِ استدلال بھی انہی محققانہ اوصاف کا حامل ہے کیونکہ وہ سنّتوں کی دعوت دے رہا ہے جن کے لئے علم وتہذیب کفایت کرتے ہیں نہ کہ بدعات وخرافات کی، جن کے لئے جہالت اور جاہلانہ انداز ناگزیر ہے۔ اس متین انداز اور علمی رنگ کی تحقیقات سے کوئی شبہ نہیں کہ مصنّفِ ممدوح نے نہ صرف مسائل کا اثبات ہی کر دیا ہے بلکہ خصوم پر حجت بھی قائم کر دی ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۵

رہا تعصب وعناد، سو اس کا معالجہ کسی کے پاس نہیں۔ اُس کا تیر بہدف علاج یا آخرت کی قیامت ہے یا دُنیا کی قیامت۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔

حق تعالیٰ مصنّف ممدوح کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کی اس سعیِ جمیل کو قبول فرمائیں اور طالبینِ حق کو اُن کی مساعی سے مستفید ہونے کی توفیق بخشیں۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ۔

وباللہ التوفیق

محمد طیّب غفرلہٗ۔ مدیر دارالعلوم دیوبند

۲۹ رجب ۱۳۷۷ھ یوم الاربعاء

---

(۲) حضرت مولانا السیّد مہدی حسن صاحب دامت فیوضہم

صدر مفتی دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ نحمدہ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم ۔ میں نے "المنہاج الواضح" یعنی "راہِ سنّت" مؤلفہ محترم مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خان صاحب صفدر اطال اللہ بقاءہ کو پڑھا۔ زبان شستہ و صاف، لہجہ دل آویز، جدال و رنگِ مناظرانہ سے دُور اور مضامین کی جامع کتاب ہے۔ بدعات کے سلسلہ کی اپنے رنگ کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں بدعات کا ردّ نئے اسلوب سے کیا گیا ہے اور اتّباعِ سُنّت کو بطریقِ احسن ثابت کیا گیا ہے۔ یہ دوسری کتاب مولانا موصوف کی میری نظر سے گزری ہے جس میں آیات و احادیث اور محقّق علماء کے اقوال مذکور ہیں، اور ہر امر مدلّل ہے۔ ہر ایک عامی و خاصی کیلئے مفید ہے۔ اس کے مطالعہ سے بدعت و سنّت کی حقیقت نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اہلِ اہوا کے لئے بھی مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس تالیف کو مقبولِ خاص و عام بنائے اور مؤلف مذکور کو جزائے خیر عنایت کرے اور اس سے زیادہ ہمت و توفیق بخشے کہ گم کردہ راہوں کی راہبری کرتے رہیں اور مخلوق اُن کے فیض سے مستفید ہوتی رہے۔ آمین!

سیّد مہدی حسن، صدر مفتی دار العلوم دیوبند ۲۲ ؍ ۷ ؍ ۷۶ھ

(۳) حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم

سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان، شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

راہِ سُنّت کو میں نے مطالعہ کیا جو مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خان صاحب نے ردِّ بدعات میں لکھی ہے اور عصرِ حاضر کی اکثر بدعات کی محقّقانہ تردید اس میں موجود ہے۔ مبتدعین کے اعتراضات اور دلائل کے جوابات نہایت عالمانہ اور دلکش انداز میں دیئے گئے ہیں۔ بدعتِ شرعیہ کے حدود کو اس طرح متعیّن کرنا کہ اُمورِ انتظامیہ تعلیمیہ (مثلاً قیامِ مدارسِ دینیہ، امتحان، نصابِ تعلیم، تدوینِ قواعدِ عربیہ، طباعت و اشاعت علومِ اسلامیہ) اشغالِ صوفیہ اور مباحاتِ متجدّدہ ان سے خارج ہوں۔ اور عقائد و اہواء متحزبہ اور قربات و اعمالِ مختلفہ متعلّقہ بالاموات وغیرہ ان میں داخل ہوں، ایک علمی اور دقیق مبحث ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مصنّف موصوف نے اس اہم مورچہ کو ایک بڑی حد تک سر کر لیا ہے اور اس عظیم مبحث کو نہایت خُوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حل کر دیا ہے۔ میرے خیال میں مصنّف دام فضلہٗ کی تمام تصانیف اگرچہ بجائے خود بہت مفید ہیں، لیکن یہ کتاب دیگر تصانیف کی نسبت عوام و خواص دونوں کے لئے بے حد نافع ہے۔ احقر اپنے حلقہ کے علماء کرام و طلبہ کو مشورہ دیتا ہے کہ اس کتاب کی طرف توجہ فرمائیں۔ فقط والسّلام

شمس الحق عفا اللہ عنہ۔ ترنگ زئی پشاور

فہرست مضامین

تمت بالخیر

عرضِ حال

خدا تعالیٰ کا وہ پسندیدہ اور پیارا دین جو سب ادیان و مذاہب کا ناسخ اور قیامت تک اقوامِ عالم کے لئے راہنما ہے، جس کو امام الانبیاء، خاتم النبیّین اور سیّد الرسل حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے بدنِ مبارک کا خون بہا کر اور طرح طرح کی اذیتیں اور صعوبتیں برداشت کرکے خدا تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچایا تھا اور جس کو افضلُ البشر بعد الانبیاء حضرت ابوبکرؓ سے لے کر ایک چھوٹے صحابی نے اپنی جانی اور مالی قربانی کے ذریعہ روئے زمین پر پھیلانے کی انتھک اور کامیاب کوشش کی اور جس کو تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ اور محدثینؒ اور فقہائے کرامؒ نے اپنی زندگیاں وقف کرکے بعد کے آنے والوں تک پہنچایا اور جس کی سادہ اور فطری تعلیم اور ٹھوس دلائل نے اقوامِ عالم کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ موافق و مخالف اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی پیش کی ہوئی شریعت اور قانون کی اہلِ یورپ نے بھی وہ تعریف کی جس سے بڑھ کر شاید ممکن نہ ہو چنانچہ مسٹر گبن صاحب لکھتے ہیں کہ "محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا یہ حکم کہ وہ عورتیں جو لڑائی میں قید کی جائیں اپنے بچوں سے قطعاً جُدا نہ کی جائیں، ایک ایسا حکم ہے جس پر دنیا کے تمام مؤرخین کی نکتہ چینیاں جو انہوں نے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر کی ہیں، قربان کی جاسکتی ہیں"۔

- باسورتھ اسمتھ صاحب لکھتے ہیں کہ: "محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی زندگی تمام ریفارمرز سے عظیم الشان اور بلند پایہ ہے"۔
- میور صاحب معترف ہیں کہ "تمام نبیوں اور پیغمبروں کے کاموں سے مشکل ترین کام محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا تھا۔
- کارلائل صاحب اس اقرار پر مجبور ہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) مجسّم رحم اور عفو تھا۔ اس کی تمام زندگی یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کی حمایت میں گزری۔ یہ اُس شخص کی زندگی تھی جو خدا کے لئے پیدا ہوا

اور خدا کے لئے انتقال کر گیا۔ اگر کسی آدمی نے اپنی زندگی خدا اور خدا کی راہ میں وقف کی، تو وہ یقیناً محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تھا۔

○ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لفظ قرآن کے تحت لکھا ہے کہ "محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تمام نبیوں اور دینی کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ کامیاب تھا"۔

○ لیونارڈ صاحب کہتے ہیں کہ "اگر کسی نے زمین پر خدا پا لیا، اگر کسی نے خدا کی راہ میں اپنی زندگی وقف کر دی، اگر کسی شخص کی زندگی کا نصب العین محض نیکی کا پرچار تھا۔ تو وہ یقیناً عرب کا پیغمبر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تھا۔

دیکھا آپ نے کہ اہلِ یورپ بھی حق بات لکھنے اور کہنے پر مجبور ہیں ع والفضل ما شھدت بہ الاعداء۔ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیش کردہ وہی صحیح اور سچا دین و مذہب تمام ممالک میں پھیلا اور ہندوستان میں بھی پہنچا۔ گیارھویں صدی ہجری میں وہی خالص اسلام جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعینؒ، اور محدثین و فقہاء نے احتیاط کی چھاننی میں چھان کر محفوظ رکھا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان میں جاگزین ہوا، اور قرآن کریم، حدیث اور فقہ و تصوف وغیرہ کی جو خدمت انہوں نے کی وہ اور کسی کی قسمت میں نہ تھی۔ سچ ہے کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اور اسی مبارک خاندان کے علمی چشموں اور ناپیدا کنار سمندر سے اکابرینِ علماء دیوبند شکر اللہ تعالیٰ مساعیہم فیض یاب ہوئے، جو اصلی مسلمان، حقیقی سُنّی اور صحیح معنیٰ میں حنفی ہیں اور ہند و پاک میں اہل السنت والجماعت صرف اور صرف علماء دیوبند ہیں یا جو اُن کے ساتھ عقائد میں متفق ہیں اور بس! انہی اکابر نے جہاد ۱۸۵۷ء میں انگریز مردود کے خلاف دہلی، پانی پت اور سونی پت وغیرہ کے میدانوں میں اپنی جانیں پیش کیں اور تیرہ ہزار کے قریب علماء کرام کو انگریز نے تختۂ دار پر لٹکایا، اور انگریز کیلئے کم و بیش سو۱۰۰ سال تک اکابرینِ علماءِ دیوبند، کیا ہندوستان اور کیا بیرونِ از ہند ایک ناگہانی مصیبت بنے رہے۔ ان اکابر نے تقریر و تحریر اور اپنے عمل سے برطانیہ کی حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنا شروع کر دیں۔ مگر برطانیہ تو ابلیسِ سیاست تھا، اُس نے ان اکابر کو مسلمانوں

کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل کرنے کے لئے ایسے ایسے حربے استعمال کئے کہ الامان و الحفیظ، اور ان کی تکفیر کیلئے بڑے بڑے مولوی اور مفتی خریدے گئے اور ان اکابر پر جس طرح افتراء اور بہتان مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی نے باندھے ہیں اور کسی سے یہ خدمت ادا نہیں ہو سکی۔ انہوں نے ان اکابر کو کافر اور مرتد قرار دینے کے لئے اور وہابی وہابی کہہ کر عام مسلمانوں کو ان سے نفرت دلانے کے لئے وہ کوشش کی کہ خدا کی پناہ۔ اور اُس زمانہ میں جب کہ ظالم انگریز نے ممالکِ اسلامیہ پر جاں گداز مظالم ڈھائے اور ہندوستان میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی پوری مہم شروع کی اور دینِ اسلام کو مٹانے کی ناپاک کوشش جاری رکھی، خان صاحب بریلوی نے اعلام الاعلام بانّ ھندوستان دارالاسلام نامی ایک کتاب لکھ کر ظالم انگریز کی حکومت میں ہندوستان کو دارالاسلام کا خطاب دیا۔ اور خان صاحب خود دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ "ہندوستان بفضلہٖ دارالاسلام ہے" (بلفظہٖ احکامِ شریعت حصہ دوم ص۸۷)۔ اور صراحت سے دھوکہ دیا کہ ہمارے امامِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلکہ علمائے ثلاثہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مذہب پر ہندوستان دارالاسلام ہے، ہرگز دارالحرب نہیں اھ۔ اور خدا تعالیٰ اور رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وفادار مسلمانوں کو کافر اور مرتد قرار دیا۔ چند عبارتیں خان صاحب کی ملاحظہ ہوں :

"ایسے ہی وہابی، قادیانی، دیوبندی، نیچری، چکڑالوی جملہ مرتدین ہیں کہ ان کے مرد یا عورت کا تمام جہان میں جس سے نکاح ہوگا مسلم ہو یا کافر، اصلی یا مرتد، انسان ہو یا حیوان محض باطل اور زنا خالص ہوگا اور اولاد ولد الزنا"۔ (ملفوظات حصہ دوم ص۱۰۵) ——— آج کل کے وہابی، رافضی، قادیانی نیچری، چکڑالوی جھوٹے صوفی کہ شریعت پر ہنستے ہیں بحکم دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اس سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا۔ اُس کا نکاح کسی مسلم، کافر، مرتد، اُس کے ہم مذہب یا مخالف مذہب، غرض انسان حیوان کسی سے نہیں ہو سکتا جس سے ہوگا محض زنا ہوگا، مرتد مرد ہو خواہ عورت، مرتدوں میں سب سے بدتر منافق ہے۔ یہی ہے وہ کہ اس کی صحبت ہزار کافر کی صحبت سے زیادہ مضر ہے کہ مسلمان بن کر کفر سکھاتا ہے خصوصاً وہابیہ دیوبندیہ کہ اپنے آپ کو خاص اہلِ سنّت وجماعت کہتے، حنفی بنتے، چشتی نقشبندی بنتے، نماز روزہ ہمارا سا کرتے ہماری کتابیں پڑھتے پڑھاتے اور اللہ و رسول کو گالیاں دیتے ہیں (لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ صفدر)

یہ سب سے بدتر زہر قاتل ہیں"۔ (احکامِ شریعت حصہ اوّل ص۱۶) ——— "رافضی، تبرائی، وہابی، دیوبندی وہابی غیر مقلد، قادیانی، چکڑالوی، نیچری، ان سب کے ذبیحے محض نجس مُردار حرام قطعی ہیں۔ اگرچہ لاکھ بار نامِ الٰہی لیں اور کیسے ہی متقی پرہیزگار بنتے ہوں کہ یہ سب مرتدین ہیں۔ ولا ذبیحۃ للمرتد" (احکامِ شریعت حصہ اوّل ص۶۸) ——— "احکامِ دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اور مرتدوں میں سب سے خبیث تر مرتد منافق رافضی، وہابی، قادیانی، نیچری، چکڑالوی کہ کلمہ پڑھتے، اپنے آپ کو مسلمان کہتے، نماز وغیرہ افعالِ اسلام بظاہر بجالاتے، بلکہ وہابی وغیرہ قرآن و حدیث کا درس دیتے لیتے، اور دیوبندی کتبِ فقہ کے ماننے میں بھی شریک ہوتے، بلکہ چشتی نقشبندی وغیرہ بن کر پیری مریدی کرتے اور علماء و مشائخ کی نقل اُتارتے اور بایں ہمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی توہین کرتے (لعنۃ اللہ علی الکٰذبین) یا ضروریاتِ دین سے کسی شے کا انکار رکھتے ہیں۔ ان کی کلمہ گوئی و ادّعاءِ اسلام اور افعال و اقوال میں مسلمانوں کی نقل اُتارنے ہی نے ان کو اخبث و اضر اور ہر کافر اصلی یہودی نصرانی، بُت پرست، مجوسی سب سے بدتر کر دیا" (احکامِ شریعت حصہ اوّل ص۶۹) ——— "یہی مثال روافض و وہابیہ کی ہے کہ روافض مثل نصاریٰ کے محبت میں کافر ہوئے، اور وہابیہ مثل یہود کے عداوت میں"۔ (احکامِ شریعت حصہ دوم ص۱۲۲) خان صاحب اپنا تائید کردہ ایک طویل استفتاء نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں ـ "غلام احمد قادیانی، اور رشید احمد اور جو اُس کے پیرو ہوں جیسے خلیل احمد انبیٹھی اور اشرف علی وغیرہ، ان کے کفر میں کوئی شُبہ نہیں نہ شک کی مجال بلکہ جو اُنکے کفر میں شک کرے بلکہ کسی طرح کسی حال میں انہیں کافر کہنے میں توقف کرے اسکے کفر میں بھی شُبہ نہیں"۔ (حسام الحرمین ص۱۳۶، و فتاوٰی افریقیہ ص۱۰۲ طبع کراچی) امیر حسن، امیر احمد سہسوانی، نذیر حسین دہلوی، قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، خلیل احمد انبیٹھوی، اشرف علی تھانوی وغیرہم اور بعض دیگر فرقوں کے نام لے کر آخر میں لکھتے ہیں: ومن جملۃ ہؤلاء الطوائف السبع کلھم کفار مرتدون وخارجون عن الاسلام باجماع المسلمین خلاصہ کلام یہ ہے کہ باجماع المسلمین یہ سات فرقے اور انکے بانی کافر، مرتد اور اسلام کے دائرہ سے خارج ہیں۔ (المستند المعتمد بناء نجاۃ الابد ص۲۵۱ مکتبہ حامدیہ لاہور)

دیوبندیوں کے بارے میں مسلمانوں سے آخری اپیل، جو انہیں کافر نہ کہے، جو ان کا پاس لحاظ رکھے، جو ان کے استادی یا رشتے یا دوستی کا خیال کرے وہ بھی انہیں میں سے ہے۔ اُنہیں کی طرح کافر ہے، قیامت میں ان کے ساتھ ایک رسّی میں باندھا جائے گا۔ (فتاوٰی افریقہ ص۱۱۵)

یہ تمام عبارتیں خان صاحب کی ہیں اور اپنی جگہ پہ واضح ہیں، مزید تشریح کی حاجت نہیں ہے۔ اب آپ فریقِ مخالف کی مشہور ومعروف کتاب تجانب اہل السنّت کی چند عبارتیں بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ اس کتاب پر شیرِ بیشہ مولوی حشمت علی صاحب وغیرہ کی تصدیقات موجود ہیں۔

○ "بحکمِ شریعت مسٹر جینا (قائداعظم مسٹر محمد علی صاحب جناح) اپنے عقائدِ کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے"۔ (ص۱۲۲)

○ "ان صلح کل لیڈروں میں اعظم گڑھ کے مولوی شبلی اور الطاف حسین حالی اور زمانۂ حال کے مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال بہت نمایاں ہستی رکھتے ہیں، انکی صلح کلیت اپنی حد سے گذر کر شدید نیچریت اور دہریت تک پہنچی ہوئی ہے"۔ (ص۲۸۹)

○ "وہابیہ دیوبندیہ وقادیانیہ وروافض ونیاچرہ وخاکساریہ وچکڑالویہ واحراریہ وجتادھاریہ (حسن نظامی دہلوی کے مرید) وآغاخانیہ ووہابیہ غیر مقلدین ووہابیہ نجدیہ ونیگیہ غالیہ وصلح کلیہ غالیہ اپنے عقائد کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بناء پر بحکمِ شریعت قطعاً یقیناً اسلام سے خارج اور کفار ومرتدین ہیں۔ جو مدعی اسلام ان میں سے کسی کی قطعی یقینی اطلاع رکھتے ہوئے بھی اس کو مسلمان کہے یا اس کے کافر مرتد ہونے میں شک رکھے یا ان کو کافر مرتد کہنے میں توقف کرے وہ بھی یقیناً کافر مرتد ہے اور بے توبہ مرا، تو مستحقِ نارِ ابد"۔ (ص۴۵۳)

○ "فرقہ احرار اشرار بھی فرقہ نیچریہ کی ایک شاخ ہے۔ اس ناپاک فرقے کے بڑے بڑے مکلبین (کتّے) یہ ہیں بھکی شیخ جی امام الخوارج مبلغ وہابیہ ایڈیٹر النجم عبدالشکور کاکوری، صدر مدرسہ دیوبند حسین احمد اجودھیا باشی، شبیر احمد دیوبندی (پاکستان کے سابق شیخ الاسلام)، عطاء اللہ بخاری، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، احمد سعید دہلوی نائی عن الاسلام (مفتی) کفایت اللہ شاہجہان پوری، عبدالغفار سرحدی گاندھی۔ اس فرقہ کا سرغنہ مسٹر ابوالکلام آزاد ہے جو امام الاحرار کہلاتا ہے"۔ (ص۱۶)

غرضیکہ ہندوستان کا کوئی فرقہ اور مسلمانوں کا کوئی بھی مشہور عالم اور لیڈر ایسا نہیں ہے جو اس غالی فرقہ کے نزدیک کافر، مرتد اور خارج از اسلام نہ ہو حتیٰ کہ اگر کوئی ان کے کفر میں شک اور توقف بھی کرے تو وہ بھی کافر مرتد اور مستحقِ نارِ ابد ہے۔ یہیں معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں کہ "اور بیشک امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایسے ہی فرقوں کے حق میں فرمایا ہے کہ حاکم کو ان میں سے ایک کا قتل ہزار

کافروں کے قتل سے بہتر ہے کہ دین میں ان کی مضرت زیادہ سخت تر ہے" (حسام الحرمین ص۱۷۱) ۔ اور اب تو اس غالی فرقہ نے مظلوم دیوبندیوں کو شہید کرنا اور ان پر قاتلانہ حملے کرنے بھی شروع کر دیئے ہیں چنانچہ ہفت روزہ پاکستانی لائل پور میں لکھا ہے کہ موضع وارنی تھانہ کوٹ سمابہ بہاولپور میں رضاخانی بریلویوں نے ۲ دو دیوبندی اہل السنّت والجماعت کو کلہاڑیوں سے شہید کر دیا اور ۲ دو کو شدید زخمی کیا ۔ احمد پور شرقیہ کے قریب موضع زندہ محمد شاہ میں رضاخانیوں نے وہاں کے دیوبندی اہل السنّت والجماعت نمبردار حاجی سردار جنڈوا خان صاحب کو نماز کی حالت میں شہید کر دیا ۔ لورالائی کوئٹہ کی مسجد کے دیوبندی اہل السنّت والجماعت امام (مولانا محمود الحسن صاحبؒ) کو علم غیب کے مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے سکھ کہہ کر جام شہادت پلا دیا گیا ۔ ساہیوال کے نزدیک ایک گاؤں میں رضاخانیوں نے ایک دیوبندی سُنّی کو شہید کر دیا (اور ایسے ہی کئی واقعات علماء دیوبند سے پیش آتے رہے ہیں کہ ان کو بریلوی حضرات نے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ، اور اُن کے ناحق خون سے زمین رنگین کی) ۔ اور اسی پرچہ کے صفحہ ۱ کالم ۱ میں ہے ۔ چند دنوں کا واقعہ ہے کہ (لائل پور میں) مسجد فیکٹری ایریا کے دیوبندی امام پر بریلویوں نے مولوی محمد عمر (صاحب) اچھروی کی قیادت میں قاتلانہ حملہ کر دیا ۔ حملہ آوروں کو موقع پر گرفتار کر لیا گیا جس سے دیوبندی امام کی جان بچ گئی ـــ یہ ہیں وہ حالات و واقعات اور اسباب و محرکات جن کے تحت ہم اپنی پوزیشن کو واضح کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہمارا کوئی ایک مسئلہ بھی قرآن کریم اور حدیث شریف اور فقہ حنفی کے خلاف نہیں ہے اور ہم پکے سُنّی اور حنفی مسلمان ہیں اور بدعات کے جملہ مشہور مسائل پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔ مسئلہ حاضر و ناظر پر راقم کی کتاب "تبرید النواظر" کئی سالوں سے اور شرک کی حقیقت اور پکارنے وغیرہ پر "گلدستہ توحید" عرصہ سے طبع ہو چکی ہیں ۔ مختار کُل کے مسئلہ پر "دل کا سُرور" کی طباعت ہو چکی ہے "مسئلہ علم غیب اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بشریت پر کتابیں زیر ترتیب ہیں اور اکابرین علماء دیوبند کی عبارتوں پر جو قطع و برید کر کے اعتراضات کئے گئے ہیں اُن کے پورے اور مفصّل جوابات زیر تجویز ہیں[1] ۔ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ ۔

احقر

۲۱ محرم ۱۳۷۷ھ ۔ ۱۸ ر اگست ۱۹۵۷ء   ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر

---

[1] اب ازالۃ الریب ، تنقید متین اور عبارات اکابر کا پہلا حصہ طبع ہو چکا ہے ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بابِ اوّل

شرعی دلائل اور براہین کے بیان میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى۔ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ (وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَجَمِيْعِ اُمَّتِهٖ) وَسَلَّمَ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط

خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ بار شکر ہے کہ اُس نے ہمیں انسان بنایا۔ پھر انسان بنانے کے بعد ہمیں مسلمان بننے کی توفیق عنایت فرمائی اور پھر مسلمان ہونے کے ساتھ ہمیں امام الانبیاء سیدالرسل خاتم النبیّین حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اُمّت ہونے کا لازوال شرف مرحمت فرمایا۔ اگر ہم اسکی اَن گنت اور بے حد و تعداد نعمتوں کا شُکر بجا لانا چاہیں تو یہ ایک ناممکن امر ہے اور ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ بلکہ ہم اس کی نعمتوں کو شمار بھی نہیں کرسکتے۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ چہ جائیکہ ہم اس کے نعمات و حسنات کا حق ادا کرسکیں۔

قرآن کریم ہدیٰ قانون، کامل ضابطۂ حیات اور مکمّل دستورالعمل ہے | گو حسبِ تصریح علماءِ اصول دلائل و براہین چار قسمیں ہیں۔ کتاب اللہ۔ سنّتِ رسول اللہ۔ اجماع اور قیاس۔ مگر اجماع اور قیاس درحقیقت کتاب و سنّت ہی کی طرف راجع اور اسی کا ثمرہ ہے۔ لہٰذا کائنات کی رہبری کے لئے اصولی طور

ہدایت دو حصوں اور درجوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جو جمیع اُصول، تمام پختہ و غیر متغیر اور لازمی احکام اور اعمال پر مشتمل اور انسانی تصرف سے بالاتر اور اپنے الفاظ میں محفوظ و منضبط اور ہمیشہ کیلئے مکلّف مخلوق کی ہدایت کا نصاب ہے اور اس ہدایت کے سرچشمہ کا نام وحیِ متلو اور قرآن مجید ہے۔

مذہب اور قانونِ فطرت اس معیار اور مقیاس کا نام ہے جو متقرّر و معیّن ضابطہ اور قانونِ کُلّی کی حیثیت رکھتا ہو۔ سچّا اور صحیح مذہب اور آئین صرف وہی ہوتا ہے جس کی بنیاد حقیقی سچّائی اور عالمگیر حقانیت پر ہو، اور جس کے ذریعہ عقائد و اعمال اور اخلاق کو اچھّا یا بُرا کہا جا سکے اور جس کے رُو سے باطنی اور ظاہری اصلاح ہو کہ عذاب سے بچا جا سکے اور جس کے اُصول قطعی اور اٹل ہونے کے ساتھ ایسے جامع ہوں جو کائنات کی دینی اور دنیوی حاجت روائی کے لئے کافی ہوں۔ فطرت چونکہ حقیقی صداقت ہے اس لئے مذہبِ اسلام کی بُنیاد خالقِ فطرت نے فطرت پر رکھی ہے اور جس کی بابت یوں ارشاد فرمایا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط (پ ۲۱، الروم، رکوع ۴)۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ قانونِ فطرت ہے جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے (یعنی انسانی فطرت اسی دین کے موافق ہے) اور اس قانون میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

سچّا مذہب وہ ہوتا ہے جو من جانب اللہ قطعی اور محکم طریقہ سے منکشف ہوتا ہے اور ہر صحیح الفطرت اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ وہ بنایا نہیں جاتا اور نہ اس میں مخلوق کی ایجاد و احداث کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ غلط اور نادرست مذہب کی شناخت یہ ہوتی ہے کہ اس کی بُنیاد اُن خیالات اور اوہام پر قائم کی جاتی ہے جو دل کی دنیا میں پیدا ہوتے اور خواہشات کے دریا اور طوفان میں بہ جاتے ہیں، اور نفس الامر سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ فطرت سے بے گانہ اور حقیقت اور صداقت سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ گو ان کی ظاہری چمک دمک سادہ لوح اور سطحی قسم کے لوگوں کی نارسا آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے، اور وہ اس سے متاثر ہو کر اِس دامِ ہمرنگِ زمین کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قانون سازی کا منصب کس کو حاصل ہے اور اس کے لوازمات کیا ہیں؟ جسقدر مستقبل سے متعلق کسی کو زیادہ علم ہوگا، اُسی قدر وہ زیادہ صحیح قانون اور آئین بنا سکے گا۔ مخلوق کے پاس مستقبل سے متعلق علم

حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل، تجربہ، قیاس اور حواس وغیرہ سب کے سب محدود، ناتمام اور ناقص ہیں، اس لئے مخلوق کے مجوزہ قوانین کبھی ناقابلِ ترمیم نہیں ہو سکتے۔ مُلک اور ملت کے چیدہ چیدہ اور منتخب قانون ساز بڑی کوشش اور کاوش سے بسیار بحث و تمحیص کے بعد ایک قانون تجویز کرتے ہیں مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس میں ترمیم کا پیوند لگانا پڑتا ہے اور ہمیشہ اس امر کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور تاقیامت ہوتا رہے گا۔ ہر قانون اور آئین کے بنانے کا ایک مدّعا اور مقصد ہوتا ہے۔ قانون ساز کو اگر قانون پر عمل کرنے والوں کے ساتھ شفقت اور ہمدردی ہے اور وہ ان کا حقیقی خیر خواہ اور خود غرضی سے بالاتر ہے تو وہ ایسا قانون بنائے گا جس سے قانون پر چلنے والوں کو نفع اور فائدہ پہنچے گا، اور اس بات کے تسلیم اور یقین کر لینے میں کیا تامّل ہو سکتا ہے کہ مفید اور ناقابلِ تنسیخ قانون صرف وہی بنا سکتا ہے جو ہر لحاظ سے کامل علم رکھتا اور بہمہ وجوہ علیم و خبیر ہو، حقیقی ہمدرد اور مہربان ہو، خود غرضی سے بے نیاز اور مطلب پرستی سے بے احتیاج اور بے پرواہ ہو۔ ظاہر ہے کہ مخلوق سے متعلق خالق کے سوا علمِ تام اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مخفی نہیں کہ الرحمٰن سے زیادہ مہربان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اور پوشیدہ نہیں کہ الصمد سے بڑھ کر بے نیاز اور کوئی نہیں۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہو سکتی جو مخلوق کے لئے کامل و مکمل اور ناقابلِ ترمیم قانون اور آئین بنا سکے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط۔ اور بھلا اس کی موجودگی میں کسی دوسرے کو قانون بنانے اور حکم کرنے کا حق بھی کیا ہے؟ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس قادر و مقتدر خدا کا بنایا ہوا قانونِ فطرت تمام موجودات میں جاری اور ساری ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات سب اُس کے قانون میں (جس کو سنّت اللّٰہ یا قانونِ قدرت کہا جاتا ہے) جکڑے ہوئے ہیں اور کسی میں اس کی خلاف ورزی کی تاب نہیں وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ط اور اگر ہم خدا تعالیٰ کے اس قانون میں (جس کو لاآف نیچر کہتے ہیں) ترمیم و تنسیخ کا اختیار رکھتے تو سرو کے درخت میں آم اور بادام پیدا کر دیتے۔ بیروں اور کھجوروں میں گٹھلیاں پیدا نہ ہونے دیتے۔ گدھے کے سر پر سینگ پیدا کر دیتے، یا گدھے کے سر کی طرح گائے بیل اور بھینس کے سر سے سینگ الگ کر دیتے اور اپنی اس حماقت اور جہالت کو عقل و دانائی قرار دے کر اُس مصلحت اندیشِ حقیقی کے قانون میں

اصلاح و ترمیم کرنے والے بن جاتے - لیکن اس کا قانون ہماری دسترس سے باہر، ہر عیب و سقم سے پاک، ہر اعتبار سے ناقابلِ ترمیم اور تمام موجوداتِ عالم میں پوری طاقت اور شوکت کے ساتھ نافذ ہے اور تمام مخلوقاتِ عالم ایک ذرۂ بے مقدار سے لے کر آفتابِ عالمتاب تک، ثریٰ سے لے کر ثریا تک اور فرش سے لے کر عرش تک اس کی تعمیل اور فرمانبرداری میں ہمہ تن مصروف اور بے اختیار ہے -

قانونِ خداوندی کا نافذ کرنے والا بالذّات انسان ہی ہے مخلوقاتِ عالم میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کو خدا تعالیٰ نے خاص قسم کی صلاحیت اور استعداد عطا فرما کر ایک محدود دائرہ میں آزاد ارادہ اور اختیار دے دیا ہے، اور اس آزاد ارادہ اور اختیار کے لئے اس کو قانون دے کر اس کی تعمیل چاہی ہے - اسی قانون کا نام دین اور مذہب ہے اور اسی کی تعلیم اور یاد دہانی کے لئے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے اور اسی سلسلۂ تعلیم کو امام الانبیاء سید الرسل خاتم النّبیین حضرت محمّد مصطفٰے احمد مجتبےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مبعوث ہو کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اسی کا آپ کی وفاتِ حسرت آیات سے اکیاسی (۸۱) روز قبل ہزاروں کی تعداد میں اُن قدسی صفات اور پاک نفوس کے بھرے مجمع میں میدانِ عرفات کے اندر نویں ذوالحجہ کو جمعہ کے دن اور عصر کے وقت یہ اعلان کروایا گیا کہ :

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (پ ۶ - المائدہ - رکوع ۱) -	آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمّل کر دیا اور تمہارے اُوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے مَیں نے دین اسلام کو پسند کیا۔

اس اعلانِ خداوندی کا یہی منشا ہے کہ قیامت تک اب دین میں کسی ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافہ کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ گنجائش - ہدایت کے لئے جن احکام کی ضرورت تھی وہ اُصولاً سب نازل کر دیئے گئے ہیں - اب جو شخص دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرتا ہے جس کی تعلیم جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اُمّت کو نہیں دی تو گویا وہ در پردہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ دین نامکمّل اور میری ترمیم کا محتاج ہے، یا وہ اس کا مدّعی ہے کہ معاذ اللہ تعالےٰ حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے باوجود رؤف اور رحیم ہونے کے اپنی اُمّت کو بہتر، اعلیٰ اور مکمّل طریقہ نہیں بتایا - الغرض جس طرح اس کا

قانونِ قدرت، ترمیم و تنسیخ اور مخلوق کے دستِ بُرد سے بالاتر ہے، اِسی طرح اس کا قانونِ شرع بھی ترمیم و تنسیخ اور تنقیص و اضافہ سے بالاتر ہے۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ اس میں ترمیم کر سکے، اور کسی دانش فروش کا کیا حوصلہ ہے کہ وہ اس کو ناقص اور ناقابل قرار دے کر اس میں اضافہ اور اصلاح کا مدّعی ہو سکے۔ کوئی حکمت اور دانائی کی ایسی بات نہیں جو قانونِ خداوندی میں موجود نہ ہو۔ انسانی زندگی کا کوئی بھی کُھلا اور چُھپا ہوا شعبہ ایسا نہیں جس کے شائستہ بنانے کا نہایت مکمّل اور ناقابلِ ترمیم دستورِ عمل اس میں نہ پیش کیا گیا ہو۔

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرّجال

کتاب اللہ کی ہمہ گیر صداقت اور دینِ اسلام کا مکمّل ہونا اپنوں کی نگاہوں میں

(۱) امیر المؤمنین خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ (المتوفی ۲۳ھ) نے ایک خاص موقعہ پر ارشاد فرمایا:

انا کنّا اذلّ قوم فاعزّنا اللہ بالاسلام فمہما نطلب العزّ بغیر ما اعزّنا اللہ بہ اذلّنا اللہ۔ (مستدرک ج ۱ ص ۶۱ و ج ۳ ص ۸۲۔ وقال الحاکمؒ والذہبیؒ صحیح)۔

ہم ایک ذلیل و خوار قوم تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دینِ اسلام کی وجہ سے عزّت دی۔ جب بھی ہم کسی ایسے طریقہ سے عزّت حاصل کرنا چاہیں گے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عزّت نہیں دی (یعنی وہ اسلام کے خلاف ہو) تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل اور رسوا کر کے چھوڑے گا۔

(۲) خلیفۂ راشد اور پہلی صدی کے مجدد حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ (المتوفی ۱۰۱ھ) نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: "امّا بعد! تمہارے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے، اور خدا تعالیٰ نے جو مکمّل کتاب آپ پر نازل کی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری کتاب آنے والی نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نے جو چیز حلال کر دی ہے وہ قیامت تک حلال رہے گی، اور جو چیز حرام کر دی وہ قیامت تک کے لئے حرام رہے گی۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں، میں تو صرف احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں" (سیرت ابنِ جوزیؒ ص ۱۰۸) ۔ اسی کے آگے یوں ارشاد فرمایا:

الا و انّی لست بمبتدع ولکنّی خبردار! میں بدعتی نہیں، بلکہ میں تو متبع

متّبع ۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۱۰۱) ۔ — سُنّت ہوں ۔

(۳) امام دارِ ہجرت حضرت امام مالکؒ (المتوفّی ۱۷۹ھ) بدعات کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

من ابتدع فی الاسلام بدعۃً یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمّدا صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم خان الرّسالۃ لان اللّٰہ تعالیٰ یقول اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الاٰیۃ فما لم یکن یومئذ دینا فلا یکون الیوم دینًا۔

جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے تو گویا اُس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ادائیگیِ رسالت میں خیانت کی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن مَیں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمّل کر دیا ہے ۔ (الآیہ) ۔ پس جو چیز اس وقت دین نہ تھی، آج بھی ہرگز دین نہیں ہو سکتی ۔

(کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۴۷ و ج ۲ ص ۱۵۰ للشاطبیؒ)

(۴) علامہ حسام الدّین علی متّقی الحنفی (المتوفّی ۹۷۵ھ) بدعات اور اہلِ بدعات کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

ان ھذا الاجتماع فی الیوم الثالث خصوصًا لیس فیہ فرضیۃ ولا فیہ وجوب ولا فیہ سنّۃ ولا فیہ استحباب ولا فیہ منفعۃ ولا فیہ مصلحۃ فی الدّین ۔ بل فیہ طعن ومذمۃ وملامۃ علی السّلف حیث لم یبیّنوا بل علی النّبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم حیث ترک حقوق المیّت بل علی اللّٰہ سبحانہٗ وتعالیٰ حیث لم یکمل الشّریعۃ وقد قال اللّٰہ تعالےٰ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ

یعنی خصوصیت کے ساتھ تیسرے دن کا اجتماع نہ تو فرض ہے اور نہ واجب، نہ سنّت ہے اور نہ مستحب، نہ تو اس میں کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ اس میں کوئی دینی مصلحت ہے بلکہ اس میں طعن و مذمّت اور ملامت ہے سلفؒ پر، کہ اُنہوں نے اس کو بیان نہیں کیا بلکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر کہ آپ نے میّت کے حق بیان نہیں فرمائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی پر کہ اُس نے شریعت کو مکمّل نہیں کیا (اور ہماری بدعات کی وہ محتاج ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مَیں نے

دِیْنَکُمْ الآیۃ (بحوالہ تفہیم المسائل ص۱۷) ۔ آج کے دن تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے ۔

(۵) امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانی رح (المتوفّی ۱۰۳۴ھ) بدعت اور اہلِ بدعت کی تردید میں فرماتے ہیں :

نورِ سنّت سنیہ را ظلماتِ بدعتہا مستور ساختہ اند و رونقِ ملّتِ مصطفویہ را کدورت امور محدثہ ضائع گردانیدہ عجب تر آنکہ جمع آں محدثات را امور مستحسنہ میدانند وآں بدعت ہا را حسنات مے انگارند و تکمیلِ دین و تتمیم ملّت ازاں محدثات مے جویند و در اتیان آں امور ترغیبات مے نمایند ہداہم اللہ صراط المستقیم، مگر نمے دانند کہ دین پیش ازیں محدثات کامل شدہ بود و نعمت تمام گشتہ و رضائے حق تعالےٰ بحصول پیوستہ کما قال اللہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الآیۃ پس کمال دین ازیں محدثات جستن فی الحقیقت انکار نمودن است بمقتضائے ایں آیتِ کریمہ ؎

روشن سنّت کے نور پہ بدعات کی تاریکیاں چھاگئی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی ملّت کی رونق کو نئے نئے اُمور کی کدورت نے ضائع کر دیا ہے ۔ حیرت تو ان لوگوں پہ ہے جو اُن بدعات اور محدثات کو اچھے امور تصوّر کرتے اور ان بدعات کو نیکیاں یقین کرتے ہیں اور دین کی تکمیل اور ملِت کی تتمیم ان بدعات سے تلاش کرتے ہیں اور ان امور کی ادائیگی میں ترغیب دیتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کو صراط مستقیم پر چلائے، مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ دین ان محدثات سے پہلے ہی کامل ہو چکا ہے اور نعمت تمام ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اسی سے وابستہ ہو چکی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آج کے دن مَیں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمّل کر دیا ہے (الآیۃ) سو دین کا کمال ان بدعات سے تلاش کرنا درحقیقت اس آیتِ کریمہ کے مضمون سے انکار کرنے کے مترادف ہے ۔

اندکے پیشِ تو گفتم غمِ دل و ترسیدم ۔۔۔ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

(مکتوبات حصّہ چہارم ص۹۴ مکتوب نمبر ۲۶۰)

(۶) ملّا علی القاری الحنفی رح (بقول بعض حضرات گیارھویں صدی کے مجدّد المتوفّی ۱۰۱۴ھ) ارشاد فرماتے ہیں :

قال اللہ تعالیٰ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الآیة ۔ فلا نحتاج فی تکمیلہ الی امر خارج عن الکتاب و السنّة ۔

(شرح فقہ اکبر ص۱۰ کان پوری)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمّل کر دیا ہے (الآیۃ) سو ہمیں دین کی تکمیل میں کسی ایسے امر کی حاجت اور ضرورت نہیں ہے جو کتاب و اور سنّت سے خارج ہو۔

غرضیکہ دینِ اسلام ایسا مکمّل نظامِ عمل ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کرنا یقیناً محال ہے اور اس کامل اور مکمّل ضابطہ حیات کی موجودگی میں کسی اور ضابطہ کی طرف نگاہ اُٹھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے ۔

قرآن کریم کی حقانیت اور دینِ اسلام کی عظمت غیروں کی نگاہ میں جن اہلِ یورپ کی تقلید کو آج بدقسمتی سے مسلمان مایۂ افتخار سمجھتے ہیں اور مردوں سے لے کر عورتوں تک، بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، ہر ہر ادا میں ان کی نقل اُتارتے اور اُن کے فیشن اور رسم میں رنگے ہوئے اور سیرت و صورت میں اُنکی نقالی کے دلدادہ ہیں، ان کی عینک سے اس کامل اور مکمّل کتاب کو ملاحظہ کیجئے :

(۱) بیروت کے ایک مسیحی اخبار الوطن میں ایک عیسائی نامہ نگار لکھتا ہے :

"پیغمبرِ اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کر دیئے۔ کیونکہ مسلمان جب قرآن وحدیث میں غور کریں گے، تو وہ اپنی ہر دینی و دنیوی ضرورت کا علاج اس میں پائیں گے"۔

(۲) جی۔ ایم راڈویل کہتا ہے کہ :

"قرآن میں ایک نہایت گہری حقّانیت ہے جو اُن لفظوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے قوی اور صحیح راہنمائی اور الہامی حکمتوں سے مملو ہیں"۔

(۳) جرمن مستشرق عمانویل ڈوش لکھتا ہے کہ :

"اسی قرآن کی مدد سے تمام سامی اقوام میں صرف عرب ہی یورپ میں شاہانہ حیثیت سے داخل ہوئے۔ جہاں اہل فینیشیا بطور تاجروں کے اور یہودی لوگ پناہ گزینوں اور اسیروں کی حالت

میں پہنچے۔ ان عربوں نے بنی نوع انسان کو روشنی دکھلائی جبکہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ان عربوں نے یونان کی عقل و دانش کو زندہ کیا اور مغرب و مشرق کو فلسفہ، طب اور علم ہیئت کی تعلیم دی اور موجودہ سائنس کے جنم لینے میں انہوں نے حصّہ لیا۔ ہم ہمیشہ اُس روز کا ماتم کریں گے جس دن غرناطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

(۴) ڈاکٹر سموئیل جاسن لکھتا ہے کہ :

" قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کے لئے اس قدر موزون ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اُس کو قبول کر لیتی ہیں اور وہ محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔

(۵) لڈولف کریہل لکھتا ہے :

" قرآن میں عقائد، اخلاق اور ان کی بنا پر قانون کا مکمّل مجموعہ موجود ہے۔ اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں بھی رکھ دی گئی ہیں۔ عدالت حربی انتظامات، مالیات اور نہایت محتاط قانونِ غرباء وغیرہ کی بنیادیں خدائے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں"۔

(ماخوذ از مقدمہ تاریخ ہند ج ۲ ص۳۱۷ تا ص۳۱۹ از اکبر شاہ خان)

(۶) سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" میں لکھتا ہے کہ :

"جہاں تک ہماری معلومات ہیں دُنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس "قرآن مجید" کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو"۔

(۷) مشہور مصنّف ڈاکٹر موریس فرانسیسی لکھتا ہے کہ :

"قرآن دینی تعلیم کی خوبیوں کے لحاظ سے تمام دُنیا کی مذہبی کتابوں سے افضل ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلی عنایت نے جو کتابیں دیں اُن سب میں قرآن بہترین کتاب ہے۔

(۸) ڈاکٹر موریس کہتا ہے کہ :

"قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا جس سے بہتر ممکن نہ تھا"۔

(۹) ڈاکٹر اسٹیسن گاس اپنی ڈکشنری میں لکھتا ہے کہ :

"قرآن کی خاص خوبی اس کی ہمہ گیر صداقت میں مضمر ہے"۔

(۱۰) مشہور مترجم قرآن جارج سیل لکھتا ہے کہ :

"قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا۔ یہ مستقل معجزہ ہے جو مُردوں کو زندہ کرنے کے معجزہ سے بلند تر ہے۔

(۱۱) پادری وال ریسن بی۔ ڈی کہتا ہے کہ :

"مسلمانوں کا مذہب جو قرآن کا مذہب ہے، ایک امن اور سلامتی کا مذہب ہے"۔

(۱۲) گاڈ فری ہیگنس لکھتا ہے کہ :

"قرآن کمزوروں اور غریبوں کا غم خوار ہے اور ناانصافی کی جا بجا مذمّت کرتا ہے"۔

(۱۳) ڈاکٹر کینن آئزک ٹیلو کہتا ہے کہ :

"اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے جو تہذیب و تمدّن کا علمبردار ہے"۔

(۱۴) مسٹر جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب "اپالوجی فار محمدؐ اینڈ دی قرآن" میں لکھتا ہے کہ :

"فی الحقیقت قرآن عیوب سے ایسا مبرّا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں۔ اوّل سے آخر تک اسے پڑھ جایئے تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پایئے گا جو پڑھنے والے کے چہرہ پر شرم و حیا کے آثار پیدا کر دے" (کیونکہ اس میں کوئی ایسا فحش لفظ ہی نہیں ہے) ۔(بحوالہ خطبہ صدارت ص ۱۲، ۱۳ حضرت شیخ العرب والعجم مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی، المتوفّی ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء اجلاس پنجاہ سالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ)۔

(۱۵) رومی مؤرخ ایڈورڈ گبون صاحب لکھتے ہیں کہ :

"قرآن کی بہت سی نقلوں سے وہی اعجاز کا سا خاصہ یگانگت و عدم قابلیت تحریف کا متن ثابت ہوتا ہے"۔

(۱۶) پادری عماد الدین صاحب باوجود اسلام اور مسلمانوں کے اشدترین دشمن ہونے کے یوں لکھتا ہے کہ :

"قرآن آج تک وہی قرآن ہے جو محمدؐ صاحب کے عہد میں تھا۔

(۱۷) گبّن صاحب کہتے ہیں کہ :

" اوقیانوس سے گنگا تک قرآن شریف مجموعۂ قوانین مانا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں صرف فقہی مسئلے ہوں بلکہ قوانینِ دیوانی، فوجداری اور دیگر مضامین بھی اس میں درج ہیں۔ اور وہ قاعدے جو آدمیوں کے اعمال اور مال کی نسبت مقرر کئے گئے ہیں، وہ خدا تعالیٰ کی بے زوال رضا سے بنائے گئے ہیں یا بہ تبدیلِ الفاظ ہم اس مطلب کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ قرآن شریف مسلمانوں کا مجموعۂ قوانینِ عامہ ہے۔ اس میں قوانینِ مذہبی اور سلوکِ باہمی اور فوجداری اور دیوانی اور تجارتی اور فوجی اور ملکی اور سزا دہی سب موجود ہے، اور مذہبی رسوم سے لے کر معاملاتِ دنیوی تک ہر ایک چیز کا مفصّل بیان ہے قرآن نجاتِ روح اور صحتِ جسمانی اور حقوقِ عامہ اور حقوقِ شخصی اور نفع رسانیٔ خلائق اور نیکی اور بدی اور سزاِ دینی و دنیوی سب چیز پر حاوی ہے"۔ (بحوالہ نویدِ جاوید صـ۵۲۲ تا صـ۵۳۳)

(۱۸) مشہور جرمنی فاضل گوئٹے لکھتے ہیں کہ :

" اس کتاب (قرآن) کی اعانت سے عربوں نے سکندرِ اعظم کے جہاں سے بڑا جہاں، اور رومتہ الکبریٰ کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کر لی، اور جس قدر زمانہ سلطنتِ روما کو اپنی فتوحات کے حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا، اس کا دسواں حصہ بھی ان کو نہ لگا"۔ (بحوالہ رسالہ معجزۂ قرآن صـ۱۲۳ نظامی پریس بدایوں)

اسی جامع و مکمل، بے نظیر انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوّت اور طاقت سے خائف اور بدحواس ہو کر برطانیہ کے مشہور ذمّہ دار وزیرِ اعظم گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآنِ کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ :

"جبتک یہ کتاب دُنیا میں باقی ہے دنیا متمدّن اور مہذّب نہیں ہو سکتی"۔ (بحوالہ خطبہ مذکورہ صـ۱۵)۔

اور ہنری ہر سنگٹن طامس نے کہا کہ :

"مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو، اچھی رعایا نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے"۔ (بحوالہ حکومتِ خود اختیاری صـ۵۵)۔

اور گورنر جنرل ہند لارڈ ایلن برا نے ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا کہ :

"میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہمارا دشمن ہے اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضاجوئی کرتے رہیں"۔ (آج بیبی انڈیا ص۳۹۹)

قرآنِ کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے صحیح جذبات کو دنیا سے ناپید کرنے کے لئے ایسے ایسے حربے استعمال کئے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو گیا۔ اور لارڈ میکالے نے صاف لفظوں میں کہا کہ:

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں تو دل اور دماغ کے اعتبار سے فرنگی"۔ (مدینہ۔ بجنور ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء)

انگریز کا تو بہر حال یہ پروگرام تھا کہ وہ مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو کالجوں، سینماؤں اور کلبوں کے ذریعہ لوٹتا۔ مگر افسوس صد افسوس تو مسلمانوں پر ہے جنہوں نے اس مکمل کتاب کی قدر نہ کی اور اس سے ہدایت اخذ کر کے نجاتِ روح اور صحتِ جسمانی حاصل نہ کی۔

وحی غیر متلو اور حدیث ہدایت کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو وحی خفی یا وحی غیر متلو اور حدیث کہا جاتا ہے، اور جس کی رہبری میں اور جس کے سانچے میں ڈھل کر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام شعبوں کی جامع ہے، ہر ایک کی رہبری کے لئے بہترین نمونہ اور عمدہ سامانِ ہدایت بن گئی ہے، اور اسی کو سنّتِ رسول اللہ کہا جاتا ہے اور اسی وحی خفی کے ذریعہ دی ہوئی تعلیم کا نام قرآن مجید میں حکمت لیا گیا ہے۔ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ جس میں قرآن مجید کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں اور اعمال کی خدا تعالیٰ نے اپنی مصلحت کے موافق تعلیم فرمائی ہے جس طرح احکامِ خداوندی سے بے نیازی نہیں ہو سکتی اسی طرح اسوۂ رسولؐ اور سنّتِ رسول اللہ سے بھی بے پروائی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ سنّتِ رسول اللہ کی اطاعت بھی ایسی ہی ضروری ہے جیسی کتاب اللہ کی۔ اس لئے کہ دونوں کی پیروی حکمِ الٰہی کی پیروی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ کی اطاعت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ تو جس طرح قرآن مجید کی اطاعت خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت بھی خود خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اور جو رسول اللہ کی اطاعت کرے، اس نے

اللہ ۔ (پ ۵ ۔ النساء ، رکوع ۱۱) اللہ کی اطاعت کی ۔

یہ معلوم اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ثواب اور عذاب ، نیکی اور بدی کا تعیّن اور اس کا صحیح امتیاز جناب نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلّم سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا ۔ جس چیز کو آپ نے گناہ اور جرم قرار دیا ہو ، دنیا میں کوئی شخص اس کی خوبی ثابت نہیں کر سکتا ، اور جس چیز کو آپ نے نیکی قرار دیا ہو ، دنیا کی کوئی طاقت اُس کی بُرائی ثابت نہیں کر سکتی ۔ تمام وہ اخلاقِ حسنہ جو اقوامِ عالم اور نسلِ انسانی میں مستحسن اور پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں ، وہ سب الہاماتِ الٰہیہ اور تعلیماتِ انبیاء اور خصوصاً جنابِ رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی تعلیم کا نتیجہ ہیں ۔ کیا خوب کہا گیا ہے ؎

چمکتی ہے جو ریگ اکثر ، نشاں ہے مہ جبینوں کا
جسے ہم روندتے پھرتے ہیں یہ سب خاکِ انسان ہے

جنابِ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی پہنچائی ہوئی اور بتائی ہوئی ہر ایک تعلیم خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت ہوتی ہے ، رسول کا کام صرف دینِ حق کی تبلیغ کرنا ہے ، دین کا بنانا نہیں ، اور اسی لئے وہ مطاع ہوتا ہے ، اور اس کی اطاعت ہر شخص پر فرض ہوتی ہے اور اس کی پیش کردہ تعلیم کا انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے ۔ رسول کے سوا کسی دوسرے شخص کو اور اس کی پیش کردہ تعلیم کو ہرگز ہرگز یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا ۔

جنابِ نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی تعلیم عین فطرتِ انسانی کے موافق اور متوازی ہے ۔ اور انسانی فطرت کے دبے اور چھپے ہوئے جملہ تقاضوں کی ترجمانی ہے ، اور اس کی خلاف ورزی فطرت سے بغاوت ہے ۔ ہادیٔ برحق ، راہبرِ کامل خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلّم کی شریعت اور آئین جس توجّہ کا مستحق ہے ، اگر ویسی ہی توجّہ اس کی طرف کی جائے تو آج بھی مسلمان وہی جوشِ ایمانی اور وہی مبہوت کُن کارنامے دُنیا کو پھر دکھا سکتے ہیں جو حضرات صحابۂ کرامؓ نے دکھائے تھے ۔ مذہبِ اسلام اور سُنّتِ رسُول اللہ ہی کے ذریعہ دنیا میں کامل اتحاد ، صحیح عدل اور مکمّل امن و امان قائم ہو سکتا ہے ۔ نہ تو آپ جیسا رہبرِ کامل دنیا میں پیدا ہوا ، اور نہ تا قیامت پیدا ہوگا ،

اور نہ کوئی نظام اور آئین ہی ایسا موجود ہے ؎

شرابِ خوشگوارم ہست و یارِ مہرباں ساقی
ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

ولادت سے لے کر وفات تک، خوشی سے لے کر غمی تک، زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں اُس کی اصلاح کے لئے ہم کو صرف سنّتِ رسول اللہ اور شریعتِ اسلامی کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا، جو ہر طرح سے محفوظ و موجود ہے۔ کسی دوسری شریعت، کسی دوسرے ہادی، کسی اَور آئین اور کسی رسم و رواج کی طرف نہ تو ہمیں نگاہ اُٹھانے کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ بھلا جس کے گھر میں شمعِ کافوری روشن ہو، اُس کو فقیر کی جھونپڑی سے اس کا ٹمٹماتا ہؤا چراغ چُرانے کی کیا ضرورت اور حاجت ہے؟ ہاں مگر کوئی خوش نصیب اس کی طرف ہاتھ بھی تو بڑھائے۔ کوتاہ دست اور بد قسمت کو سنّتِ رسول اللہ کے آبِ حیات سے کیا فائدہ؟

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

<u>**سُنّت کا مقام، صاحبِ سُنّت کی نگاہوں میں**</u> | جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے سنّت پر عمل پیرا ہونے اور اُس کو مضبوطی سے پکڑنے کی اشد تاکید فرمائی ہے اور اس کی پیروی نہ کرنے پر انتہائی ناراضگی فرمائی ہے۔

(۱) حضرت عرباض رضؓ بن ساریہ (المتوفّٰی ۷۵ھ) کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

فعلیکم بسنّتی وسنّة الخلفاء الرّاشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجذ وایّاکم ومحدثات الامور فانّ کلّ محدثة بدعة (مستدرک ج ۱ ص ۹۶) قال الحاکمؒ والذہبیؒ صحیح۔

تمہارے اوپر لازم ہے کہ تم میری سنّت کو اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدینؓ کی سنّت کو معمول بناؤ اور اپنی ڈاڑھوں کے ساتھ مضبوطی سے اس کو پکڑو، تم نئی نئی باتوں سے پرہیز کرو، کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔

یہ صحیح روایت صراحت سے اس امر کو بیان کرتی ہے کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی اور حضرات خلفائے راشدین کی سنّت کو خوب مضبوطی سے پکڑے، اور اس کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، اور جملہ محدثات اور بدعات سے کنارہ کشی کرے کیونکہ ہر ایک بدعت گمراہی اور ضلالت ہے۔

(۲) حضرت عبد اللہ بن عبّاسؓ (المتوفّی ۶۸ھ) سے روایت ہے کہ حجّۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے جناب نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے یوں ارشاد فرمایا:

یاایّھا النّاس انّی قد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلّوا ابدًا کتاب اللہ وسنّۃ نبیّہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) (مستدرک ج ۱ ص۹۳)

اے لوگو! میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑا تو ہرگز تم گمراہ نہ ہوگے ان میں سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنّت رسول اللہ، (صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم) ہے۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہؓ (المتوفاۃ ۵۷ھ) روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا: چھ قسم کے لوگ ہیں جن پر میں بھی لعنت بھیجتا ہوں، اللہ تعالےٰ بھی ان پر لعنت نازل کرے۔ ان میں سے ایک والتارک لسنّتی (مستدرک ج ۱ ص۳۶، قال الحاکمؒ والذّہبیؒ صحیح) وہ شخص ہے، جو میری سنّت کو چھوڑ دے۔

(۴) حضرت انسؓ بن مالک (المتوفّی ۹۳ھ) روایت کرتے ہیں کہ ایک خاص موقع پر آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا:

فمن رغب عن سنّتی فلیس منّی۔ (بخاری ج ۲ ص۷۵۷)

جس شخص نے میری سنّت سے اعراض کیا تو وہ میرا نہیں ہے۔

اس سے بڑھ کر تارکِ سنّت کی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ رحمۃٌ للعالمین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ میرا (اُمّتی) نہیں ہے، گو وہ اپنے مقام پر آپ کا محبّ بنتا رہے۔ مگر اس کی رائے کا کیا اعتبار ہے؟

۵ حضرت حذیفہؓ بن الیمانؓ (المتوفّی ۳۶ھ) جنابِ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

تکون بعدی ائمۃ لا یھتدون بھدی ولا یستنون بسنّتی وسیقوم فیھم رجال قلوبھم قلوب الشّیاطین فی جثمان اِنس۔ (مسلم ج ۲ ص۱۲۷)

کہ میرے بعد کچھ رہبر اور پیشوا ایسے ہوں گے جو میری سیرت پر نہیں چلیں گے اور میری سنّت پر عمل نہیں کریں گے، ان میں کچھ ایسے لوگ کھڑے ہوں گے جن کے دل شیطانوں کے دل ہوں گے مگر شکل اور صورت انسانی ہوگی۔

اتّباعِ سنّت کے بارے میں کتبِ احادیث میں اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ آسانی کے ساتھ اس کا شمار نہیں ہوسکتا، مگر بطورِ نمونہ کے ایک عاقل کے لئے یہ پیش کردہ روایات کافی ہیں۔ لیکن جو عمدًا غافل رہنا چاہتا ہے، اس کے لئے دُنیا میں کوئی علاج موجود نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لئے فیصلہ یہی ہے۔ نُوَلِّہٖ ما تَوَلّٰی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (المتوفّی ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں کہ:

اقول انتظام الدّین یتوقّف علیٰ اتباع سنن النّبیّ۔ (حجۃ اللہ ج ۱ ص۱۷۱)۔

مَیں کہتا ہوں کہ دین کا انتظام اس بات پر موقوف ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنّتوں کا اتّباع کیا جائے۔

آپؐ کی پاک تعلیم کی قدر وعظمت غیروں کی نگاہوں میں

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے ہر طرح دین کی تکمیل ہوگئی، ہر قسم کی نبوّت کا خاتمہ ہوگیا، دنیا میں خدا کا آخری پیغام پہنچ گیا۔ معمارِ قدرت اپنی عمارت میں آخری پتّھر کو اپنی جگہ رکھ کر اپنی تعمیر پوری کرچکا۔ درجہ بدرجہ چاند اور ستاروں کے طلوع کے بعد وہ خورشید انور طالع ہوا جس کے لئے غروب نہیں۔ طرح طرح کی بہاروں کے آنے کے بعد کائنات میں وُہ سدا بہار موسم آگیا جس کے بعد پھر خزاں نہیں۔ سُنّتِ نبوی کی فیروزمندیاں رحمتِ ایزدی کا ابرِ بہار بن کر کوہ و دشت پر پھُول برسانے لگیں۔ باغبانِ فطرت کی رکھوالی اور باغبانِ رحمت کی پرورش نے ایک ایسا لہلہاتا ہوا چمن تیار کیا جس کی بہار کا تابناک اور روشن نظارہ آنکھوں نے دیکھ لیا۔ اپنے تو اپنے غیر بھی اُس آفتابِ نبوّت کو مُحسنِ اعظم کہنے پر مجبور ہیں اور کیوں نہ کہیں سے

رُخِ مصطفٰے ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں، نہ دوکانِ آئینہ ساز میں

(۱) مسٹر ایڈورڈ مونٹ پروفیسر السنۂ شرقیہ جنیوا یونیورسٹی کہتے ہیں کہ:
"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاحِ اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی، اس کے اعتبار سے آپ کو انسانیت کا محسنِ اعظم یقین کرنا پڑتا ہے"۔ (بحوالہ مقدمہ تاریخ ہند ج ۲ ص ۳۴)۔

(۲) مسٹر طامس کارلائل اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لکھتے ہیں کہ:
"صاف و شفاف قلب اور پاکیزہ روح رکھنے والے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) دنیوی ہوا و ہوس سے بالکل بے لوث تھے۔ ان کے خیالات نہایت متبرک اور ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ تھے۔ وہ ایک سرگرم اور پُر جوش ریفارمر تھے، جن کو خدا نے گمراہوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا تھا۔ ایسے شخص کا کلام خود خدائی آواز ہے۔ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے انتھک کوشش کے ساتھ حقانیت کی اشاعت کی زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے مقدس مشن کی تبلیغ جاری رکھی۔ دنیا کے ہر حصہ میں ان کے متبعین بکثرت موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی صداقت کامیاب ہوئی"۔ (بحوالہ عصرِ جدید، ۱۸ اگست ۱۹۲۹)۔

(۳) لندن کا مشہور اخبار نیر ایسٹ لکھتا ہے کہ:
محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی تعلیم و ارشاد کی قدر و قیمت اور عظمت و فضیلت کو اگر ہم تسلیم نہ کریں تو ہم فی الحقیقت عقل و دانش سے بیگانہ ہیں"۔ (بحوالہ خطبہ مذکورہ ص ۱۳ از حضرت مدنی قدس اللہ سرہٗ)۔

احسان فراموشی کی اس سے بدترین مثال بھی کیا دنیا میں کوئی ہو سکتی ہے کہ بیگانے تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم و ارشاد اور سنت کی قدر و قیمت کا اعلان کریں اور ہم غیروں کی صورت و سیرت، گفتار و کردار اور رسم و فیشن پر مفتون ہوں۔ حیف اور صد حیف ہے اس برائے نام عشق و محبت کے جھوٹے دعووں پر۔ خلاصۃ امر یہ ہے کہ کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر خود ساختہ بدعات اور خود تراشیدہ رسوم کو تسلیم کرنے میں ہر مسلمان کو عمیق غور اور فکر کر لینا اور ہر مسئلہ کی اسلامی حیثیت سے کما حقہ واقف اور آگاہ ہونا

ازبس لازم اور ضروری ہے اور بغیر اتباعِ کتاب اور سنّت کے، محبتِ خدا اور رسول کا دعویٰ بالکل بے بنیاد اور سراسر بے کار ہے۔ چنانچہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے والدِ ماجد مولوی نقی علی خان صاحب ارشاد فرماتے ہیں: "دعوئ محبتِ خدا اور رسول بدون اتباعِ سنّت سراسر لاف وگذاف ہے۔" (سرور القلوب ص ۱۳۹)

الغرض کتاب وسنّت ہمارے دستور کی اساس، ہمارے آئین کی بنیاد، ہمارے نظامِ اجتماعی کا شیرازہ، ہماری سیاست کا ماخذ، ہماری معیشت کا حل، ہماری معاشرت کی نیو اور ہماری زندگی کے سارے مسائل کا مرکز اور محور ہے، اور ہماری زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ ایسا باقی نہیں رہ جاتا جو اُصولی طور پر اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہو۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اس پر عمل کریں۔

اجماع واتّفاق شرعی حجّت ہے کتاب وسنّت کے بعد دلائل کی مد میں اجماع کا مرتبہ اور درجہ ہے یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ آسانی کے لئے اجماع کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے۔ حضرات خلفاء راشدینؓ کا اجماع، عام صحابہ کرامؓ کا اجماع اور اُمّتِ محمّدیہ (علےٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کا اجماع۔ ان میں ہر ایک اجماع اپنے مقام پر صحیح اور حجّت ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب سے ہم اختصاراً کچھ دلائل عرض کرتے ہیں۔ ان کا بغور مطالعہ کیجئے تاکہ صحیح بات ذہن نشین ہو جائے ع

شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

لیکن اس سے قبل حضرات خلفاء راشدینؓ کی خلافت کے حق ہونے اور ان کی سنّت کے واجب الاتّباع ہونے کے متعلّق مختصراً عرض ہے:

حضرات خلفاء راشدینؓ کی خلافت اور اُن کی سنّت جنابِ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے فیض یافتہ حضرات ہر ایک اپنے مقام پر آفتابِ ہدایت کا درخشاں ستارہ اور سماءِ علم کا روشن کوکب ہے۔ مگر یہ بات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ جیسا فیض آپؐ سے حضرات خلفاء اربعہؓ کو نصیب ہوا، مجموعی لحاظ سے وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا، اور انہی کے وجودِ مسعود سے اللہ تعالےٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا — وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے۔

الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (پ ۱۸ - النور - رکوع ۷)

ہیں اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام۔ البتہ (آپ کے بعد) حاکم کر دے گا اُن کو مُلک میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو، اور جما دے گا اُن کے لئے دین اُن کا جو پسند کر دیا ان کے واسطے، اور دے گا اُن کو اُن کے ڈر کے بدلے امن، میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو کوئی ناشکری کریگا اس کے بعد، سو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

اس آیت استخلاف سے حضرات خلفاء اربعہ کی بہت بڑی فضیلت اور منقبت ثابت ہوئی۔

حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلویؒ (المتوفّی ۱۲۳۰ھ) لکھتے ہیں:

"خطاب فرمایا حضرت کے وقت کے لوگوں کو جو اُن میں نیک ہیں پیچھے ان کو حکومت دے گا اور جو دین پسند ہے ان کے ہاتھوں سے قائم کرے گا اور وہ بندگی کریں گے بغیر شرک، یہ چاروں خلیفوں سے ہوا پہلے خلیفوں سے اور زیادہ، پھر جو کوئی اس نعمت کی ناشکری کرے اُن کو بے حکم فرمایا جو کوئی ان کی خلافت سے مُنکر ہوا، اس کا حال سمجھا گیا اِنتہی (موضح القرآن ص۵۹۲)۔

لفظِ استخلاف میں اشارہ ہے کہ وہ حضرات محض دنیوی سلاطین اور مُلوک کی طرح نہ تھے بلکہ وہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کرنے والے اور دینِ حق کی بُنیادیں جمانے والے تھے جنہوں نے خشکی اور تری میں دینِ اسلام کا سِکّہ بٹھایا، حتّٰی کہ اس وقت مسلمانوں کو کفّار کا مطلقاً خوف و رعب باقی نہ رہا۔ وہ کامل اطمینان اور امن سے اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہے اور ان کی یہ شان رہی کہ اُن کی بندگی میں شرکِ جلی تو کیا راہ پاتا، شرکِ خفی کی آمیزش بھی نہ تھی۔ یہ بات انصاف اور قیاس سے بالکل بعید ہے کہ اللہ تعالےٰ تو اُن کو اپنے دینِ حق کی ترویج و اشاعت کے لئے زمین کی خلافت اور نیابت سپرد کر دے اور وہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحقؐ کے اعتماد و اعتبار سے محروم رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ان کو معیارِ حق گردانتے ہوئے ہمیں اُن کی اتباع اور پیروی کرنے کا حُکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عرباضؓ بن ساریہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے فرمایا :

فانّہ من یعش منکم بعدی فسیرٰی اختلافًا کثیرًا فعلیکم بسنّتی وسنّۃ الخلفاء الرّاشدین المھدیّین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ وایّاکم ومحدثات الامور فان کُلّ محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔ (ترمذی ج ۲ ص۹۲، ابنِ ماجہ ص۵، ابوداؤد ج ۲ ص۲۷۹، مسند دارمی ص۲۶، مسند احمد ج ۴ ص۱۲۷ اور مستدرک ج ۱ ص۹۵)۔ (قال الحاکمؒ والذھبیؒ صحیح)۔

یعنی جو شخص میرے بعد زندہ رہا، وہ بہت ہی زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ سو تم پر لازم ہے کہ تم میری اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنّت کو جو ہدایت یافتہ ہیں، مضبوط پکڑو اور اپنی ڈاڑھوں اور کچلیوں سے محکم طور پر اس کو قابو میں رکھو۔ اور تم نئی نئی چیزوں سے بچو، کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ (وغیرہ) فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے)۔

حضرت ملا علی القاریؒ اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں :

فانّھم لم یعلموا الّا بسنّتی فالاضافۃ الیھم اما بعملھم بھا او لاستنباطھم واختیارھم ایاھا۔ (مرقات علی المشکوٰۃ ج ۱ ص۱۳۱)۔

اس لئے کہ حضرات خلفائے راشدینؓ نے درحقیقت آپ ہی کی سنّت پر عمل کیا ہے، اور ان کی طرف سنّت کی نسبت یا تو اس لئے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور یا اسلئے کہ انہوں نے خود قیاس اور استنباط کرکے اس کو اختیار کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات خلفاءِ راشدینؓ نے جو کام اپنے تفقہ و قیاس اور اجتہاد و استنباط سے سمجھ کر اختیار کیا ہے، وہ بھی سنّت ہے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے تحت اُمّت کو اس کے تسلیم کرنے سے بھی ہرگز چارہ نہیں اور وہ اس سنّت کو تسلیم کرنے کی بھی پابند ہے۔ اور شاہ عبدالحق صاحب محدّث دہلویؒ (المتوفی ۱۰۵۲ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

پس ہرچہ خلفاء راشدین بداں حکم کردہ باشند اگرچہ باجتہاد و قیاس ایشاں بود موافقِ سنّت، اطلاق بدعت برآں نتواں کرد چنانکہ

جس چیز کے بارے میں حضرات خلفاء راشدینؓ نے حکم دیا ہے اگرچہ وہ حکم اُن کے قیاس و اجتہاد سے صادر ہوا ہو وہ بھی سنّت کے موافق ہے اور اس پر بدعت کا اطلاق ہرگز

فرقہ زائغہ کنند۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۳) — صحیح نہیں جیسا کہ گمراہ فرقہ کرتا ہے۔

یہ عبارت اس بات کی نصِ صریح ہے کہ حضرات خلفاء راشدینؓ کے قیاس و اجتہاد سے ثابت شدہ احکام بھی سنّت ہی ہوں گے، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق اُن پر عمل کرنا بھی لازم ہے۔

حافظ ابنِ رجب حنبلیؒ (المتوفی ۷۹۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

والسنّة هی الطریق المسلوك فیشمل ذلك التمسك بما كان علیه هو وخلفاء الراشدون من الاعتقادات والاعمال والاقوال وهذه هی السنّة الكاملة۔ (جامع العلوم والحکم ج ۱ ص ۱۹۱)

سنّت اس راہ کا نام ہے جس راہ پر چلا جائے، اور یہ اس (راہ کا) تمسک ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدینؓ عامل تھے، عام اس سے کہ وہ اعتقادات ہوں یا اعمال و اقوال، اور یہی سنّتِ کاملہ ہے۔

یعنی گو فی الجملہ نفسِ سنّت کا اطلاق تو عام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے قول و عمل پر بھی ہوتا ہے، مگر سنّتِ کاملہ صرف یہی ہے جس کا ذکر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی حنبلیؒ (المتوفی ۵۶۱ھ) اہل السنّت والجماعت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

فعلی المؤمن اتباع السنّة والجماعة فالسنّة ما سنّ رسول الله صلّی الله علیه وسلّم والجماعة ما اتفق علیه الصحابةؓ فی الخلافة الائمة الاربعةؓ۔ (غنیۃ الطالبین ص ۱۹۵ طبع لاہور)

مؤمن پر لازم ہے کہ وہ اہل السنّت والجماعت کی پیروی کرے۔ سنّت وہ چیز ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (قولاً و فعلاً) مسنون قرار دی اور جماعت وہ (احکام ہیں جن پر) کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے حضرات خلفاء اربعہؓ کی خلافت میں اتفاق کیا۔

اور یہی اہل السنّت والجماعت کا وہ گروہ اور جماعت ہے جو ہر قسم کی بدعت سے پاک و صاف ہے چنانچہ علامہ سیّد سند علی بن محمد الجرجانی الحنفیؒ (المتوفی ۸۱۶ھ) لکھتے ہیں:

اهل السنّة والجماعة ومذهبهم خالٍ عن بدع هؤلاء۔ (شرح مواقف ص ۷۶۳ طبع نولکشور)

یعنی اہل السنّت والجماعت کا گروہ ہی ایسا ہے جن کا مذہب بدعت سے خالی ہے۔

الحاصل حضرات خلفاءِ راشدین کی سنّت حجّت ہے اور اُمّت کے لئے اس کی پیروی لازم، اور اُن کے عہدِ خلافت میں جن چیزوں پر حضرات صحابۂ کرامؓ کا اجماع ہوا وہ بقول شیخ صاحبؒ جماعت کا مفہوم ہے، اور بغیر اس کے تسلیم کئے اہل السنّت والجماعت کا مفہوم ہرگز پورا نہیں ہوتا۔

ایک غلطی اور اس کا ازالہ بعض حضرات کو شبہ ہے کہ حضرات خلفاء راشدینؓ کی سُنّت صرف وہی ہو سکتی ہے جو بعینہٖ رسول اللہ صلّے اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم سے مروی ہو، اور جو چیز آپ سے (قولاً و فعلاً) مروی نہ ہو، اور حضرات خلفاءِ راشدینؓ میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہو، یا اس کے متعلق حکم دیا ہو، تو وہ سُنّت نہ کہلائے گی۔ چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم امیر یمانی (محمد بن اسمٰعیلؒ المتوفّی ۱۱۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

و معلوم من قواعد الشريعة ان ليس لخليفة راشد ان يشرع طريقة غير ما كان عليه النبيّ صلّى الله عليه وسلّم ثمّ عمرؓ نفسه الخليفة الرّاشد سمّى ما رأه من تجميع صلاته ليالي رمضان بدعة ولم يقل انّها سنّة۔ (سبل السّلام ج ۲ صـ۱۳)۔

قواعد شرعیہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلیفۂ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے، جس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم عامل نہ تھے۔ پھر حضرت عمرؓ خود خلیفہ راشد ہیں اور رمضان کی راتوں میں لوگوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کو سنّت نہیں، بلکہ بدعت کہتے ہیں۔

لیکن یہ اُن کی غلطی ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ حضرات خلفاء الرّاشدینؓ کی سنّت ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے عمل کے مُو بمُو موافق ہو اور اس سے ذرا بھی مخالف نہ ہو۔ کیونکہ جو حکم اُنہوں نے اپنے قیاس و اجتہاد سے جاری کیا ہے، وہ بھی سنّت ہے۔ حالانکہ یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ انکا اپنا ذاتی قیاس و استنباط آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے منقول نہیں ہے گو اصل مقیس علیہ منقول ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور حضرت ابو بکرؓ نے شرابی کو چالیس ۴۰ چالیس کوڑے سزا دی، اس سے زیادہ ان سے ثابت نہیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اسّی ۸۰ کوڑے سزا دی ہے، یہ بھی سنّت ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ (المتوفّی سنہ ۴۰ھ) فرماتے ہیں کہ:

جلد النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم اربعین و ابوبکرؓ اربعین وعمرؓ ثمانین و کل سُنّۃ ۔ (مسلم ج ۲ ص۷۱ وابوداؤد ج ۲ ص۲۶۱ وابن ماجہ ص۱۸۸)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے شرابی کو چالیس کوڑے سزا دی اور حضرت عمرؓ نے اسّی کوڑے سزا دی اور دونوں باتیں سُنّت ہیں۔

امام حاکمؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمانؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔

واتمّھا عثمانؓ ثمانین وکلّ سُنّۃ ۔ (معرفت علوم الحدیث ص۱۸۱)

اور حضرت عثمانؓ نے بھی اسّی کوڑے پورے کئے اور یہ سب سنّت ہے۔

روایت صحیح مسلم کی ہے جس کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور کہنے والے حضرت علیؓ خلیفۂ راشد ہیں جو سنّت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے اس فعل کو بھی وہ سنّت ہی کہتے ہیں جو بظاہر جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت امام نوویؒ (المتوفی ۶۷۶ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ھذا دلیل ان علیاؓ کان معظما لآثار عمرؓ و ان حکمہ و قولہ سنۃ و امرہ حق و کذلک ابوبکرؓ خلاف ما یکذب بہ الشیعۃ علیہ۔ (شرح مسلم ج ۲ ص۷۱)

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے آثار کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے حکم اور قول کو سنّت اور ان کے امر کو حق کہتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے متعلق بھی وہ یہی رائے رکھتے تھے، نہ جیسا شیعہ شنیعہ ان کی تکذیب کرتے ہیں۔

اگر خلیفہ راشد کے قول اور حکم کے سنّت ہونے کے لئے یہی ضروری ہوتا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول ہو تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا یہ حکم یقیناً بدعت ہوتا نہ کہ سُنّت۔

ثانیاً اگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نصاً ثابت ہونے کی بنا پر ہی حضرات خلفاء راشدینؓ کا قول وفعل سنّت ہو سکتا ہے تو اس میں حضرات خلفاء راشدینؓ ہی کی کیا تخصیص ہے۔ اس معنی میں تو ہر ایک ادنیٰ مسلمان کی پیروی کرنا بھی ضروری ہے جب کہ وہ متبع سُنّت ہو۔ اس لحاظ سے عام مسلمانوں سے اور خصوصاً دیگر حضرات صحابۂ کرامؓ سے علیحدہ کر کے حضرات خلفاء راشدینؓ کی سنّت کی پیروی

کرنے اور حضرات شیخینؓ کی اقتداء کرنے کی احادیث کا کوئی نمایاں پہلو واضح نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ آپ نے اپنی سنّت کو اور خلفاء راشدین کی سنّت کو واوِ عطف کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں بظاہر مغائرت ہوتی ہے۔ رہا یہ شبہ کہ حضرات خلفاء راشدینؓ کو شریعت بنانے کا حق کیسے حاصل ہوا؟ تو یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ شارع حقیقی تو صرف اللہ تعالےٰ ہی ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اللہ تعالےٰ کے احکام کے مبلّغ ہیں نہ کہ شارع، اور اپنے مقام پر ذکر ہوگا، کہ قیاس و اجتہاد کو شریعت نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ ایسے اُمور میں حضرات خلفاء راشدینؓ کا حکم اور قول و فعل ہمارے لئے نہ صرف حجّت ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے ارشاد کے مطابق سنّت ہے اور حضرات خلفاء راشدین کی بات بھی محض اس لئے حجّت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ہمیں اُن کی سنّت کو کچلیوں اور ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس صورت میں درحقیقت اطاعت جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی ہے جیساکہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی اطاعت دراصل خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ چنانچہ نواب صدیق حسن صاحب قنوجیؒ (المتوفی ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:

ان ما سنّۂ الخلفاء الراشدون من بعد فالاخذ به ليس الا لامره صلى الله عليه وسلم بالاخذ به۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے بعد جو چیز حضرات خلفاء راشدینؓ نے مسنون ٹھہرائی ہے، اس کو محض اس لئے اخذ کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اس کے اخذ کرنے کا حکم دیا ہے۔

(الدین الخالص ج ۳ ص ۳۴۵)

باقی حضرت عمرؓ نے جو رمضان مبارک میں ایک قاری پر مجتمع ہو کر نماز پڑھنے والوں کے عمل کو نعمت البدعۃ سے تعبیر کیا ہے تو اس سے مراد بدعتِ لغوی ہے جو مذموم نہیں ہے۔ اس سے بدعتِ شرعی ہرگز مراد نہیں جو مذموم اور قبیح ہے (اس کی پوری بحث بسط کے ساتھ اپنے مقام پر بیان ہوگی، انشاء اللہ العزیز) ورنہ اگر حضرات صحابہ کرامؓ اسی مذموم بدعت کے مرتکب ہوئے اور حضرت عمرؓ نے خلیفۂ وقت ہوتے ہوئے بھی ان کو اس قبیح حرکت سے منع نہ کیا اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہ کیا تو خلیفۂ راشد وہ کیسے رہے؟ اور وہ خود مہدیّین

(ہدایت یافتہ) کی فہرست میں کس طرح شامل رہے؟ اور جب خود اُنہوں نے بدعتِ قبیحہ کی اجازت دے دی یا اس پر سکوت اختیار کر لیا تو سُنّت کی پاسبانی کس نے کی؟ ع

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ثالثاً خود امیر یمانیؒ، علامہ برماویؒ کی ایک تحقیق کی (خلفاءِ اربعہؓ کا اتفاق تو حجت ہے مگر ان کی انفرادی بات اور قول اس پوزیشن میں نہیں ہے) تردید کرتے ہیں:

قال البرماوی:- اذا اتفق الخلفاء الاربعة علیٰ قول کان حجة لا اذا انفرد واحد منھم والتحقیق ان الاقتداء لیس ھو التقلید بل ھو غیرہ۔ (سبل السلام ج ۲ ص ۱۳)

کہ علامہ برماویؒ کہتے ہیں کہ جب خلفاء اربعہؓ کسی قول پر اتفاق کر لیں تو وہ حجت ہوگا نہ کہ ان کا انفرادی قول۔ حالانکہ تحقیق یہ ہے کہ اقتداء تقلید نہیں ہے، بلکہ اقتداء اور ہے، اور تقلید اور ہے۔

اس عبارت میں علامہ امیر یمانیؒ نے علامہ برماویؒ کی یوں تردید کی ہے کہ حضرات خلفاء اربعہ میں سے ہر ایک کا قول قابلِ اقتداء ہے، یہ الگ بات ہے کہ اقتداء اور چیز ہے اور تقلید اور۔ کچھ بھی ہو ان کا منفرد قول بھی حجّت ہے۔ ہمارے نزدیک اقتداء، اتّباع اور تقلید ایک ہی شئے ہے غیر مقلّدین کے ہاں اقتداء و اتّباع اور چیز ہے اور تقلید اور ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں:

"و تقلید عبارت است از قبول رائے کسیکہ قائم نمیشود بداں حجّت بلاحجت وازیں جا معلوم شد کہ قبول قولِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم و عمل بداں تقلید نیست زیرا کہ قول و فعلِ او خود حجّت است"۔

تقلید کا معنی یہ ہے کہ جس کی رائے حجّت نہ ہو اس کی رائے کو (محض حسنِ ظنی کی وجہ سے) بلا حجّت تسلیم کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا تقلید نہیں ہے، اس لئے کہ آپ کا قول و فعل خود حجّت ہے۔

اس لحاظ سے حضرات خلفاءِ راشدینؓ میں سے ہر ایک کی بات کو تسلیم کرنا گو تقلید نہ ہو مگر اقتداء اور اتّباع ضرور ہے۔ اس لئے کہ ان کا قول و فعل تسلیم کرنا حسبِ تصریح جنابِ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہمارے لئے لازم ہے، اور خصوصیت سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اقتداء کے متعلق مستقل حدیث

آئی ہے :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ادری مایقائی فیکم فاقتدوا من بعدی ابی بکرؓ و عمرؓ۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے معلوم نہیں کہ میں کب تک تم میں رہوں گا۔ سو میرے بعد ابو بکرؓ اور عمرؓ کی اقتدا کرنا۔

(ترمذی ج ۲ ص ۲۰۷، ابن ماجہ ص ۱۰، مسند احمد ج ۵ ص ۳۸۵، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۶۰، مستدرک ج ۳ ص ۷۵)

قال الحاکم والذہبی صحیح۔

امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :

قول الشیخین حجۃ اذا اتفقا لا یجوز العدول عنہ وان اتفاق الخلفاء الاربعۃؓ ایضاً حجۃ۔ (منہاج السنۃ ج ۳ ص ۱٦۲)

حضرات شیخینؓ کا قول حجت ہے۔ جب دونوں متفق ہو جائیں تو اس سے عدول جائز نہیں۔ اسی طرح حضرات خلفاء اربعہؓ کا اتفاق بھی حجت ہے

حضرات صحابہ کرامؓ بھی معیارِ حق ہیں اور ان کا اجماع حجت ہے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرات صحابہ کرام سے بڑھ کر عابد و زاہد متقی و پرہیزگار اور کوئی نہیں گزرا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دائمی خوشنودی اور رضا کا پروانہ اور سند ان کو ان پاکیزہ الفاظ سے عنایت فرمائی ہے :

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

(پ ۱۱ - التوبہ - رکوع ۲)

اور جو لوگ سب سے پہلے ہجرت کرنے والے، اور مدد کرنے والے ہیں، اور جو اُن کی پیروی کرنے والے ہیں، نیکی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ اُن سب سے راضی ہو چکا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ ازلی میں تمام سابقین اوّلین کو خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار، اور ان کے سچے پیروکاروں کو اپنی ابدی رضا اور خوشنودی کی بشارت دی ہے۔ اسی ارشادِ الٰہی میں مہاجرین اور انصار کے سابقین اور لاحقین دونوں گروہوں کو (بلکہ ایک تفسیر کے لحاظ سے تابعین کرامؒ کو بھی وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ) رضائے الٰہی کی سند مل چکی ہے کہ خدا اُن سے راضی ہے، وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن کو بھی ہمارے لئے معیارِ حق قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ (المتوفی ٦۸ھ) روایت

کرتے ہیں (اس روایت کے الفاظ میں اگرچہ جزوی اختلاف ہے مگر مفہوم سب کا ایک ہی ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلھم فی النار الاملة واحدة قالوا من ھی یارسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی (ترمذی ج ۲ ص۸۹، مستدرک ج ۱ ص۱۲۹، اور مشکوٰة ج ۱ ص۳۰)

کہ بنی اسرائیل بہتّر ۷۲ فرقوں میں بٹ چکے تھے اور میری اُمت تہتّر ۷۳ فرقوں میں منقسم ہوگی، سب کے سب فرقے دوزخ میں جائیں گے مگر صرف ایک فرقہ۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ وہ کونسا فرقہ ہوگا۔ فرمایا وہ فرقہ ہے جس نے وہ کام کئے جو میں نے اور میرے صحابہؓ نے کئے ہیں۔

اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: وھی الجماعة (ابوداؤد ج ۲ ص۲۷۵، مستدرک ج ۱ ص۱۲۸، ابن ماجہ ص۲۹۶ اور مشکوٰة شریف ج ۱ ص۳۰) یعنی نجات حاصل کرنے والا صرف وہی فرقہ ہے جو اس جماعت (صحابہ کرامؓ) کا ساتھ دینے والا ہو۔ اور اسلام کی اس جماعت سے کٹ کر الگ نہ ہونے والا ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جیسے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور حضرات خلفاءِ راشدینؓ کی سنّت ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہے، اسی طرح ما انا علیہ واصحابی کے ارشاد کے تحت حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال و اعمال بھی ہمارے لئے حق کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ما انا علیہ واصحابی کا ارشاد فرما کر اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہ کرامؓ کی ذواتِ قدسیہ کو حق اور باطل کے پرکھنے کا مقیاس بتایا ہے کہ محض کالے کالے نقوش ہی معیار نہیں، بلکہ وہ ذوات بھی معیارِ حق ہیں جن میں یہ حروف و نقوش، اعمال و احوال بن کر رچ گئے ہیں اور اسی طرح گھل مِل گئے ہیں کہ اب ان کی ذوات کو دین سے الگ کرکے اور دین کو اُن کی ذوات سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ما انا علیہ واصحابی کی حدیث سے صرف حضرات صحابہ کرامؓ کی منقبت اور فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور نیز ان کی محض مقتدائیت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اُمّت کے حق و باطل کے لئے ان کی معیاری شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ محض حق پر ہی نہیں بلکہ حق کے پرکھنے کی کسوٹی اور معیار بھی بن چکے ہیں، جن سے دوسروں کا حق و باطل بھی کھل جاتا ہے۔ اور اُن کا معیارِ حق و

باطل ہونا صرف قیاسی ہی نہیں بلکہ ما انا علیہ و اصحابی کے صریح ارشاد سے بطورِ نصّ ثابت ہے، نہ جیسا کہ باطل اور گمراہ فرقوں نے ان کو ہدفِ ملامت بنا کر درحقیقت کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ پر کلوخ اندازی کی اور اسلام کی بنیادی حقیقت کو کھوکھلا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی ثقاہت و عدالت، دیانت و امانت، صداقت اور للہیت ایسے مسلّم اُمور ہیں جن پر مدارِ اسلام ہے، اور ان پر جرح و تعدیل کرنے والا دین کی عمارت کو گراتا ہے۔ حضرت ملّا علی القاریؒ لکھتے ہیں:

والصحابۃؓ کلّھم عدول مطلقًا لظواھر الکتاب و سنّۃ و اجماع من یعتد بہ۔ (مرقات ج ۵ ص۵۱۷)	حضرات صحابہ کرامؓ سب کے سب مطلقاً عادل اور ثقہ ہیں کیونکہ قرآن کریم اور سنّت اور معتمد علیہ لوگوں کے اجماع کے ظاہری الفاظ اور عبارتیں اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

امام ابنِ اثیر عزّ الدّین علیؒ بن محمد الجزریؒ (المتوفی سن ۶۳۰ھ) لکھتے ہیں:

والصحابۃؓ یشارکون سائر الرّواۃ فی جمیع ذٰلک الا فی الجرح والتعدیل فانّھم کلّھم عدول لا یتطرق الیھم الجرح لان اللہ عزّ وجلّ و رسولہ زکاھم وعدلاھم و ذٰلک مشھور لا نحتاج لذکرہ۔ (اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ج ۱ ص۲)	حضرات صحابہ کرامؓ تمام باتوں میں تمام راویوں میں شریک ہیں مگر جرح و تعدیل میں نہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ سب کے سب عادل اور ثقہ ہیں، اُن پر جرح نہیں کی جا سکتی۔ اِس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے اُن کی پاکبازی اور تعدیل بیان فرمائی ہے اور یہ ایک ایسی مشہور بات ہے جس کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

غرضیکہ حضرات صحابہ کرامؓ اُمّت کے لئے حق و باطل، خیر و شر، سنّت و بدعت اور ثواب و عقاب وغیرہ اُمور کے پرکھنے کی کسوٹی اور معیارِ حق ہیں۔ جو کام اُنہوں نے کیا وہ حق اور سنّت اور باعثِ نجات ہے، اور ان کا ہر قول و فعل ہمارے لئے ذریعہ فلاح اور دینی ہمارے لئے ترقّی اور سعادت کی راہ ہے، اور اس کی خلاف ورزی تباہی اور بربادی پر منتج ہوگی اور بس۔

مشہور غیر مقلّد عالم مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"اقوالِ صحابہؓ کے ساتھ استدلال کرنا ٹھیٹھ اسلام میں داخل ہے" (ضمیمہ رسالہ اہل حدیث ص۳)

نیز وہ لکھتے ہیں :

"اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صحابہؓ کے اقوال میں اوّل تو رفع یعنی رسولؐ کی حدیث ہونے کا احتمال قوی ہے، اور اگر کہیں فہم کا دخل ہو تو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش کی طرف زیادہ نزدیک ہیں، کیونکہ صحابہؓ آپ کی طرزِ بات اور طرزِ استدلال کو دیکھتے تھے۔ اور آپ کے کنایہ و اشارے سے خُوب سمجھتے تھے، اور جتنی باتیں مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں اُن سے خوب واقف تھے۔ اور بعد کے لوگ ان باتوں سے محروم ہیں۔ اس لئے پچھلوں کے اجتہاد پر صحابہؓ کے اقوال کو مقدّم کرنا لازم ہے، اور صحابہؓ چونکہ ان باتوں میں برابر ہیں اس لئے اُن کے اقوال آپس میں ایک دوسرے کو ماننے لازم نہیں۔ بس یہ ہیں اقوالِ صحابہؓ کے حجت ہونے کے معنی"۔ (فافہم انتہی بلفظہٖ۔ ایضاً ص۸)۔

اگر حضرات صحابہ کرامؓ کا کسی بات پر اجماع و اتّفاق ہو جائے تو اس کے حجّت اور قطعی ہونے میں شاید ہی کوئی بدبخت کلام کرتا ہو۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ (المتوفّٰی ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں کہ :

"صحابہ کرامؓ کا اجماع واجب الاتّباع ہے، بلکہ صحابہ کرامؓ کا اجماع قوی تر حجّت اور دوسری (غیر منصوص) حجتوں پر مقدّم ہے"۔ (اقامۃ الدّلیل ج ۳ ص۱۳۰)۔

اور حافظ الدّنیا امام ابنِ حجر عسقلانیؒ (المتوفّٰی ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں :

ان اھل السّنّۃ والجماعۃ متّفقون علیٰ ان اجماع الصّحابۃ حجّۃ (فتح الباری ج ۳ ص۲۶۶)	کہ اہلِ سنّت والجماعۃ اس بات پر متفق ہیں، کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا اجماع حجّت ہے۔

حضرات صحابہ کرامؓ کے اجماع کے حجّت ہونے پر متعدّد[1] حوالجات پیشِ نظر ہیں، مگر ہمارا مقصد دلائل کا

---

[1] حضرات صحابہ کرامؓ کے تنقید اور جرح سے بالاتر ہونے کے لئے استیعاب ج ۱ ص۲، اصابہ ج ۱ ص۱۰، تقریر الاصول ج ۲ ص۲۶۱، فواتح الرحموت ج ۱ ص۱۵۶، اور مسامرہ ج ص۱۵۸ وغیرہ ملاحظہ کریں — اور اجماعِ صحابہؓ اور اقوالِ صحابہؓ کے حجّت ہونے کے لئے : منہاج السّنّۃ ج ۱ ص۲۵۶، اعلام الموقعین ج ۱ ص۶۷، بدائع الفوائد ج ۴ ص۷۷، طبقات سُبکی ج ۱ ص۲۶۲، عمدۃ القاری ج ۳ ص۲۲۳، کتاب العلم لابن عبدالبرؒ ج ۲ ص۸۳ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

استیعاب نہیں بلکہ صرف بطورِ نمونہ یہ چند عبارتیں ہدیۂ قارئینِ کرام کر دی گئی ہیں، جن سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ کی ذوات کو بھی دین کے حق و باطل ہونے کا معیار اور مقیاس بنایا گیا ہے۔

اجماعِ اُمّت | حضرات خلفائے راشدینؓ کی سنّت اور حضرات صحابہ کرامؓ کے اجماع کے بعد اُمّتِ مرحومہ کے اجماع و اتّفاق کا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اُمّتِ مرحومہ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے یوں ارشاد فرماتا ہے کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (پ۴۔ آل عمران۔ ع۳)

کہ تم سب اُمّتوں سے بہتر اُمّت ہو جو بھیجی گئی انسانوں کی بھلائی کے لئے، تم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ تعالیٰ پر۔

اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت کو نہ تو طاقتور اُمّت کہا اور نہ دولت مند، بلکہ بہتر اور بھلی اُمّت کہا۔ اس لئے کہ اس اُمّت کا کام دنیا میں نیکی کی تعلیم دینا اور بدی سے روکنا ہے۔ پھر یہ صرف اپنی ہی قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام اقوامِ عالم کی بھلائی اور فلاح چاہنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اِس اُمّت سے متعلق ارشاد فرمایا:

انتم شهداء الله في الارض (متفق علیہ مشکوٰۃ ج۱ ص۱۴۵) کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین میں گواہ ہو۔

جس چیز کو یہ اُمّت خیر کہے گی وہ عند اللہ تعالیٰ بھی خیر ہی ہوگی، اور جس چیز کو شر کہے گی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی شر ہی ہوگی۔ یہ اُمّت سرکاری گواہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) احکام لعلامہ آمدیؒ ج ۲ ص۱۴۰، ازالۃ الخفاء ج ۱ ص۱۱۶، اور غیر مقلدین حضرات کی مشہور کتاب یسر من رأی ج ۲ ص۴۸ کا مطالعہ کیجئے۔

نوٹ: اسی جماعت کا ساتھ چھوڑنے والا تارکِ سنّت کہلاتا ہے۔ چنانچہ امام حاکمؒ، علامہ ذہبیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں: واما ترك السنّة فالخروج من الجماعة (مستدرک ج ۱ ص۱۱۲ وتلخیص علیہ ج ۱ ص۱۲۰، ومنہاج السنّۃ ج ۴ ص۲۳۶ وازالۃ الخفاء ص۱۱۸) کہ ترکِ سنّت اس جماعت سے نکلنے کا نام ہے۔

دن اسی اُمّت کی شہادت پر تمام اُمّتوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا، اور اِسی اُمّت کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہ کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔

اس حدیث کو پیش کرنے کے بعد امام حاکمؒ (المتوفی ۴۰۵ھ) لکھتے ہیں:

یستدل بھا علی الحجّۃ بالاجماع (مستدرک ج ۱ ص ۱۱۲) — اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ اجماع حجّت ہے۔

اور علامہ شمس الدین ابو عبداللہ الذہبیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں:

تستدل علی ان الاجماع حُجّۃ۔ (تلخیص المستدرک ج ۱ ص ۱۱۲) — یعنی (ان احادیث سے) اجماع کے حجّت ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔

اور حضرت ملا علی القاریؒ ان اللہ لا یجمع امتی علی ضلالۃ (الحدیث) کی شرح میں لکھتے ہیں:

فی الحدیث دلیل علی حقیّۃ الاجماع۔ (مرقات علی المشکوۃ ج ۱ ص ۲۳۰) — کہ اس حدیث میں اس امر کی دلیل موجود ہے کہ اُمّت کا اجماع حق اور صحیح ہے۔

اُمّت کے اجماع کے حق اور صحیح ہونے پر بے شمار دلائل موجود ہیں، اور اربابِ اُصول نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ چنانچہ مشہور اصولی شیخ الاسلام علیؒ بن محمد البزدوی الحنفیؒ (المتوفی ۴۸۲ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ:

فصار الاجماع کآیۃ من الکتاب او حدیث متواتر فی وجوب العمل والعلم فیکفر جاحدہ فی الاصل۔ (اصول بزدوی ج ۳ ص ۲۶۱) — اجماع کی مثال ایسی ہی ہے جیسے قرآن کریم کی آیت یا حدیثِ متواتر۔ جیسے یہ موجبِ عمل وعلم ہیں، اسی طرح اجماع بھی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ نفسِ اجماع کا منکر کافر ہوگا۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ:

والاجماع اعظم الحجج۔ (الحسبۃ ص ۶۳) — اجماع بہت بڑی حجّت ہے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

واما اجماع الامۃ فھو فی نفسہ حق لا تجتمع — بہر حال اُمّت کا اجماع فی نفسہٖ حق ہے اُمّت کبھی گمراہی

الامۃ علیٰ ضلالۃ وکذٰلک القیاس صحیح ۔ (الحسبۃ ص۵۹ ومثلہ فی معارج الاصول ص۱۱) ۔

پر مجتمع نہیں ہوگی اور اسی طرح قیاس صحیح بھی حق اور حجت ہے ۔

خیر القرون کا تعامل بھی حجّت ہے حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین اور اتباع تابعین کی اکثریت کا کسی کام کو بِلا نکیر کرنا یا چھوڑنا بھی ایک حجّتِ شرعی ہے، اور ہمیں ان کی بھی پیروی کرنا ضروری ہے۔ اس امر کے ثبوت پر متعدد حدیثیں موجود ہیں ۔ ہم اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند حدیثیں عرض کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود (المتوفی ۳۲ھ) فرماتے ہیں کہ :

عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم، قال خیر النّاس قرنی ثمّ الّذین یلونھم ثمّ الّذین یلونھم ثم یجیٔ اقوام تسبق شھادۃ احدھم یمینہٗ ویمینہٗ شھادتہٗ (بخاری ج ا ص۳۶۲، والفظ لہ ومسلم ج ۲ ص۳۰۹ ومسند طیالسی ص۳۹، وموارد الظمآن ص۵۶۹) ۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانہ میں ہیں۔ پھر ان کے بعد والے اور پھر ان کے بعد والے پھر ایسی قومیں آئیں گی جن کی شہادت قسم سے، اور قسم شہادت اور گواہی سے سبقت کرے گی۔

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

اوصیکم باصحابی ثم الّذین یلونھم ثم الّذین یلونھم ثم یفشو الکذب حتّٰی یحلف الرّجل ولا یستحلف ویشھد ولا یستشھد فمن اراد منکم بُحبُوحۃ الجنّۃ فلیلزم الجماعۃ (الحدیث) ۔ (مسند ابو داؤد طیالسی ص۷، مستدرک ج ا ص۱۱۴ قال الحاکمؒ والذہبیؒ علی شرطھما ۔ مثلہ فی المشکوٰۃ ج ۲ ص۵۵۴ وفی المرقات رواہ النسائی واسنادہٗ صحیح وموارد الظمآن ص۵۶۸)

مَیں تمہیں اپنے صحابہؓ کے بارے میں وصیّت کرتا ہوں (کہ اُن کے نقشِ قدم پر چلنا) پھر ان کے بارے میں جو اُن سے ملتے ہیں، پھر اُن کے بارے میں جو اُن سے ملتے ہیں، پھر جھُوٹ عام ہو جائے گا یہانتک کہ آدمی بِلا قسم دیئے بھی قسم اُٹھائیں گے اور بلا گواہی طلب کئے بھی گواہی دیں گے ۔ سو جو شخص جنّت کے وسط میں داخل ہونا چاہتا ہے تو وہ اس جماعت کا ساتھ نہ چھوڑے ۔

حضرت عمرانؓ بن حصینؓ (المتوفّی ۵۲ھ) آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم تاتی اقوام یعطون الشھادۃ قبل ان یسئلوھا (مستدرک ج ۳ ص۴۷۱ واللفظ لہٗ قال الحاکم والذھبی علیٰ شرطھما و ترمذی ج ۲ ص۴۵)

کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب لوگوں سے بہتر قرن میرا ہے، پھر اُن کا جو اس سے ملتے ہیں، پھر وہ جو اس سے ملتے ہیں۔ پھر ایسی قومیں آئیں گی جو اس سے قبل کہ اُن سے گواہی طلب کی جائے وہ گواہی دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

ان کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں :

و یخونون ولا یؤمنون و یفشوا فیھم السمن۔ (ترمذی ج ۲ ص۴۵) و قال حسن صحیح۔

اور خیر القرون کے بعد آنے والے لوگ خیانت کریں گے، اور امانت میں ان پر اعتبار نہیں کیا جائے گا اور ان میں موٹاپا خوب ظاہر ہوگا۔ (یعنی فکرِ آخرت سے غافل اور حلال و حرام سے بے نیاز ہو کر خوب کھائیں گے)۔

اور ان کی ایک روایت میں یوں آتا ہے :

و ینذرون ولا یوفون۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۲۸۴)

اور وہ لوگ نذریں مانیں گے اور اُن کو پورا نہیں کریں گے۔

ان روایات سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون کے بعد جو لوگ پیدا ہوں گے، اُن میں دین کی وہ قدر و عظمت نہ ہوگی جو خیر القرون میں تھی۔ جھوٹ ان میں بکثرت رائج ہو جائے گا۔ بات بات پر بلا طلب کئے قسم اُٹھاتے پھریں گے اور بے تحاشا گواہی دیں گے۔ امانت کی پروا نہ کریں گے اور خیانت اُن کا پیشہ ہوگا۔ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے ایسے بے نیاز ہوں گے کہ کھا کھا کر خُوب فربہ ہوں گے اور پیٹ کی فکر کی وجہ سے حلال و حرام کی تمیز ہی جاتی رہے گی۔ نذریں اور مَنّتیں مان تو لیں گے مگر اُن کو پورا کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ الغرض ظاہری اور باطنی، قولی اور فعلی ہر قسم کے معاملات میں انکی دینی زندگی میں انحطاط ہی انحطاط ہوگا۔ ظاہر امر ہے کہ امانت و صداقت و حق پسندی کا جو جذبہ خیر القرون کے لوگوں میں تھا، وہ بعد والوں میں نہ تھا۔ کیونکہ خیر القرون کے بعد جھوٹ، خیانت اور جھوٹی گواہی کے

علاوہ ایسی ایسی بدعات اور خرافات نکالی گئیں کہ دینِ اسلام مظلوم ہوگیا اور بدعت نے سنّت کی جگہ لے لی۔ بلاشک خیر القرون میں بھی فتنوں نے سر اُٹھایا تھا مگر اوّلاً وہ بعد کے پیدا ہونے والے دینی اور دُنیوی فتنوں سے بہت کم تھے۔ و ثانیاً خیر القرون کی اکثریت نے ان کو قبول کرنے سے سراسر انکار کر دیا، بلکہ ان فتنوں کو مٹانے کے لئے انہوں نے اپنی عزیز جانیں بھی قربان کر دیں اور بعد کو آنے والوں میں یہ جذبہ نسبتاً بہت ہی کم رہا ہے۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ :

سأل رجل النّبیّ صلّی الله علیه وسلم ایّ النّاس خیر قال القرن الّذی انا فیه ثمّ الثّانی ثم الثالث (مسلم ج ۲ ص۳۱۱)۔

ایک شخص نے آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے دریافت کیا کہ کون لوگ بہتر ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ وہ قرن بہتر ہے جس میں مَیں ہوں پھر دوسرا قرن بہتر ہے اور پھر تیسرا۔

حضرت امام محی الدّین ابوزکریا یحییٰؒ بن شرف النوویؒ (المتوفّی ۶۷۶ھ) خیر القرون کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے قرن کے متعدّد معانی بیان کرتے ہیں، اور پھر آخر میں لکھتے ہیں :

والصّحیح ان قرنه صلّی الله علیه وسلّم الصّحابةؓ والثانی التابعون والثالث تابعوهم۔ (شرح مسلم ج ۲ ص۳۰۹)۔

صحیح بات یہ ہے کہ آپ کے قرن سے حضرات صحابۂ کرامؓ کا قرن اور دوسرے قرن سے تابعینؒ کا قرن اور تیسرے قرن سے تبع تابعینؒ کا قرن مراد ہے۔

اس سابق بحث سے یہ امر بالکل واضح ہوگیا کہ خیر القرون تین قرن ہیں اور انہی کو قرونِ ثلاثہ یا قرونِ مشہود لہا بالخیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ پہلے قرن سے حضرات صحابۂ کرام رضؓ اور دوسرے سے تابعینؒ اور تیسرے سے تبع تابعینؒ مراد ہیں۔

مشہور مؤرّخِ اسلام علّامہ عبدالرحمٰن بن خلدون المغربیؒ (المتوفّی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں :

هذا هو الّذی ینبغی ان تحمل علیه افعال السّلف من الصّحابة والتّابعین فهم خیار الامّة واذا جعلناهم عرضة القدح فمن

اسی خیریت پر مناسب ہے کہ سلفؒ کے اعمال کو حمل کیا جائے جو حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ تھے وہ اُمّت کی بہترین جماعت تھی اور جب ہم نے ان کو ہدفِ ملامت بنا دیا تو پھر

الّذی یختص بالعدالة والنّبیّ صلی اللہ علیہ وسلم یقول خیر النّاس قرنی ثمّ الّذین یلونھم مرّتین اوثلاثاً ثم یفشوا الکذب فجعل الخیرة وھی العدالة مختصة بالقرن الاوّل والّذی یلیه فایّاك ان تعوّد نفسك اولسانك التعرض لاحد منھم۔

(مقدمہ ابنِ خلدون ص۲۱۸)

عدالت کے ساتھ کون مختص ہوگا، حالانکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، لوگوں کا بہترین قرن میرا قرن ہے۔ پھر وہ ہے جو اس سے ملتا ہے، دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ، پھر جھوٹ رائج ہو جائے گا۔ آپ نے ان کی بہتری کو عدالت میں منحصر کر دیا ہے، اور وہ قرنِ اوّل اور ثانی، (اور ثالث) کے ساتھ خاص ہے۔ خبردار ان میں سے کسی کے متعلق دل میں بُرا خیال اور زبان پر بُرا لفظ ہرگز نہ لانا۔

اور یہی علّامہ عدالت کی تفسیر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

العدالة وھی وظیفة دینیّة۔

(مقدمہ ص۲۲۴)

عدالت دین کا ایک وظیفہ ہے اور دین کی ایک عمدہ خصلت ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ خیر القرون کے تین قرن ہیں اور ان قرون سے مراد حضرات صحابہ کرامؓ تابعین اور تبع تابعینؒ کا قرن ہے تو طبقاتِ رجال کی کتابوں میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ تبع تابعینؒ کا دور ۲۲۰ھ تک رہا ہے اور یہی وہ حضرات ہیں جن کے نقشِ قدم پر چل کر ہمیں کامیابی نصیب ہو سکتی ہے اور وہی اس اُمّتِ مرحومہ کا بہترین گروہ ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فریقِ مخالف کے وہ اعتراضات جو خیر القرون کے مفہوم پر اُن کی طرف سے وارد ہوتے ہیں، یہاں ہی عرض کر دیں اور ایک طائرانہ نگاہ ان پر بھی ڈال لیں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟

پہلا اعتراض:

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عمرانؓ بن حصینؓ کی روایتوں میں جو مسلم وغیرہ میں ہیں، شک کے الفاظ آتے ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قرن کے بعد دو قرن ذکر کئے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قرن ذکر کئے۔ اب کیسے معلوم ہو کہ تین قرن خیر القرون ہوں گے یا چار (محصلہ) ان کے اصل

بعض الفاظ بھی ملاحظہ کرلیجئے۔ وہ فرماتے ہیں :

"پس قرونِ ثلاثہ کا قاعدہ بروایاتِ صحیحہ مشکوک ٹھہرا"۔ (بلفظہٖ انوار ساطعہ ص۲۰)

جواب :

ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت عمرانؓ بن حصینؓ اور حضرت عائشہؓ کی جو صحیح روایات پیش کی ہیں ان میں علی التعیین تین قرن ہی ذکر کئے گئے ہیں۔ چوتھے قرن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت ابنِ مسعودؓ کی روایت بخاری شریف میں متعدد جگہ آتی ہے (مثلاً ج ۱ ص۳۶۲ و ج ۱ ص۵۱۵ و ج ۲ ص۹۵۱ و ج ۲ ص۹۸۵)۔ نہ ان میں شک کے الفاظ آتے ہیں اور نہ چوتھے قرن کا ذکر ہے۔ امام مسلمؒ نے جو روایت حضرت ابنِ مسعودؓ کی اُصول میں پیش کی ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ البتہ امام مسلم نے جو روایات متابعات میں اور درجۂ دوم میں پیش کی ہیں، جن میں ایک روایت حضرت ابنِ مسعودؓ اور دوسری حضرت ابوہریرہؓ کی اور تیسری حضرت عمرانؓ بن حصینؓ کی ہے ان میں شک کے الفاظ آتے ہیں۔ لیکن امام مسلمؒ کا قاعدہ ہی الگ ہے۔ وہ اپنے مقدمۂ مسلم ص۳،۴ میں لکھتے ہیں کہ "ہم درجۂ اوّل میں صرف وہ روایات پیش کریں گے جن کے راوی حفظ اور اتقان میں مسلّم ہوں گے اور وہ چنداں وہم اور خطا کا شکار بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ اور درجۂ دوم میں ایسے راویوں کی روایتیں ہوں گی جو حفظ و اتقان میں بھی پہلے راویوں کے ہم پلّہ نہ ہوں گے نیز ان سے خطا اور وہم بھی صادر ہوا ہوگا"۔ امام مسلمؒ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے تین قرن والی روایت بالکل صحیح ہے اور جن روایتوں میں چار قرنوں کا ذکر ہے وہ راویوں کے وہم اور ان کی غلطی پر محمول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مسلمؒ ان شک والی روایتوں کے بعد حضرت عائشہؓ کی تین قرن والی روایت پیش کرکے اُس پر مُہر لگاتے ہیں، کہ صحیح تین ہی قرن ہیں۔ لہٰذا قرونِ ثلاثہ کا تعیّن صحیح روایات سے ثابت ہوا، اور شک والی روایتیں راویوں کے وہم اور خطا پر محمول ہوئیں۔ علاوہ بریں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ امام مسلمؒ نے جو روایتیں متابعات میں اور درجۂ دوم میں نقل کی ہیں، ان میں بعض میں یہ الفاظ آتے ہیں : واللہ اعلم اذکر الثالث ام لا۔ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ نے (اپنے قرن کے بعد) تیسرے قرن کا ذکر کیا ہے یا نہیں کیا؟"

اور ایک نسخہ میں یوں آتا ہے : فلا ادری اقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد قرنہ مرتین او ثلاثا ۔ "مجھے معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قرن کے بعد دو قرنوں کا ذکر کیا، یا تین کا"۔ بخاری میں حضرت عمرانؓ سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی لاعلمی سے جاننے والوں کی روایات پر (جن میں حضرت ابن مسعودؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ ہیں) مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑتا جو اپنے حفظ و اتقان صحیح اور پختہ علم کے مطابق وثوق کے ساتھ صرف تین قرنوں کا ذکر فرماتے ہیں اور ان کی روایات میں کوئی لفظ شک اور شبہ کا بھی نہیں ہے۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ جو راوی اپنی لاعلمی کا ذکر کرتے ہیں، اُن کی روایات کو لے کر تین قرنوں کے قاعدہ کو مشکوک ٹھہرایا جا رہا ہے، اور وثوق و اعتماد سے صرف تین ہی قرن بیان کرنے والوں کی صحیح روایات کی طرف دھیان ہی نہیں کیا جاتا ؏

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

دُوسرا اعتراض :

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں لفظ قرن واقع ہوا ہے، اور یہ بہت معانی میں مشترک ہے۔ قرن، سیّد القوم کو بھی کہتے ہیں، کذا فی القاموس۔ اور بعضوں نے کہا، قرن زمانہ ہے اور بعضوں نے کہا مُقیّد، پھر اُن میں بھی اختلاف ہے۔ دس برس یا چالیس یا ستر یا سو، یا ایک سو بیس الخ۔ (انوار ساطعہ ص۲ بلفظہٖ)۔

جواب :

مولوی صاحب کی بڑی نوازش ہے کہ انہوں نے قرن کے معنیٰ قاموس سے سینگ اور زلف کے نہیں نقل کر دیئے، ورنہ اُن کا کوئی کیا بگاڑ لیتا؟ مگر یہ اُن کی ایک اصولی اور کھلی غلطی ہے کہ وہ لفظ قرن کی تعیین میں کبھی قاموس کی طرف دوڑتے ہیں اور کبھی بعضوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ اگر وہ ذرا سی تکلیف گوارا کرتے، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کی طرف مراجعت کرتے تو خود بخود اُن کا وہم دُور ہو جاتا، اور خود اُن کو اقرار ہے کہ محدثوں میں یہ ٹھہرا ہوا ہے کہ بعض حدیثیں شرح ہوتی ہیں بعض حدیث کی (بلفظہٖ انوار

بساطہ ص۲۷) مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت پہلے نقل کی جاچکی ہے کہ ایک سائل کے جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا "سب سے بہتر قرن وہ ہے جس میں مَیں ہوں اور پھر دوسرا اور پھر تیسرا" یہ جواب آپ نے ای النّاس خیر (کہ کون لوگ بہتر ہیں ؟) کے سوال پر ارشاد فرمایا تھا۔ اس صحیح اور صریح روایت سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ آپ نے خیریت کو تین قرنوں میں منحصر کر دیا اور حرف ثمّ کے ساتھ درجہ بدرجہ خیریت کی تین قرنوں میں تنصیص اور تخصیص کر دی ہے۔ اور دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ آپ نے قرن کے معنی سیّد القوم نہیں کئے کہ ہمیں قاموس وغیرہ کی ورق گردانی کرنی پڑے، بلکہ آپ نے قرن کے معنی بہترین انسانوں کے ایک طبقہ سے کئے ہیں اور اس معنی میں پہلا قرن حضرات صحابۂ کرامؓ کا، دوسرا تابعینؒ کا اور پھر تیسرا تبع تابعینؒ کا قرن ہے۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ (المتوفّی ۷۴ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یاتی علی النّاس زمان فیغزو فئام من النّاس فیقال ھل فیکم من صاحب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم فیفتح لھم ثمّ یأتی علی النّاس زمان فیغزو فئام من النّاس فیقال ھل فیکم من صاحب اصحاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم فیفتح لھم ثمّ یاتی علی النّاس زمان فیغزو فئام من النّاس فیقال ھل فیکم من صاحب من صاحب اصحاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم فیفتح لھم۔ (بخاری ج ۱ ص۵۱۵ و مسلم ج ۲ ص۳۰۸)۔

لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا، جس میں لوگوں کی ایک جماعت جہاد کرے گی۔ کہا جائے گا کہ کیا تم میں کوئی صحابی ہے؟ وہ کہیں گے ہاں۔ سو ان کی وجہ سے ان کو فتح نصیب ہوگی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ایک گروہ جہاد کرے گا۔ کہا جائے گا، کیا تم میں کوئی تابعی ہے؟ وہ جواب دیں گے ہاں۔ سو اُن کی برکت سے کامیابی حاصل ہوگی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا، کہ ایک طائفہ جہاد کرے گا۔ کہا جائے گا، کیا تم میں کوئی تبعِ تابعی ہے؟ وہ بولیں گے، ہاں! سو اُن کی بدولت فتح و کامرانی ہوگی۔

حضرت عائشہؓ کی سابق روایت سے روزِ روشن کی طرح یہ بات واضح اور آشکارا ہو جاتی ہے کہ

خیر القرون کا معنٰی اور مفہوم کوئی مجمل اور گول مول حقیقت نہیں ہے بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق خیر القرون کا مفہوم قرنِ اوّل، ثانی اور ثالث کے اندر بند اور منحصر ہے۔ اور قرن کا معنی اور مفہوم بھی مجمل نہیں بلکہ اس سے انسانوں کا بہترین طبقہ مراد ہے اور اس لحاظ سے حضرت ابو سعید الخدریؓ کی حدیث کے پیش نظر خیر القرون کا مفہوم حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ میں بند ہے، نہ تو ہمیں قرن سے دس سال مراد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ چالیس۴۰ نہ ستّر۷۰ اور نہ سَو۱۰۰ وغیرہ۔ باقی جن لوگوں نے قرن کے یہ معانی کئے ہیں، تو صحیح اور صریح حدیث کے ہوتے ہوئے اُن کی بات قابل التفات ہی نہیں ہے۔

تنبیہ: حضرت ابو سعید الخدری کی ایک روایت میں جس کو امام مسلمؒ نے درجہ دوم میں بطورِ متابعت پیش کیا ہے، چار طبقوں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں:

وفی روایة مسلم ذکر طبقة رابعة وهی روایة شاذة واکثر الرّوایات یقتصر علی الثلاثة۔ (فتح الباری ج ۷ ص۲)۔	مسلم کی ایک روایت میں چوتھے طبقہ کا ذکر بھی آیا ہے مگر وہ روایت شاذ ہے، اور اکثر روایات میں صرف تین ہی طبقوں کا ذکر آتا ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ صحیح روایات میں صرف تین ہی طبقوں کا ذکر ہے جو حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے طبقات ہیں۔ چوتھے طبقے کا ذکر جس روایت میں آیا ہے وُہ حضرات محدثینِ کرامؒ کے نزدیک معلول اور شاذ ہے۔ اور یہ اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ شاذ روایات کو لے کر اس کی وجہ سے صحیح روایات کو معلول نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اور شاذ روایت خود متروک اور ناقابلِ احتجاج ہوگی۔ (دیکھئے توجیہ النظر ص۲۳۱ وغیرہ)۔

تیسرا اعتراض:

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ: "کوئی یہ نہ سمجھے کہ قرونِ اولیٰ میں جو کچھ ہو گا سب خیر ہو گا اس لئے کہ تمام بدعتیں نذر و ارجاء و خروج و رفض وغیرہ سب قرونِ ثلاثہ ہی میں پیدا ہوئیں اور اوقات خیر القرون میں ہونے کے سبب ان کو کوئی اہلِ سنّت و جماعت، جماعتِ خیر نہیں کہتا (بلفظہٖ انوارِ ساطعہ ص۲۹)۔

اور مفتی احمد یار خان صاحب نے تو کمال ہی کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں : یہ مطلب نہیں کہ ان تین زمانوں میں جو بھی کام ایجاد ہوا، اور کوئی بھی ایجاد کرے وہ سُنّت ہو جائے ۔ یہاں سُنّت ہونے کا ذکر ہی کہاں ہے ۔ ورنہ مذہب جبریہ اور قدریہ زمانہ تابعینؒ میں ایجاد ہوا، اور امام حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا قتل اور حجاج کے مظالم ان ہی زمانوں میں ہوئے ۔ تو کیا معاذ اللہ ان کو بھی سُنّت کہا جائے گا؟ (بلفظہٖ جاء الحق وزہق الباطل ص۲۱۷) ۔

جواب : یہ دونوں معترض صاحبان خود ایک اصولی غلطی کا شکار ہیں، اس لئے وہ دُور از کار باتیں بنا کر ایجادِ بدعات کا چور دروازہ تلاش کرتے ہیں ۔ ان دونوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ خیر القرون کی احادیث میں قرن سے مراد زمانہ ہے اور خیر القرون سے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے تین زمانے مراد ہیں، جب ہی تو ان کو جبریہ اور قدریہ کے فرقوں کا اور خارجیوں اور رافضیوں کے گروہوں کا اور حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور حجاج کے مظالم کا قصہ چھیڑنا پڑا کہ یہ سب کام ان تین زمانوں میں ہوئے ہیں، حالانکہ ان کو کوئی بھی سنّت نہیں کہتا، اور خیر القرون کی حدیث سے استدلال کرنے والے یا تو ان بدعات اور مظالم کو بھی سنّت کہیں اور یا اس حدیث سے استدلال ہی نہ کریں، تا کہ ہمارے لئے بدعات کی ایجاد میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے اور ہم جس چیز کو چاہیں سنّت یا کم از کم بدعتِ حسنہ کا غلاف پہنا کر اس پر عمل کرتے رہیں ۔ لیکن انہوں نے اس امر پر مطلقاً غور نہیں کیا کہ اگرچہ لغت میں قرن کے جہاں اور معنی بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک معنی زمانہ بھی ہے، اس سے انکار نہیں ہے، مگر سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے قرن کا خود کیا معنی اور مفہوم بیان فرمایا ہے ۔ سو آپ نے صحیح روایات میں یہ پڑھا کہ آپؐ نے قرن کا معنی زمانہ نہیں کیا، بلکہ قرن کا معنی آپؐ نے اہلِ زمانہ کیا ہے ۔ زمانہ اور اہلِ زمانہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ اور اہلِ زمانہ کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ انسانوں کا وہ طبقہ جو ایک زمانہ میں اکٹھا رہے[1]، اور وہ قرنِ اوّل میں حضرات صحابہ کرامؓ، قرنِ ثانی میں

---

[1] علامہ فیومیؒ، مصباح المنیر میں لکھتے ہیں القرن الجیل من النّاس ۔ زجاجؒ قرن کا معنی اہل کل مدۃ کان فیہا نبی او طبقۃ من اہل العلم کرتے ہیں ۔ صاحب مجمع البحار قرن کا معنی اہل کل زمان کرتے ہیں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

تابعینؒ اور قرنِ ثالث میں تبع تابعینؒ ہیں۔ اور ان روایات کی تشریح میں امام نوویؒ اور علامہ ابنِ خلدونؒ کی عبارتیں بھی نقل کی جا چکی ہیں کہ قرنِ اوّل سے حضرات صحابۂ کرامؓ اور ثانی سے تابعینؒ اور ثالث سے تبع تابعینؒ کے پاک نفوس اور خود ان کی برگزیدہ ہستیاں مراد ہیں۔ اور اگر احادیث پر معمولی غور بھی کر لیا جاتا تو معاملہ سہل ہو جاتا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سائل نے ان الفاظ سے سوال کیا تھا ایّ النّاس خیر؟ کون لوگ بہتر ہیں؟ سائل نے اہلِ زمانہ کا سوال کیا ہے زمانہ کے متعلق سوال نہیں کیا۔ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے یہ ارشاد فرمایا کہ بہترین قرن میرا ہے پھر ثانی اور پھر ثالث۔ یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ سائل تو ایّ النّاس خیر کہتے ہوئے اہلِ زمانہ کی خیریت پوچھتا ہو اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اس کو زمانہ کی خیریت بتاتے ہوں۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان۔ یہ کیا قصہ ہوا؟ بخاریؒ کی ایک روایت میں خیر النّاس قرنی آیا ہے اور دوسری میں خیرکم قرنی آیا ہے، اور مسلم وغیرہ میں خیر امّتی قرنی آیا ہے۔ یہ تمام روایات آفتاب نیم روز کی طرح اس پر دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم زمانہ کی خیریت نہیں بیان فرمانا چاہتے بلکہ النّاس، کُم اور اُمّتی (کہ لوگوں میں بہتر، تم میں بہتر اور میری اُمّت میں بہتر) سے اہلِ زمانہ کی خیریت بیان فرماتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ کی یہ روایت بھی نقل کی جا چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں تمہیں اپنے صحابہؓ کے متعلق پھر ان کے بعد والوں کے متعلق اور پھر اُن کے بعد آنے والوں کے متعلق وصیّت کرتا ہوں (کہ انکی پیروی کرنا) یہ تو نہیں فرمایا کہ میں صحابہؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانہ کے بارے میں تمہیں وصیّت کرتا ہوں کہ اس زمانہ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے تین زمانوں کی پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ ان تین زمانوں میں جو اہلِ زمانہ تھے، اُن کی پیروی کا حکم دیا ہے اور وہ حضرات صحابۂ کرامؓ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ابنِ حجرؒ اور شیخ عبد الحق محدّث دہلویؒ قرن کا معنی اھل زمان واحدٍ متقارب الخ سے کرتے ہیں۔ دلیل الطالب ص۸۴۶ و ص۸۴۷ اور صاحب المطالع معنی کرتے ہیں: القرن امّۃ ھلکت فلم یبق منھم (ایضاً ص۸۳۸)

اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی ذوات اور ان کی ہستیاں تھیں۔ باقی صحابی کی تعریف واضح ہے، اس کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ اور تابعی وہ ہوتا ہے جس نے صحابی کی اتباع کی ہو۔ اور تبع تابعی وہ ہوتا ہے جس نے تابعی کی اتباع کی ہو۔ اگر تبع تابعی نے تابعی کی اتباع نہ کی، اور تابعی نے صحابی کی اتباع نہ کی تو وہ ہرگز تبع تابعی اور تابعی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ جیسا کہ صحابی وہ ہے جس نے بحالتِ ایمان تا مرگ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی پیروی نہ چھوڑی ہو۔ جو آپؐ کے طریقہ سے ہٹ گیا وہ صحابی نہ رہا بلکہ مرتد اور منافق کہلایا۔ اس بحث کو پیش نظر رکھ کر مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب سے پوچھیئے کہ وہ کونسا صحابی یا تابعی یا تبع تابعی تھا جس نے جبریہ اور قدریہ کے فرقے ایجاد کئے اور رفض و خروج کی بدعت ایجاد کی۔ وہ کونسا تابعی اور تبع تابعی تھا جس نے امام حسینؓ کو شہید کیا، اور حجاج کو مظالم کی اجازت دی؟ بلا شک یہ اور ان سے بڑھ کر بدعات اور مظالم ان زمانوں میں ظاہر ہوئے۔ لیکن خیر القرون زمانے نہیں کہ ان زمانوں میں جو بھی ایجاد ہو ان کی پیروی کی جائے۔ بلکہ خیر القرون ان زمانوں میں رہنے والوں کا نام ہے اور وہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین اور تبع تابعین ہیں۔ اور نہ تو انہوں نے بدعات ایجاد کیں اور نہ مظالم کئے اور ہمیں انکی پیروی کا حکم ہے۔ باقی جو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جادۂ مستقیم سے ہٹ گیا، نہ وہ صحابی رہا اور نہ تابعی اور نہ تبع تابعی، اور ہم ان کے نقش قدم پر چلنے کے ہرگز پابند اور مکلف نہیں بلکہ ان کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔ باقی رہی اجتہادی غلطی تو وہ محلِ نزاع سے خارج ہے۔ مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب کی یہ ایک اصولی غلطی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے خیر القرون کی تفسیر غلط سمجھی اور غلط کی اور یہ نہ سمجھے کہ ہم خود غلط کار ہیں۔ سچ ہے ع

میں الزام اُن کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

مفتی احمد یار خان صاحب نے خیر القرون کے مفہوم پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں سُنّت ہونے کا ذکر ہی کہاں ہے؟ سبحان اللہ تعالیٰ! کیا ہی نرالی اور عجیب مفتیانہ تحقیق ہے۔ اگر جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صرف اتنا ہی ارشاد فرما دیتے کہ میرے صحابہؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی پیروی کرنا اور اس جماعت کا ساتھ نہ چھوڑنا تو یہ بھی آپ کی سنت ہی ہوتی۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کی روایت میں یہ الفاظ نقل کئے جا چکے

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے :

او صیکم باصحابی ثمّ الذین یلونھم ثم الذین یلونھم الی ان قال فلیلزم الجماعۃ۔	ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں اپنے صحابہؓ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، پھر تابعینؒ اور پھر تبع تابعینؒ کے بارے میں۔ اس جماعت کا ساتھ نہ چھوڑنا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم تو حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی جماعت کو لازم پکڑنے اور اس کو نہ چھوڑنے کی وصیّت اور ضروری حکم فرماتے ہیں، اور مفتی صاحب کہتے ہیں کہ اس میں سنّت کا ذکر ہی کہاں؟ شاید مفتی صاحب کی یہ تحقیق ہو کہ سنّت آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ کے حکم اور تاکیدی حکم (وصیّت) کا نام نہیں ہے بلکہ لفظ سُنّت ہو تو تب ہی سنّت کا اثبات ہوگا ورنہ نہیں۔

یہ تو مفتی احمد یار خان صاحب کی تحقیق تھی۔ اب مولوی عبدالسّمیع صاحب کی بھی سنیئے۔ وہ خیرالقرون کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "ان روایتوں میں کسی جگہ بدعت اور احداث کا ذکر نہیں" (بلفظہٖ انوارِ ساطعہ ص۲۶) ۔ یہ بھی عجیب استدلال ہے۔ ان روایات میں بدعت اور احداث کا ذکر نہیں، لیکن ان میں اس کا ذکر تو ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرات صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی جماعت کا دامن پکڑنے کی وصیّت فرمائی ہے، اس لئے کہ یہ حضرات صحیح معنیٰ میں متبع سنّت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق کی مرضی کو حاصل کرنے والے اور ان کی مخالفت سے ڈرنے والے ہیں، اور دین پر چل کر اُمّت کے لئے ایک بہترین عملی نمونہ ہیں، اور دوسری روایات میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

ایاکم و محدثات الامور۔ کل محدثۃ بدعۃ کل بدعۃ ضلالۃ۔ من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو ردّ۔	بچو تم نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے سے۔ ہر نئی چیز بدعت ہے ہر بدعت گمراہی ہے۔ جس نے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی تو وہ مردود ہوگی۔

اور ان روایات میں بدعات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خیرالقرون کی حدیث سے اتّباع کے متعلق وصیّت کرتے ہوئے آپ نے سنّت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرمائی ہے کہ سنّت اس راستہ کا نام

ہے جس پر یہ اکابر عامل رہے ہیں، اور بدعات کی تردید کی احادیث میں اس امر کو مبرہن کیا گیا ہے کہ خیر القرون کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا، جس کا تعلق دین سے ہو تو وہ بدعت بھی ہے اور مردود بھی۔ خیر القرون کے مفہوم سے اتباع کا حکم دیا اور ایاکم ومحدثات الامور سے اجتناب کا۔ کیا خوب کہا گیا ہے ع

وبضدها تتبین الاشیاء

باقی رہا یہ سوال کہ ان روایتوں میں بدعت اور احداث کا ذکر نہیں، تو نہ سہی۔ جو چیز ان احادیث میں بیان کی گئی ہے وہ ان سے اخذ کر لو، اور جو چیز دوسری احادیث میں بیان ہوئی ہے وہ ان سے لے لو کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی ے

ترے رندوں پہ سارے کھل گئے اسرارِ دیں ساقی
ہُوا علم الیقیں، عین الیقیں، حق الیقیں ساقی

چوتھا اعتراض :

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء میں تحریر فرماتے ہیں کہ خیر القرون میں قرنِ اوّل آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی وفات پر اور قرنِ ثانی حضرت عمرؓ کی وفات پر اور قرنِ ثالث حضرت عثمانؓ کی وفات پر ختم ہو گیا اور حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ کو ہوئی ہے، اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوریؒ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) لکھتے ہیں کہ یہ معنی خیر القرون کے نہایت موزوں اور چسپاں ہیں، اسلام کی شوکت جبھی تک خوب رہی، پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی، اور خیریت قرونِ ثلاثہ کی کم ہو گئی۔ (محصلہ انوارِ ساطعہ ص۲۱)۔

جواب :

حضرت شاہ صاحب کی عبارت سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی عقائد اور اعمال میں پیروی کرنا خیر القرون کے مخالف ہے یقیناً اور قطعاً باطل ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ پہلے صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی پیروی بھی اُمت کے لئے لازم قرار دی گئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم نے اس کے بارے میں وصیت فرمائی ہے۔ یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت شاہ صاحبؒ انکی پیروی اور اتباع کو خیر القرون کے تعامل کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وثانیاً[2] حضرت شاہ صاحبؒ تو ازالۃ الخفاء میں خلافتِ منتظمہ اور خلافت علی منہاج النبوۃ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے یہ ارقام فرماتے ہیں کہ کمالِ خیریت جس میں نبوّت و رسالت کی کماحقہٗ جھلک تھی وُہ صرف حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت تک ہی رہی ہے اور اس کے بعد کمالِ خیریت باقی نہیں رہی اور خلافتِ منتظمہ کی جگہ خلافتِ غیر منتظمہ نے لے لی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نفسِ خیریت بھی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ پہلے قرن جیسی خیریت دوسرے میں نہ تھی اور دوسرے جیسی خیریت تیسرے قرن میں نہ تھی۔ مع ہذا فی الجملہ قرونِ ثلاثہ خیر القرون ہی تھے۔ وثالثاً[3] اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت شاہ صاحب کی تحقیق ہی یہی ہے کہ وہ خیر القرون کو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ختم سمجھتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسرے دلائل اور صحیح احادیث کے پیش نظر دیگر حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھتے، یا ان کی اتباع کو باعثِ نجات تصوّر نہیں فرماتے، یا عقیدہ و عمل میں ان کی اتباع کے علاوہ کسی اور کی اتباع کو صحیح خیال فرماتے ہیں خود حضرت شاہ صاحبؒ اپنی مایۂ ناز کتاب میں ارقام فرماتے ہیں:

اقول الفرقة الناجية هم الأخذون فی العقيدة والعمل جميعا بما ظهر من الكتاب والسّنّة وجرى عليه جمهور الصّحابةؓ والتّابعين الیٰ ان قال وغير الناجية كل فرقة انتحلت عقيدة خلاف عقيدة السّلف او عملا دون اعمالهم (حجۃ اللہ البالغہ ج۱ ص۱۰۰ طبع مصر)	میں کہتا ہوں کہ فرقہ ناجیہ صرف وہی ہے جو عقیدہ اور عمل دونوں میں کتاب وسنّت کی اور جس پر جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کار بند تھے پیروی کرے (پھر آگے ارشاد فرمایا) اور غیر ناجی ہر وہ فرقہ ہے جس نے سلف کے عقیدہ کے خلاف کوئی اور عقیدہ یا ان کے عمل کے خلاف کوئی اور عمل اختیار کر لیا۔

اس عبارت کو بار بار پڑھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ تو صرف اس فرقہ کو ناجی تسلیم کرتے ہیں جو عقیدہ اور عمل دونوں میں سلف یعنی حضرات صحابہ کرام اور تابعین عظام کی پیروی کرتا ہو، اور فرماتے ہیں کہ ان کے عقیدہ اور عمل کے خلاف جو عقیدہ یا عمل کسی نے اختیار کیا وہ یقیناً غیر ناجی ہو گا

اور دوسرے مقام پر اس فرقۂ ناجیہ اور اہلِ حق کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :

فاخذوا یتبعون احادیث النّبی صلّی اللہ علیہ وسلم و اٰثار الصّحابۃ والتّابعینؒ والمجتھدینؒ
(حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص۱۴۹ و مثلہ فی الانصاف ص۳۶)

ان اکابر نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی احادیث اور آثارِ صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمۂ مجتہدین کی خوب پیروی کی ہے۔

مشہور ائمۂ مجتہدین میں حضرت امام ابوحنیفہؒ (المتوفّٰی ۱۵۰ھ) تابعی ہیں اور دیگر ائمہ مثلاً حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ تبع تابعینؒ میں شامل ہیں۔ غرضیکہ حضرت شاہ صاحبؒ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی عقیدہ و عمل دونوں میں اتباع کو نجات کا ذریعہ اور اس کی علامت اور نشانی بتاتے اور ان کی خلاف ورزی کو باعثِ ہلاکت اور سببِ عدمِ نجات فرماتے ہیں۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک حضرات خلفاء راشدینؓ کے علاوہ جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم کی اتباع بھی ضروری ہے اور نجات و فلاح انہی کی پیروی میں منحصر ہے۔

فائدہ: سُنّت اور بدعت کے پیش نظر بغرض اختصار بعض نے خیر القرون کا مفہوم یہ بیان کیا کہ آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے کوئی عقیدہ اور عمل ثابت نہ ہو۔ بعض نے شیخینؓ اور خلفائے راشدینؓ کے خلاف کو خیر القرون کے خلاف کہا۔ بعض نے عام صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی خلاف ورزی کو خیر القرون کے منافی کہا۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ خیر القرون کا مفہوم ہی بس اتنا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق انہوں نے اہم اور عمدہ کڑی کو بیان کر دیا ہے، اور دوسروں کو بالتّبع سمجھ کر بیان نہیں کیا۔ اور جنہوں نے خیر القرون کی پوری تشریح بیان کی اور بدعت کی جامع و مانع تعریف اور حد سامنے رکھی ہے، تو اُنہوں نے خیر القرون کی تعریف حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعینؒ سے کی اور ان کے خلاف عقیدہ اور عمل کو بدعت کہا ہے، اور اکثر و بیشتر خود ان حضرات کی اپنی عبارات (جب وہ اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تو) اس کی تشریح کرتی ہیں۔ وصاحب البیت ادریٰ بما فیہ۔

اس قاعدہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی عبد السمیع صاحب نے انوارِ ساطعہ میں اور مفتی احمد یار خان صاحب نے جاء الحق میں اور اسی طرح دیگر بدعت پسند حضرات نے اپنی اپنی کتابوں اور رسالوں میں ٹھوکریں کھائی ہیں

اور خواہ مخواہ اپنے ذہن اور عوام کو مشوش کیا ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں یہی عرض ہے کہ ؎

ٹھوکریں مت کھائیے، چلیئے سنبھل کر، دیکھ کر
چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور، دیکھ کر

اسلامی فقہ اور قیاس بھی ایک شرعی دلیل ہے

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ انسانی ضروریات اور انسانی ماحول ایک حالت پر قائم رہنے والی چیز نہیں ہے اور تمدنی ترقیات کے ساتھ ہی ساتھ انسانی ضروریات کا تبدیل ہوتے رہنا ضروری امر ہے۔ لہٰذا آپ نے بہت سی فرعی باتوں سے متعلق خود احکام صادر فرمانے مناسب نہیں سمجھے، اور ان باتوں کا اُن لوگوں کے فہم و فراست پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور جنابِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغمبر مانتے اور کتاب و سُنّت کے اُصولی احکام کو واجب التعمیل جانتے ہیں۔ کتاب و سنّت کے قوانین کو لازمی اور قابلِ عمل جاننے والوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اجتہاد و تفقّہ سے کام لیں اور کتاب و سنّت کی روشنی میں ضروری اور ہنگامی قانون بنائیں، اسی کو فقہ اور قیاس کہتے ہیں۔ اور مجتہد مصیب بھی ہو سکتا ہے اور مخطی بھی۔ لیکن اگر صاحبِ اجتہاد نے اپنی پوری طاقت اور وسعت صرف کی اور مع ہٰذا اس سے غلطی ہو گئی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ ماجور ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رحمتِ بے پایاں سے ثواب کا مستحق ہوگا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا حکم الحاکم فاجتهد واصاب فله اجران واذا حکم فاجتهد واخطأ فله اجر واحد (بخاری ج ۲ ص ۱۰۹۲، ومسلم ج ۲ ص ۷۶ ومشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۴)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ جب کوئی فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرے اور اجتہاد کرتے ہوئے درست فیصلہ کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا، اور اگر اس سے خطا سرزد ہو تو اس کو ایک ہی اجر ملے گا۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت اور مشقّت کو ہرگز رائیگاں نہیں کرتا، تو اجتہاد کرتے وقت جو تکلیف اور

کاوشِ مجتہد کو ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر اس کو ضرور ایک اجر مرحمت فرمائے گا، اور اصابتِ رائے کی صورت میں ایک اجر اجتہاد کا اور ایک اصابتِ رائے کا اس کو حاصل ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجتہد صحیح معنی میں مجتہد ہو، ورنہ القضاۃ ثلاثۃ کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ جاہل آدمی کا فیصلہ اس کو دوزخ میں لے جائے گا (رواہ ابوداؤد، ابن ماجہ، المشکوٰۃ ج ۲ ص۳۲۴) ۔ اس صحیح روایت سے اجتہاد کا درست ہونا اور خطا کی صورت میں مجتہد کا معذور بلکہ ماجور ہونا صراحت سے ثابت ہوا۔ صرف بطورِ تائید و شاہد کے حضرت معاذ بن جبلؓ (المتوفی ۱۸ھ) کی روایت بھی سُن لیجئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو اُس وقت آپ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ:

کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتھد برائی ولا الو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہ وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ بما یرضی به رسول اللہ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی۔ مشکوٰۃ ج ۲ ص۳۲۴)	تُو کس طرح فیصلہ کرے گا جب تیرے سامنے کوئی جھگڑا پیش ہوا؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے موافق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں وہ بات تجھے نہ مل سکے؟ عرض کیا تو پھر سنّتِ رسول اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر سنّتِ رسول اللہ میں بھی نہ ہو؟ تو حضرت معاذ نے عرض کیا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے قاصد کو اُس چیز کی توفیق عطا فرمائی، جس پر اللہ تعالیٰ کا رسول راضی ہے۔

حافظ عماد الدین ابنِ کثیرؒ (المتوفی ۷۷۴ھ) اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

باسناد جیّد کما ھو مقرر فی موضعه۔ (تفسیر ج ۱ ص۳)	اس روایت کی سند عمدہ اور کھری ہے جیسا کہ اپنے موقع پر ثابت ہے۔

اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کے جواب پر کہ اجتھد برائی (کہ میں قیاس اور رائے سے کام لوں گا) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا اور اظہارِ مسرّت کیا، جس سے صاف طور

پہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فروعی قوانین کو منجمد رکھنا پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ ضرورت کے پیشِ نظر ایسے قوانین کو استقرائی رکھنا چاہا ہے تاکہ انسان کے قوائے دماغیہ کی نشو و نما اور انسانی ترقیات میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہوسکے۔ حضرت ابوبکرؓ (المتوفی ۱۳ھ) کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو کتاب اللہ، اور سنّتِ رسول اللہ میں اس کو تلاش کرتے تھے، ورنہ اجتہاد سے کام لیتے تھے۔

ن ابا بکرؓ اذا نزلت به قضية لم يجد
ها فی کتاب الله اصلا ولا فی سنّة اثرًا
فقال اجتهد برائی فان يكن صوابا
فمن الله و ان يكن خطأً فمنی واستغفر
الله۔ (طبقات ابنِ اسعد ج ۳ ص۱۳۶)۔

حضرت ابوبکرؓ کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا، تو
کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ میں، اگر ان کو اس کی
وضاحت نہ ملتی تو فرماتے، میں اپنی رائے سے اجتہاد کرتا
ہوں۔ اگر درست ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوگی۔ ورنہ
میری خطا ہوگی، اور میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی قاضی شریحؒ (المتوفی ۸۵ھ) کو خط لکھا۔ اس میں کتاب وسنّت اور اجماع کے بعد خاص طور پر اجتہاد کرنے کا ذکر ہے۔ (دیکھئے مسند دارمی ص۳۴ ومثلہ فی کنز العمال ج ۳ ص۱۷۴)۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی اجماع کے بعد قیاس اور اجتہاد کرنے کا حکم دیا کرتے تھے (مسند دارمی ص۳۴)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ معمول تھا کہ جب کتاب وسنّت کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے کوئی ثبوت نہ مل سکتا تو قال فيه برأيه (مسند دارمی ص۳۳ ومستدرک ج ۱ ص۱۳۰ و قالا علی شرطهما) اپنی رائے سے کام لیتے تھے۔

الغرض جمہور اہلِ اسلام قیاسِ شرعی کو صحیح اور حجت تسلیم کرتے ہیں چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں:

"جمہور از صحابہؓ وتابعین و فقہاء ومتکلمین بآں رفتہ کہ اصلی از اصولِ شریعت است استدلال میرود بداں بر احکام واردہ بسمع ظاہریہ انکارش کردہ اند" (افادہ الشیوخ ص۱۲۲)

جمہور صحابہؓ وتابعینؒ اور فقہاء ومتکلمین اس کے قائل ہیں کہ قیاس شریعت کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے اس سے احکامِ واردہ بسمع میں باقاعدہ استدلال صحیح ہے اور اہلِ ظاہر نے قیاس کا انکار کیا ہے۔

اہلِ ظاہر کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ غیر نبی کو یہ مقام کیسے حاصل ہوگیا کہ وہ

دین کی باتوں میں دخل دے۔ اعتراض بظاہر بڑا معقول اور وزنی ہے مگر حقیقت سے بالکل دور ہے۔ اسلئے کہ موجب حکم مجتہد اور قائس کا قیاس و اجتہاد نہیں ہے بلکہ موجب اصل میں وہی شرعی دلیل ہے جو قرآن کریم اور حدیث وغیرہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ مجتہد کا کام صرف اتنا ہے کہ مسکوت عنہ جزئی کی کڑی دلیل شرعی سے جوڑ دیتا ہے اور بس چنانچہ مشہور فیلسوف اسلام علامہ ابن رشد ابوالولید محمد بن احمدؒ (المتوفی ۵۹۵ھ) لکھتے ہیں:

واما القیاس الشرعی فھو الحاق الحکم الواجب لشیء ما بالشرع بالشیء الذی اوجب الشرع له ذٰلك الحکم او لعلة جامعة بینھما۔ (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۳)۔

کہ قیاس شرعی اس کو کہتے ہیں کہ حکم شریعت میں کسی چیز کے لئے ثابت ہو چکا ہے اس حکم کو اُس چیز کے اوپر بھی چسپاں کیا جائے جو مسکوت عنہ ہے۔ یا تو اسلئے کہ یہ اُس کے مشابہ ہے اور یا اسلئے کہ ان دونوں میں علت جامعہ مشترک ہے۔

نواب صاحبؒ اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں۔ "واما قیاس پس در اصطلاح فقہاء حمل معلوم بر معلوم است در اثبات حکم یا نفی او بامر جامع میان ہر دو از حکم یا صفت و اختارہ جمہور المحققین"۔ (افادۃ الشیوخ ص ۱۳۱)

مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑیؒ لکھتے ہیں:

"جب انسان کو کوئی مسئلہ قرآن وحدیث سے صراحۃً نہیں ملتا، تو وہ قرآن وحدیث میں اجتہاد و استنباط کرتا ہے اور وہ اجتہاد و استنباط قرآن وحدیث سے الگ نہیں کہلاتا۔ اسی طرح صحابی کے اس قول کو جو اجتہاد و استنباط کی قسم سے ہو، اس کو قرآن وحدیث سے الگ نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ قرآن وحدیث میں داخل سمجھنا چاہیئے"۔ (بلفظہٖ ضمیمہ رسالہ اہل حدیث ص ۷)۔

نیز لکھتے ہیں —— "رہا یہ شبہ کہ (بر صورت تسلیم قول صحابی) قرآن وحدیث کے سوا تیسری شئے کس طرح حجت ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ تیسری شئے ہے ہی نہیں، جیسا کہ ہمارا اجتہاد تیسری شئے نہیں (ص ۷) بلکہ جو حضرات اقوال صحابہؓ اور اجتہاد کو حجت نہیں تسلیم کرتے اور ان کی تقلید سے گریز کرتے ہیں، ان کی ان الفاظ سے شکایت کرتے ہیں کہ —— آج کل کے بعض اہل حدیث اصل روش اہل حدیث سے کتنے دور ہیں، اللہ ان کو قریب کرے، آمین ثم آمین"۔ (ص ۷)۔

مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:

"باقی رہا وہ شخص جو ابھی اس مرتبہ (اجتہاد) تک نہیں پہنچا تو اس کے لئے سلامتی اسی میں ہے، کہ وہ ائمۂ فن کی تحقیقات اور ان کی آراء کا اتباع کرے۔ تمام دنیوی علوم کی طرح مذہبی علوم میں بھی یہی طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ اجتہاد بِلا علم کا عَلَم بلند کرتے ہیں وہ دنیا اور دین دونوں میں اپنے لئے رسوائی کا سامان کرتے ہیں"۔ (تفہیمات ص۲۸٦)۔

کاش مودودی صاحب خود بھی اس بہترین اور زرّین نصیحت پر عمل کرتے، اور بِلا رسوخِ علم کے خام اجتہاد کا چور دروازہ نہ کھولتے، جس کی بدولت وہ خود بھی اس رُسوائی سے بچتے اور لوگوں کو بھی گمراہی سے بچاتے۔

عباد اور زہاد کا قیاس | یہ بات طے شدہ ہے کہ اجتہاد کے لئے چند نہایت ضروری شرطیں ہیں جن میں وہ نہ پائی جا سکیں، اُن کی بات ہرگز حجّت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح محض صوفیوں کی باتیں بھی شرعًا کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، اِلّا یہ کہ وہ شریعت کے موافق ہوں۔ چنانچہ علامہ قاضی ابراہیم الحنفیؒ (المتوفّی فی حدود ۱۰۰۰ھ) لکھتے ہیں:

"اور جو عابد و زاہد اہلِ اجتہاد نہیں، وہ عوام میں داخل ہیں، ان کی بات کا کچھ اعتبار نہیں ہاں اگر ان کی بات اُصول اور معتبر کتابوں کے مطابق ہو تو پھر اس وقت معتبر ہوگی (نفائس الاظہار ترجمہ مجالس الابرار ص۱۲۷)

مجالس الابرار ومسالک الاخیار علامہ مُلّا احمد بن عبدالقاہر الرومیؒ (المتوفی ۱۰۴۱ھ) کی کتاب ہے مصابیح کی سَو ۱۰۰ منتخب احادیث کی شرح اس میں کی گئی ہے ہر حدیث اور اسکی شرح کو مجلس کا عنوان دیا گیا ہے جو کل سَو ۱۰۰ مجلسیں ہیں (کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ص۱۵۹۱ ج۲ للعلامۃ مُلّا کاتب چلپیؒ المتوفی ۱۰٦۷ھ طبع نور محمد کراچی)

مجالس الابرار کی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلویؒ نے بھی بڑی تعریف کی ہے فرماتے ہیں کہ "کتاب معتبر است" (فتاوٰی عزیزی ص۱۱۵ ج۲)

حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ:

عملِ صوفیہ در حل و حرمت سند نیست ہمیں بس است کہ ما ایشاں را معذور داریم و ملامت نہ کنیم و امر ایشاں را بحق سبحانہٗ وتعالےٰ مفوّض داریم

حضرات صوفیاء کی بات حل و حرمت میں سند نہیں ہے۔ یہی کافی ہے کہ ہم ان کو ملامت نہ کریں اور ان کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ اس جگہ حضرت امام

اینجا قول امام ابوحنیفہؒ و امام ابویوسفؒ و امام محمدؒ معتبر است نہ عمل ابوبکر شبلیؒ و ابوالحسن نوریؒ (مکتوبات دفتر اوّل ص۳۳۵، مکتوب ۲۶۶)

ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول معتبر ہوگا نہ کہ ابوبکر شبلیؒ اور ابوالحسن نوریؒ جیسے صوفیاء کرامؒ کا عمل۔

قیاس بدعت نہیں ہے | پہلے باحوالہ یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ قیاس واجتہاد قرآن وحدیث سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس میں غیر منصوص کی کڑی کو منصوص سے ملا دیا جاتا ہے، اور یہ ایک شرعی حجّت ہے۔ قیاس واجتہاد سے نہ تو دین میں خلل واقع ہوتا ہے اور نہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر بدعت کا اطلاق ہرگز درست نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابواسحاق شاطبیؒ (المتوفی سنہ ۷۹۰ھ) لکھتے ہیں:

وليس من شأن العلماء اطلاق لفظ البدعة على الفروع المستنبطة التي لم تكن في ماسلف وان دقت مسائلها فكذلك لا يطلق على دقائق الاخلاق الظاهرة والباطنة انها بدعة لان الجميع يرجع الى اصول الشريعة (الاعتصام ج ۱ ص۲۷۵)

کہ علماء کی شان سے بعید ہے کہ وہ اُن فروعِ مستنبطہ پر بدعت کا اطلاق کریں جو ماضی زمانہ میں نہ تھے۔ اگرچہ ان کے مسائل بڑے دقیق ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح اخلاقِ ظاہرہ اور باطنہ کے دقائق پر بھی لفظ بدعت کا اطلاق صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ سب کے سب اصولِ شریعت کی طرف راجع ہیں۔

اور دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ یعنی

واما الكلام في دقائق التصوف فليس ببدعة۔ (ج ۱ ص۲۷۴)۔

تصوف کے دقائق اور اسرار میں کلام کرنا اور اُن کا اثبات کرنا بھی بدعت نہیں۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ معتبر بزرگانِ دین نے تصفیۂ قلوب کے لئے جو اعمال واشغال بتائے ہیں وہ بدعت نہیں ہیں کیونکہ یہ سب اُمور اصولِ شریعت سے ثابت ہیں بخلاف بدعات کے کہ ان کا ثبوت اصولِ شریعت سے ہرگز نہیں ہے بلکہ ان میں مبتدعین کی اپنی آراء اور خواہشات کارفرما ہیں ذٰلك قولهم بافواههم۔

صد حیرت ہے مولوی عبدالسمیع صاحب پر کہ وہ لکھتے ہیں "تعجب ہے کہ جو لوگ اعمال واشغالِ مشائخ صوفیہ عمل میں لائیں اور تقلیدِ شخصی کو واجب اور حق کو منحصر چار امام میں جانیں اور اجماعِ اُمّت کو درست جانیں اور پھر یہ بات زبان پر لائیں کہ بعد قرونِ ثلاثہ کے جو کچھ حادث ہوگا وہ بدعت ضلالت اور فی النار ہوگا۔"

(انوارِ ساطعہ ص۲۴۲) ۔ مگر خیر سے خیر القرون کا مفہوم خود ہی نہیں سمجھے ۔ بحث گذر چکی ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں ۔ نہ معلوم وہ کونسا محقّق عالم ہے جس نے یہ کہا ہو کہ حق صرف ائمہ اربعہ میں منحصر ہے اور جو ان کی تقلید نہیں کرتا وہ قطعاً اور یقیناً باطل پر ہے سینکڑوں امام ان کے علاوہ بھی گذرے ہیں، اور لوگ ان کی بھی تقلید کرتے رہے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ حسبِ تحقیق حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ہندوستان وغیرہ کے مزاج کے مطابق حضرت امام ابو حنیفہؒ کی فقہ قریب تر ہے اور ان پر ان کی تقلید واجب ہے اور مجموعی لحاظ سے اب ائمہ اربعہؒ کی تقلید نہایت ضروری ہے ۔ جیسا کہ علامہ ابنِ خلدونؒ (دیکھئے مقدمہ ص۴۴۸) وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے، مگر تقلید کے انحصار سے حق کا انحصار ان میں کیسے اور کس طرح لازم آیا ؟

اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "تصوّف کے اشغال صوفیاء کی ایجاد ہے اور ہر زمانہ میں نئے نئے ہوتے رہتے ہیں اور جائز ہیں، بلکہ راہِ سلوک ان ہی سے طے ہوتی ہے ۔ کہئے اب وہ قاعدہ کہاں گیا کہ ہر نئی چیز حرام ہے"۔ (جاء الحق وزہق الباطل ص۲۱۴) ۔

قاعدہ تو اپنی جگہ پر ہے مگر مفتی صاحب کی اپنی سمجھ کا قصور ہے ۔ اس لئے کہ ابھی الاعتصام کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ تصوّف کی باریکیوں اور ان کے اسرار کو بدعت نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ سب اصولِ شریعت کی طرف راجع ہیں اور ان میں محض حضرات صوفیاء کرامؒ کی آراء اور قیاسات ہی کا دخل نہیں، تاکہ ان کی بات قابلِ التفات نہ ہو اور ہم ان کو معذور تصوّر کریں بلکہ یہ سب اُصولِ شریعت کی طرف راجع ہیں ۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ صوفی ظاہری علوم سے بہرہ ور ہو، کتاب و سنّت کا عالم ہو، اخلاص اور للّٰہیت میں نمایاں اور اتّباعِ سُنّت کا شیدائی ہو ۔ ہر صوفی، صوفی کہلانے کا مستحق نہیں ہے ؎

نہ ہر کہ موئے بر افروخت دلبری داند

بات دُور جا پڑی ۔ بات یہ عرض کی جا رہی تھی کہ قیاس بدعت نہیں ہے، اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں :

و اما القیاس والاجتہاد فلیس من البدعۃ فی شیءٍ فانہ مظہر لمعنی النصوص لامثبت	بہر حال قیاس و اجتہاد، تو اس کا بدعت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کیونکہ قیاس نصوص کے معانی کو ظاہر کرنے والا

امر زائد۔ (مکتوبات حصہ سوم ص۶۷) ہے، کسی زائد چیز کا اثبات نہیں کرتا۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

"علماء مجتہدین اظہار احکام دین فرمودہ اند نہ احداث مالیس منہ، پس احکام اجتہادیہ از امور محدثہ نباشند بلکہ از اصول دین بوند"۔ (مکتوبات حصہ چہارم ص۹۴، مکتوب ۲۹۰)۔

الحاصل ان سابقہ ابحاث کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات آفتابِ نیمروز کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ دلائل اور براہین کی اصولی چار قسمیں ہیں: کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ اور یہ امر بھی ثابت ہو چکا ہے کہ قیاس بھی شرعی حجت ہے، بدعت نہیں ہے۔ جب قیاس اور اجتہاد صحیح ہے تو پھر کسی مجتہد کی تقلید کرنا کیسے بدعت ہوگا؟ اب ہمیں اپنے ہر قول و فعل کو ان دلائل کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ جو ان کے موافق ہو، وہ حق ہے اور اسی میں نجات و فلاح ہے۔ اور جو ان سے ٹکرائے، یا اس کا ثبوت ان سے نہ ہو سکے تو وہ باطل اور مردود ہوگا، اور بقول علامہ اقبالؒ (المتوفی ۱۳۵۷ھ) اسے ؏

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

قیاس کے متعلق ایک نفیس اور عمدہ بحث یہ بالکل ٹھیک ہے کہ دین کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ہو چکی تھی۔ مگر تکمیلِ دین کا یہ مطلب ہے کہ قواعد و ضوابط اور کلیاتِ دین پورے طور پر مکمل ہو چکے تھے۔ بعد کو پیش آنے والے واقعات اور حوادث کو ان اصول اور کلیات کے تحت درج کرنا اور انہی جزئیات کو کلیات پر منطبق کرنے کا نام قیاس و اجتہاد ہے، لیکن بسا اوقات جزئیات کا کلیات میں داخل کرنا کسی خاص عارضہ کی وجہ سے بعض لوگوں پر مخفی رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فروعی مسائل میں فقہاء اسلام کا اختلاف رہا ہے، اور ایسے مواقع پر جو چیز اقرب الی الحق ہو، اس کو قبول کر لینا اور اس پر عمل کرنا نجات کے لئے کافی ہے۔ ہاں اگر قرآن اور حدیث سے کوئی نص مل جائے، یا اجماع پر اطلاع ہو جائے تو اس صورت میں قیاس سے رجوع کرنے میں ہرگز تامل نہیں ہونا چاہیئے، اور یہی کچھ ائمہ دین نے فرمایا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ راقم الحروف کی کتاب الکلام المفید فی اثبات التقلید کا مطالعہ کافی ہوگا۔

جن مسائل اور امور میں حضرات فقہاء کرامؒ نے اجتہاد و قیاس کیا ہے، ان کے اصول و ضوابط اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے زمانہ میں موجود تھے مگر ان کے دواعی و اسباب و محرکات اُس وقت رونما نہ ہوئے تھے۔ جب ان مسائل کے اسباب و محرکات مجتہدین کے زمانہ میں پیدا ہوئے تو ان کو قیاس و اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد سے ان کی کڑی نصوصِ شرعیہ سے جوڑ دی اور جزئیات کو کلیات میں داخل کر دیا بخلاف ان جملہ بدعات کے جن پر آج شدّت کے ساتھ بدعت پسند حضرات عامل ہیں (حتیٰ کہ انہوں نے اپنے عمل اور اصرار سے ان کو شعارِ دین بنا رکھا ہے، اور ان بدعات میں شریک نہ ہونے والوں کو وہابی اور خدا معلوم کیا کیا خطابات مرحمت فرماتے ہیں) کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک بدعت کا سبب اور محرک خیر القرون میں موجود تھا، مگر ان خود ساختہ بدعات کا اس وقت ہرگز وجود اور رواج نہ تھا۔ لہٰذا ان بدعات کو قیاس و اجتہاد کی مد میں شامل کرنا سراسر بے دینی اور نری جہالت ہے۔ مثلاً میلاد کے منانے کا سبب، (یعنی آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی ولادت باسعادت) اُس وقت موجود تھا۔ چالیس سال قبل از نبوّت اور تیئیس ۲۳ سال بعد از نبوّت آپ نے ولادت کے بعد اپنی قوم اور حضرات صحابہ کرامؓ میں گذارے، تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ وغیرہم میں آپ کا گہرا عشق اور محبّت بھی تھی لیکن کسی نے آپ کا یومِ ولادت نہ منایا جیسے آج منایا جاتا ہے، اور نہ عُرفی میلاد کا ان میں کوئی ثبوت تھا جب سبب اور محرک موجود تھا اور یہ بدعت موجود نہ تھی، تو بعد کو اس میں قیاس کرنے کی ہرگز نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش اسی طرح آپ کی دو ازواج مطہّرات حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب ام المساکینؓ اور آپ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ اور آپ کی تین صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت زینبؓ اور جملہ صاحبزادے آپ کی زندگی میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے، مگر نہ تو آپ نے ان کا تیجہ کیا اور نہ ساتواں اور نہ دسواں اور نہ چالیسواں۔ نہ ان کی قبروں پر میلا لگایا اور نہ عرس کیا، نہ چراغ جلائے، اور نہ اُوپر چادریں ڈالیں، نہ پھول چڑھائے اور نہ گنبد بنوائے۔ بلکہ ان میں بیشتر اشیاء کے متعلق صریح نہی بلکہ لعنت فرمائی۔ (مثلاً قبروں پر چراغ روشن کرنا وغیرہ) پھر نص کے مقابلہ میں قیاس کا کیا مطلب ہے؟ اور آپ کی وفات

کے بعد باوجود کمالِ عشق و محبت کے حضرات صحابہ کرامؓ نے ان میں سے کوئی کام نہ کیا، اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ کی وفات کے بعد تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے ایسا کیا۔ یہ سب کے سب اسباب اور دواعی موجود تھے اور کوئی مانع بھی نہ تھا جو بعد کو زائل ہو گیا ہو۔ لیکن ان خود تراشیدہ بدعات کا مطلقاً وجود نہ تھا وعلیٰ ہذا القیاس۔ ایصالِ ثواب کیا جاتا تھا مگر نہ تو دنوں کی تعیین ہوتی تھی اور نہ کھانا سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھا جاتا تھا۔ (تبرک کے لئے کھانے پر کچھ پڑھنا محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے) ختنے ہوتے تھے مگر آج کل کی بدعات اور رسوم نہ ہوتی تھیں۔ شادیاں ہوتی تھیں مگر نہ تو سہرے باندھے جاتے تھے اور نہ پیسے وغیرہ پھینکے جاتے تھے۔ اسی طرح دیگر خرافات کا وجود اُس وقت نہ تھا۔ جنازے ہوتے تھے مگر جنازہ کے ساتھ جہر سے نہ تو کلمہ پڑھا جاتا تھا اور نہ کل حیّ یموت کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ نماز جنازہ تو پڑھی جاتی تھی مگر نماز سے فارغ ہونے کے بعد مل کر دعا نہ مانگی جاتی تھی۔ دفن کرنے کے بعد تلقین تو ہوتی تھی مگر قبر پر اذان نہیں دی جاتی تھی۔ مُردوں کو کفن تو وہ پہناتے تھے مگر الفی اور کفنی لکھنے کا دستور نہ تھا۔ ذکر بھی کیا کرتے تھے اور درود شریف بھی پڑھتے تھے مگر مل کر اجتماعی صورت میں جہر سے ذکر کرنے اور درود شریف بآوازِ بلند پڑھنے کا اُن میں ہرگز رواج نہ تھا۔ الغرض آج جتنی بدعات رائج ہیں، ان میں سے ایک ایک کا سبب خیر القرون میں موجود تھا مگر یہ بدعات نہ ہوتی تھیں، تو پھر ان میں قیاس و اجتہاد کا کیا مطلب ہے؟ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان امور میں اگر قیاس و اجتہاد کی ضرورت اور گنجائش ہوتی، تو حضرات ائمہ مجتہدینؒ اس سے ہرگز نہ چوکتے۔ یہ بالکل سمجھ سے بالاتر ہے کہ اُس وقت یہ قیاس و اجتہاد اُن کو نہ سوجھا اور آج یہ قیاس جائز ہو گیا۔ عشق و محبت اُن میں زیادہ تھی، علم و تقویٰ ان میں زیادہ تھا، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت ان میں کامل اور مکمّل تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُس وقت ان اُمور کو دین بننا نصیب نہ ہوا اور آج بیک انقلاب یہ دین اور شعارِ دین اور علاماتِ اہل السنّت بن گئے۔ للہ کچھ تو فرمائیے! ؎

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی، کدورتوں کی کچھ انتہا بھی؟
زبان رکھتے ہیں ہم بھی آخر، کبھی تو پوچھو سوال کیا ہے؟

یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد تمام خود ساختہ بدعات کی کھوکھلی عمارت خود بخود پیوندِ زمین ہو جاتی ہے۔ ایسے امور میں جن کے تمام اسباب و دواعی اور محرکات اُس وقت موجود

تھے، نہ قیاس ہو سکتا ہے اور نہ یہ بدعتِ حسنہ کا درجہ پا سکتے ہیں۔ یہ امور قطعی طور پر بدعتِ قبیحہ اور سیئہ کی مد میں داخل ہیں، اس میں ایک رتّی برابر بھی شک نہیں ہے۔ چنانچہ علّامہ قاضی ابراہیم الحنفیؒ تحریر فرماتے ہیں:

”اور اگر آپ کے زمانہ میں سبب موجود ہو لیکن کسی عارضی وجہ سے متروک ہو اور حضورؐ کی وفات کے بعد وہ مانع جاتا رہا ہو تو ایسے امر کا احداث بھی جائز ہے جیسے قرآن کا جمع کرنا۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی حیات میں یہ مانع تھا کہ وحی برابر آتی رہتی تھی، اللہ تعالےٰ جو چاہتا تھا بدل دیتا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد وہ مانع جاتا رہا اور جس فعل کا سبب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہو اور کوئی مانع بھی نہ ہو اور باوجود اس کے حضورؐ نے نہ کیا ہو، تو ایسا کام کرنا اللہ تعالےٰ کے دین کو بدلنا ہے؟ کیونکہ اگر اس کام میں کوئی مصلحت ہوتی، تو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اس فعل کو خود ضرور کرتے یا ترغیب فرماتے اور جب آپ نے نہ خود کیا نہ کسی کو ترغیب دی، تو معلوم ہوا کہ اس میں کوئی بھلائی نہیں، بلکہ وہ بدعتِ قبیحہ سیئہ ہے۔“ (نفائس الاظہار ترجمہ مجالس الابرار ص۱۲۷)۔

یہ عبارت اس پر واضح حجّت ہے کہ محرک اور سبب کے ہوتے ہوئے جبکہ کوئی مانع بھی موجود نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اگر کسی کام کو نہیں کیا اور کرنے کی ترغیب بھی نہیں دی تو وہ کام بدعتِ قبیحہ اور بدعتِ سیئہ ہوگی۔ اگرچہ وہ بظاہر عبادت ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ:

اتبعوا اٰثارنا ولا تبتدعوا فقد کفیتم۔ (الاعتصام ج ۱ ص۵۴)

تم ہمارے نقشِ قدم پر چلو، اور نئی نئی بدعات مت ایجاد کرو کیونکہ تم کفایت کئے گئے ہو۔

اور حضرت حذیفہؓ (المتوفی ۳۶ھ) نے ارشاد فرمایا کہ:

کل عبادۃ لم یتعبدھا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا تعبدوھا (الاعتصام ج ۱ ص۱۱۳)

ہر وہ عبادت جس کو حضرات صحابہ کرامؓ نے نہیں کیا سو تم بھی اس کو مت کرو۔

اور حافظ ابنِ کثیرؒ نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ:

واما اھل السنّۃ والجماعۃ فیقولون فی کل فعل وقول لم یثبت عن الصحابۃ

اہل سنّت والجماعت یہ فرماتے ہیں کہ جو قول اور فعل جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات

رضی اللہ تعالیٰ عنہم ھو بدعۃ لانہ لوکان خیراً لسبقونا الیہ انھم لم یترکوا خصلۃ من خصال الخیر الا وقد بادروا الیھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۵۶)

صحابہ کرامؓ سے ثابت نہ ہو تو اس کا کرنا بدعت ہے کیونکہ اگر وہ کام اچھا ہوتا تو ضرور حضرات صحابہ کرامؓ ہم سے پہلے اس کام کو کرتے۔ اس لئے کہ انہوں نے نیکی کے کسی پہلو اور کسی نیک اور عمدہ خصلت کو تشنۂ عمل نہیں چھوڑا بلکہ وہ ہر کام میں گوئے سبقت لے گئے ہیں۔

الحاصل مجتہد کا قیاس و اجتہاد تو حق اور صحیح ہے، مگر صرف ان اُمور اور مسائل میں جن کے دواعی و اسباب اور محرّکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ظہور پذیر ہوئے اور ایسے امور میں ہرگز ہرگز قیاس و اجتہاد جائز نہیں ہے جن کے دواعی و اسباب اور محرّکات آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کے وقت موجود تھے، اور آج کل عموماً جتنی بھی بدعات رائج ہیں وہ بیشتر وہی ہیں جن کے اسباب اور محرکات اُس وقت موجود تھے، ایسے اُمور میں فلاح و نجات صرف اُن حضرات کے نقشِ قدم پر چلنے سے ہی نصیب ہوگی اور اُن کی مخالفت کرنے پر اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوگا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی ہرگز راضی نہ ہوں گے اور صرف اسی پہلو میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم کا صحیح عشق منحصر ہے اور اس کے خلاف گمراہی بھی ہے اور بدعت بھی، اُخروی تباہی بھی ہے اور بربادی بھی۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ ؎

الٰہی خیر ہو کہ فتنۂ آخر زماں آیا
لٹے ہے ایمان و دیں باقی کہ وقتِ امتحاں آیا

باب دوم

بدعتِ لغوی اور شرعی کی تعریف، اس کی اقسام اور اس کے احکام کے بیان میں

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شرک کے بعد جس طرح بدعت اور اہلِ بدعت کی تردید فرمائی ہے شاید ہی کسی اور چیز کی ایسی تردید فرمائی ہو، اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ بدعت سے دین کا اصلی حلیہ اور صحیح نقشہ بدل جاتا ہے، اور اصل و نقل اور حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی اور قرآن کریم نے صراحت سے اس امر کو بیان کیا ہے کہ دین کے مٹ جانے کے اصولی دو طریقے ہیں۔ کِتمانِ[۱] حق اور تلبیسِ[۲] حق و باطل۔ اور اسی اختلاط اور تلبیس کی وجہ سے دینِ الٰہی لوگوں کی خواہشات اور اہواء کا ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ جس کا جی چاہا کسی چیز کو اپنی مرضی سے دین بنا دیا، اور جس کی خواہش ہوئی کسی چیز کو دین سے خارج کر دیا۔ خدا تعالیٰ کا دین نہ ہوا، بچوں کا کھیل ہوا (معاذ اللہ تعالیٰ)۔ یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ کسی امر کے باعثِ ثواب اور موجبِ عذاب ہونے کا فیصلہ صرف باری تعالیٰ کا کام ہے اور اس کو لوگوں تک پہنچانا اور بیان کرنا نبی اور رسول کا کام ہے، اپنی مرضی اور خواہش سے کسی چیز کا کارِ ثواب اور کارِ عقاب کہنے والا گویا در اصل اپنے لئے منصبِ الوہیت اور رسالت تجویز کرتا ہے (عیاذاً باللہ تعالیٰ)۔ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کامل اور مکمل نمونہ بنا کر ہمیں ہر کام میں (جو آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہ ہو) آپ کی اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا ہے، اور ہمیں اپنی مرضی پر ہرگز نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ

البتہ تمہارے لئے بھلی ہے چال اور نمونہ رسول اللہ، اس کے لئے، جو کوئی امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی اور

اللّٰهَ کَثِیْرًا ○ (پ۲۱، احزاب، رکوع ۲)۔ آخرت کے دن کی۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بہترین اور اعلیٰ نمونہ قرار دے کر ہم سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم ہر معاملہ میں اور ہر ایک حرکت و سکون میں اور ہر نشست و برخاست میں اور ہر قسم کی غمی اور خوشی کے معاملات میں آپ کے نقشِ قدم پر چلیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے کہ :

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط (پ۳، آل عمران، رکوع ۴)

اے محمدؐ! آپ اعلان کر دیں کہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ تعالیٰ سے تو میری اتباع اور پیروی کرو، تاکہ محبت کرے تم سے اللہ تعالیٰ اور بخشے گناہ تمہارے۔

یہ آیت کریمہ اس امر کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ اگر آج کسی جماعت یا شخص کو اپنے مالکِ حقیقی کی محبّت کا دعویٰ ہے تو لازم ہے کہ اس کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی اتّباع کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لینا چاہیئے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا۔

آپ کے اس بہترین اسوہ اور ہدیٰ و سیرت کی اتّباع کا نام سُنّت، اور خلاف ورزی کا نام بدعت ہے۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ (المتوفّٰی ۷۸ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم جمعہ کے خطبہ میں جبکہ ہزاروں کا مجمع سامنے ہوتا تھا، پُرزور اور بلند آواز سے یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ :

امّا بعد فانّ خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الھدی ھدی محمّد صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم وشرّ الامور محدثاتھا وکلّ بدعۃ ضلالۃ۔ (مسلم ج ۱ ص۲۸۵ و مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۷)

امّا بعد! بہترین بیان اللہ تعالےٰ کی کتاب ہے اور بہترین نمونہ اور سیرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی سیرت ہے، اور وُہ کام بُرے ہیں جو نئے نئے گھڑے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی ہدیٰ اور سیرت کا بدعت سے تقابل کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کی سیرت اور نمونہ کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا وہ سب بدعت ہوگا اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر بدعت بُری نہیں تاکہ دنیاوی ایجادات بھی مذموم

ہو جائیں، بلکہ وہ بدعت بُری ہے جو کتاب اللہ اور ہدیِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے خلاف ہو۔ لہٰذا جو چیز کتاب و سنّت کی روش کے خلاف نہ ہوگی وہ بدعت اور گمراہی نہ ہوگی، اور گمراہی سے خدا تعالیٰ کبھی راضی نہیں ہوتا۔ بلکہ بُرائی کو مٹانے کے لئے اس نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث کیا اور ان پر کتابیں اور وحی نازل کی۔ امام نسائیؒ (المتوفی ۳۰۳ھ) کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں :

وکل ضلالۃ فی النار (نسائی ج ۱ ص۱۷۹) اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اہلِ بدعت کو تمام کائنات کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے، اور ان کی تعظیم و توقیر کرنے سے منع کیا ہے، اور ان کی تمام عبادات کو بے کار فرمایا ہے۔ تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت سے باز نہ آجائیں۔ اور نیز فرمایا کہ اہلِ بدعت کو توبہ تک نصیب نہیں ہوتی۔ اعاذنا اللہ منھا و من سائر انواع المعاصی۔

چنانچہ حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں :

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم المدینۃ حرام ما بین عیر الی ثور فمن احدث فیھا حدثا او اویٰ محدثا فعلیہ لعنۃ اللہ والملئکۃ والنّاس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل (مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۳۸ و بخاری ج ۲ ص۱۰۸۴ و مسلم ج ۱ ص۴۴۲)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ منورہ مقام عَیر سے لے کر مقامِ ثور تک حرم ہے سو جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو، نہ تو اس کی فرضی عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفلی۔

اس حدیث میں حدودِ حرم کی قید محض تقبیح اور تشنیع کے لئے ہے۔ یہ قید احترازی نہیں ہے کہ حرمِ مدینہ میں تو بدعت بُری ہو اور خارج از حرم وہ بُری نہ ہو۔ جو چیز بدعت اور بُری ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت بدعت اور بُری ہی ہوگی۔ ہاں البتہ شرفِ مکان یا فضیلتِ زمان کی وجہ سے اس کی بُرائی اور قباحت اور بڑھ جائے گی بدعت اور بدعتی کی تردید اور مذمّت کے لئے اس سے بڑھ کر اور سخت الفاظ کیا ہوسکتے ہیں جو جناب رؤف رحیم اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی زبانِ پاک سے نکلے ہیں۔ بدعت کی تردید کے لئے یہ روایتیں بالکل کافی ہیں۔ صرف بطور شاہد اور اعتبار کے چند روایتیں اور بھی ملاحظہ کرلیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی اللہ ان یقبل عمل صاحب بدعۃ حتّٰی یدع بدعتہ۔ (ابنِ ماجہ ص۶)

کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت کو ترک نہ کر دے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

من احدث فیھا حدثا او اٰوٰی محدثا فعلیہ لعنۃ اللّٰہِ والملٰٓئکۃ والنّاسِ اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل۔ (بخاری ص۲۵۱ ج۱)

کہ جس کسی نے مدینہ طیبہ میں بدعت گھڑی یا کسی بدعتی کو ٹھکانا دیا تو اس پر اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں اور انسانوں کی لعنت ہو نہ تو اسکی نفلی عبادت قبول ہوگی اور نہ فرضی، بدعت جہاں بھی ہو بدعت ہی ہے ہاں مدینہ طیبہ میں اسکے گناہ کا وزن زیادہ ہوگا کیونکہ وہ منبع رشد و ہدایت ہے۔

حضرت ابراہیمؒ بن میسرہؒ (المتوفّٰی ۱۳۲ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم من وقّر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ھدم الاسلام۔ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان مرسلًا۔ مشکوٰۃ ج ۱ ص۳۱)

کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی بدعتی کی تعظیم و توقیر کی، تو اس نے اسلام کو گرانے پر اس کی مدد اور اعانت کی۔

یہی وجہ تھی کہ حضرات صحابہ کرامؓ کو بدعت اور اہلِ بدعت سے انتہائی نفرت تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ (المتوفّٰی ۷۴ھ) کے پاس ایک شخص کسی کا سلام لایا تو حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا:

بلغنی انہ قد احدث فان کان قد احدث فلا تقرئہ منی السلام۔ (ترمذی ج ۲ ص۳۸، دارمی ص۵۹، ابوداؤد ج۲ ص۲۷۸، ابنِ ماجہ ص۳۴۲، مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۳)

کہ مجھے سلام بھیجنے والے کی یہ شکایت پہنچی ہے کہ اس نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے۔ اگر واقعی اس نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے تو میرا سلام اس کو نہ دینا۔

حضرت ابنِ مسعودؓ فرماتے ہیں کہ:

الاقتصاد فی السنّۃ احسن من الاجتھاد

سنّت میں میانہ روی اختیار کرنا بدعت میں کوشش

فی البدعۃ۔ (مستدرک ج ا ص۱۰۳ علی شرطہما)۔ — کرنے سے بہتر ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک (المتوفی ۹۳ھ) روایت کرتے ہیں کہ:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ حجب التوبۃ عن کل صاحب بدعۃٍ۔ — آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے (اعاذنا اللہ منہا)۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ رجال الصحیح غیر ہارون بن موسیٰ الفروی وھو ثقۃ۔ مجمع الزوائد ج۱۰ ص۱۸۹)

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ بدعت[1] ایسی قبیح، بُری اور منحوس چیز ہے کہ انسان کے دل میں فطری طور پر جو نورانیت اور صلاحیت ہوتی ہے، بدعت اس کو بھی ختم کر دیتی ہے اور اس کی نحوست کا یہ اثر ہوتا ہے کہ توبہ کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ اور عقلی طور پر بھی یہ بات بالکل درست ہے اس لئے کہ جب بدعتی بدعت کو کارِ ثواب سمجھ کر کرتا ہے تو اس سے وہ توبہ کیوں کرے گا؟ توبہ تو گناہوں اور جرائم پر کی جاتی ہے نہ کہ نیکیوں پر۔ کوئی مسلمان نماز پڑھ کر اور روزہ رکھ کر یہ نہیں کہتا۔ اے اللہ! میری نماز اور روزہ سے توبہ۔ بدعتی نے توبہ کا دروازہ اپنے اوپر اسی وقت بند کرا دیا ہے جس وقت کہ اُس نے بدعت کو کارِ ثواب سمجھا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو ردّ۔ — جس کسی نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردود ہوگی۔

(بخاری ج ا ص۳۷۱ واللفظ لہ، مسلم ج ۲ ص۷۷، ابوداؤد ج ۲ ص۲۷۹، ابن ماجہ ص۳، مسند احمد ج ۶ ص۲۷۳ و ج ۱ ص۱۴۶)

نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فی امرنا ھذا کی قدرے تشریح کر دیں تاکہ کسی کوتاہ فہم کو مغالطہ پیش نہ آئے۔ حافظ ابن رجب حنبلیؒ لکھتے ہیں:

کل من احدث فی الدّین مالم یاذن بہ اللہ ورسولہ فلیس من الدّین فی شیءٍ۔ (جامع العلوم والحکم طبع مصر ص۴۲) — جس نے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جس کا اذن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے نہیں دیا، تو اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

علامہ موصوفؒ یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہر احداث مردود نہیں بلکہ جو احداث فی الدین ہو وہ

---

[1] حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ "بدعت از معصیت بالاتر است و کفر از بدعت بالاتر بدعت بکفر نزدیک است (فوائد الفواد ص۱۰۹)

مردود ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اسی حدیث کے بعض الفاظ میں فی امرنا ہذا کی جگہ صریح طور پر دین کا لفظ آیا ہے:

وفی بعض الفاظه من احدث فی دیننا مالیس منه فھو ردّ۔ (ص۴۲) اور اس حدیث کے بعض الفاظ میں فی دیننا کے الفاظ آئے ہیں یعنی جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی تو وہ مردود ہوگی

جب جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اسی روایت کے اندر دوسرے الفاظ میں فی امرنا ھذا کی جگہ فی دیننا کے الفاظ وارد ہوئے ہیں تو پھر اس سے بڑھ کر صحیح تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے۔

حافظ ابنِ حجرؒ فی امرنا ھذا کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

"والمراد امر الدّین" (فتح الباری ج ۵ ص۲۲۳)۔ فی امرنا ھذا سے دین کا امر مراد ہے یعنی جس نے دین کے اندر کوئی نئی چیز نکالی تو وہ مردود ہوگی۔ علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں ان المراد بذالک ھو ان یجعل فی الدّین مالیس منه... الخ (شرح المقاصد ص۲۷۱/۲)

علامہ عزیزیؒ (المتوفی ۱۰۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ: "من احدث فی امرنا ھٰذا ای فی دین الاسلام" (السراج المنیر ج ۳ ص۳۲۰) یعنی فی امرنا ھٰذا سے "دینِ اسلام" مراد ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح سے واضح تر ہوگئی ہے کہ ہر بدعت اور ہر احداث بُرا اور مردود نہیں ہے، بلکہ وہ بدعت اور وہ احداث بُرا اور مردود ہے جو دینِ اسلام کے اندر دین سمجھ کر کیا یا چھوڑا جائے، اور یہ صرف شراحِ حدیث نے ہی نہیں کہا، بلکہ بقول ابنِ رجبؒ اسی حدیث کے بعض الفاظ میں دین کی قید (فی دیننا) خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لگائی ہے۔ یہ حدیث اس بات کے لئے نصِّ صریح ہے کہ جتنی بدعتیں لوگوں نے دین کے اُمور میں نکالی ہیں، وہ سب کی سب مردود ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا خرم علی صاحب الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۷۱ھ) مترجم مشارق الانوار لکھتے ہیں:

"جتنی بدعتیں لوگوں نے خلافِ شرع نکالی ہیں، اس حدیث سے سب ردّ ہوگئیں۔ تفصیل کی کچھ حاجت نہیں۔ مثلاً قبر پر گچ کرنا، گنبد بنانا، قبروں پر روشنی کرنا، تعزیہ بنانا، بزرگوں کا میلہ کرنا، اولیاء کی منّت ماننا، جھنڈے نشان کھڑے کرنا سراسر دین کے خلاف ہیں۔ قرآن اور حدیث اور اجماع اور قیاسِ شرعی میں ان کی کچھ اصل نہیں"۔ (ترجمہ مشارق الانوار ص۱۰)۔

اکابرینِ علماء دیوبند اس حدیث سے اکابرینِ علماء دیوبند بھی یہی سمجھے ہیں کہ فی امرنا ھٰذا سے امرِ دین مراد ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رح (المتوفی ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ فی امرنا ھٰذا سے امرِ دین مراد ہے۔ (بذل المجہود ج ۵ ص۱۹۵)۔ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رح (المتوفی ۱۳۶۹ھ) لکھتے ہیں۔ "والمراد بالامر الدین کما صرحوا بہ" (فتح الملہم ج ۲ ص۴۰۷)، کہ مراد اس سے امرِ دین ہے، علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔

بریلوی عقائد کے علماء اس حدیث کی تفسیر بریلوی حضرات نے بھی امرِ دین سے کی ہے چنانچہ مولوی محمد صالح صاحب (مشہور بریلوی عالم) لکھتے ہیں کہ "مراد امر سے امرِ دین کا ہے۔ مطلب یہ ہے، کہ اُمورِ دینیہ عبادات ہوں یا معاملات کہ جن کے حدود شارع نے مقرر کئے ہیں، ان میں کمی بیشی کرنا مردود ہے"۔ (تحفۃ الاحباب فی تحقیق ایصال الثواب ص۱۱)۔

مولوی عبد السمیع صاحب رام پوری لکھتے ہیں کہ "یہ حدیث صحیحین کی ہے، یعنی جس نے نکالی اس دین میں وہ بات جو دین کی قسم سے نہیں یعنی کتاب اور سنّت کے مخالف ہے، وہ بات اس کی ردّ ہے"۔ (انوارِ ساطعہ ص۳۳)

فریقِ مخالف کے مجدّدِ ملّت اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی (المتوفی ۱۳۴۰ھ) تمباکو کو حلال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "رہا اس کا بدعت ہونا یہ کچھ باعثِ ضرر نہیں کہ یہ بدعت کھانے پینے میں ہے نہ کہ اُمورِ دین میں، تو اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار کام ہے"۔ (احکامِ شریعت حصّہ سوم ص۱۶۸)۔ آپ نے فریقِ مخالف کے محقّق اور مسلّم علماء سے بھی یہ سُن لیا کہ بدعت وہی مذموم ہے، جو امورِ دین سے سمجھ کر کی جائے۔ جس کا تعلق امورِ دین سے نہیں، اس کی حُرمت ثابت کرنا ایک دشوار امر ہے۔

بدعت کی تعریف ائمہ لغت سے قارئینِ کرام نے یہ ملاحظہ کر لیا کہ جو چیز قرآن کریم، حدیث، اجماع اور شرعی قیاس سے ثابت نہ ہو اور وہ کام جنابِ نبی کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی سیرت اسوۂ حسنہ اور نمونہ کے خلاف ہو، اور وہ کام جب دین کے اندر ایجاد کیا گیا تو یقیناً بدعت ہوگا۔

اب آپ بدعت کی تعریف ائمہ لغت سے سُن لیجئے کہ وہ کیا کرتے ہیں:

مشہور امام لغت ابو الفتح ناصرؒ بن عبد السید المطرازی الحنفیؒ (المتوفی ۶۱۶ھ) لکھتے ہیں کہ:

البدعة اسم من ابتداع الامر اذا ابتدأه واحدثه كالرفعة اسم من الارتفاع والخلفة اسم من الاختلاف ثم غلب على ما هو زيادة فی الدين او نقصان منه۔ (مغرب ج ۱ ص ۳۰)۔

بدعت ابتداع کا اسم ہے جس کا معنی یہ ہے کہ کوئی نئی چیز ایجاد کی جائے رفعت ارتفاع کا اور خلفت اختلاف کا اسم ہے۔ لیکن پھر بدعت کا لفظ ایسی چیز پر غالب آگیا، جو دین میں زیادہ یا کم کر دی جائے۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادیؒ (المتوفی ۸۱۶ھ) لکھتے ہیں:

بدعت بالكسر الحدث فی الدين بعد الاكمال او ما استحدث بعد النبی صلى الله عليه وسلم من الاهواء والاعمال۔ (قاموس ج ۲ ص ۶)

بدعت (کسرۂ بار کے ساتھ) ایسی چیز کو کہا جاتا ہے، جو تکمیل دین کے بعد نکالی گئی ہو، یا وہ چیز جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد خواہشات اور اعمال کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی ہو۔

امام راغب اصفہانیؒ (المتوفی ۵۰۳ھ) لکھتے ہیں:

والبدعة فی المذهب ايراد قول لم يستن قائلها او فاعلها فيه بصاحب الشريعة و اماثلها المتقدمة واصولها المتقنة۔ (مفردات قرآن ص ۳۷)

مذہب میں بدعت کا اطلاق ایسے قول پر ہوتا ہے جس کا قائل یا فاعل صاحبِ شریعت کے نقشِ قدم پر نہ چلا ہو۔ اور شریعت کی سابق مثالوں اور اس کے محکم اصولوں پر وہ گامزن نہ ہوا ہو۔

امام محمدؒ بن ابی بکر بن عبد القادر الرازیؒ (المتوفی ــــ ھ) لکھتے ہیں کہ:

والبدعة ـ الحدث فی الدين بعد الاكمال۔ (مختار الصحاح ص ۲۸۰)

بدعت، اکمال دین کے بعد اس میں احداث کا نام ہے۔

علامہ ابو الفضل محمدؒ بن عمر الجمال القرشیؒ (المتوفی ــــ ھ) لکھتے ہیں:

"بدعت نو بیروں آوردن رسمے در دین بعد اکمال دین"۔ (صراح ۲ ص ۳۰۱)

اُردو کی مشہور لغت فیروز اللغات میں ہے:

بدعت : ۱ : دین میں کوئی نئی بات یا نئی رسم نکالنا ، نیا دستور یا رسم و رواج - ۲ : سختی ، ظلم -
۳ : جھگڑا ، فساد ، شرارت - (فیروز اللغات ص۱۹۴)

اور مصباح اللغات میں ہے :

البدعة : بغیر نمونہ کے بنائی ہوئی چیز - دین میں نئی رسم - وہ عقیدہ یا عمل جس کی کوئی اصل قرونِ ثلاثہ مشہود لہا بالخیر میں نہ ملے - (مصباح اللغات ص۲۷) -

امام نوویؒ بدعت کا لغوی معنیٰ یہ بیان کرتے ہیں کہ :

"کلّ شیء عمل علیٰ غیر مثال سبق"۔ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص۲۸۵) یعنی ہر وہ چیز جو کسی سابق نمونہ کے بغیر کی جائے۔

بدعت کا شرعی معنیٰ حافظ بدرالدین عینی الحنفیؒ (المتوفی ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں کہ :

والبدعة فی الاصل احداث امر لم یکن فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عمدة القاری ج ۵ ص۳۵۶)	بدعت اصل میں ایسی نو ایجاد چیز کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی۔

حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ :

والبدعة اصلها ما احدث علیٰ غیر مثال سابق وتطلق فی الشرع فی مقابل السنّة فتکون مذمومة - (فتح الباری ج ۴ ص۲۱۹) -	بدعت اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے ایجاد کی گئی ہو - اور شریعت میں بدعت کا اطلاق سنّت کے مقابلہ میں ہوتا ہے لہٰذا وہ مذموم ہی ہوگی -

علامہ مرتضیٰ الزبیدی الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۰۵ھ) لکھتے ہیں :

کل محدثة بدعة انما یرید ما خالف اصول الشریعة و لم یوافق السنّة - (تاج العروس ج ۵ ص۲۷۱) -	کل محدثۃ بدعۃ (کی حدیث) کا معنی یہ ہے کہ جو چیز اُصول شریعت کے خلاف ہو اور سنّت کے موافق نہ ہو۔

حافظ ابنِ رجبؒ لکھتے ہیں کہ :

و المراد بالبدعة ما احدث مما لا اصل له فی الشریعة یدل علیه واما ما کان له اصل	بدعت سے مراد وہ چیز ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو جو اس پر دلالت کرے ، اور بہرحال وہ چیز جس کی

من الشرع یدل علیہ فلیس ببدعة شرعاً و ان کان بدعة لغة (جامع العلوم والحکم ص۱۹۳)۔ | شریعت میں کوئی اصل ہو جو اس پر دال ہے، تو وہ شرعاً بدعت نہیں ہے۔ اگرچہ لغۃً بدعت ہوگی۔

اور بعینہٖ ان الفاظ سے بدعت کی تعریف علامہ معین بن صفیؒ (المتوفی ۸۸۹ھ) نے شرح اربعین نوویؒ میں کی ہے (الجُنہ ص۱۵۹)۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ :

"بدیع السمٰوٰت کا یہ معنیٰ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور لغت میں ہر نئی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے اور بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ۱: بدعتِ شرعی جس کے متعلق جناب نبی کریم صلےّ اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة۔ کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ۲: کبھی بدعت لغوی ہوتی ہے، جیسے حضرت عمرؓ نے لوگوں کے مل کر تراویح پڑھنے کے متعلق فرمایا : نعمت البدعة ھٰذہٖ۔ "یہ کیا ہی اچھی نو ایجاد ہے"۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ :

وکذٰلک کل محدث قولاً او فعلاً لم یتقدم فیہ متقدم فان العرب تسمیہ مبتدعاً۔ (تفسیر ج ۱ ص۱۶۱)۔ | اور اسی طرح ہر وہ قول یا فعل جس کو پہلے کسی نے نہ کیا ہو، اہلِ عرب ایسے کام کو بدعت کہتے ہیں۔

علامہ ابو اسحاق غرناطیؒ بدعتِ شرعی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ :

طریقة فی الدین مخترعة تضاھی الشریعة یقصد بالسلوک علیھا المبالغة فی التعبد للہ سبحانہٗ۔ (الاعتصام ج ۱ ص۳۰)۔ | وہ دین کے اندر ایسا اختراع کیا ہوا طریقہ ہے جو شریعت کے مشابہ ہے اور جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ قصد کیا جاتا ہے۔

مولوی عبد السمیع صاحب، حضرات فقہاء کرامؒ سے بدعت کا معنیٰ یہ نقل کرتے ہیں کہ علامہ شمنیؒ وغیرہ محققین نے بدعتِ سیئہ مذمومہ کی تعریف اس طرح فرمائی ہے :

ما احدث علی خلاف الحق المتلقی عن | (کہ بدعت وہ چیز ہے) جو اُس حق کے خلاف ایجاد کی گئی ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علم او عمل او حال بنوع شبھة واستحسان وجعلہ دینا قویما وصراطا مستقیما (انوار ساطعہ ص۲۶۲)

جو آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سے اخذ کیا گیا ہو، یا عمل یا حال اور کسی شبہ کی بنا پر اس کو اچھا سمجھ کر دینِ قویم اور صراطِ مستقیم بنا لیا گیا ہو۔

بدعتِ شرعیہ اور بدعتِ سیئہ کی بعینہٖ اسی عبارت سے بحر الرائق اور در مختار وغیرہ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں میں تعریف کی گئی ہے۔ (دیکھئے الجنۃ ص۱۶۱)۔

مولانا سخاوت علی صاحب الحنفی جونپوریؒ (المتوفی ۱۲۷۴ھ) لکھتے ہیں:

"بدعت وہ کام خواہ عقیدہ کہ دین کا ہو اور آخرت کا نفع اور ضرر اس میں سمجھتے ہو، ثابت نہ ہوا ہو رسول مقبول صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سے اور آپ کے صحابہؓ سے"۔ (رسالہ تقویٰ ص۹)۔

اور نواب قطب الدین خان صاحب دہلوی الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۷۹ھ مؤلف مظاہر حق) لکھتے ہیں: پس بدعت اور نو احداث دین میں تو ہے تعزیہ اور مہندی اور چھڑی مدار اور سالار کی الخ"۔ (رسالہ گلزارِ جنت ص۵۹)

فریقِ مخالف کے مشہور محقق عالم مولوی محمد صالح صاحب لکھتے ہیں کہ: "اصطلاحِ شریعت میں بدعت اُس چیز کو کہتے ہیں جو اُمورِ دینیہ سے سمجھی جائے مگر کسی دلیلِ شرعی سے اس کا ثبوت نہ ملتا ہو، نہ کتاب سے نہ احادیثِ نبویہ سے، نہ اجتماعِ مجتہدین سے نہ قیاسِ شرعی سے"۔ تحفۃ الاحباب ص۹۵)

اکابرین علماء دیوبند اکابرینِ علماء دیوبند ہر مسئلہ میں اتباعِ سنّت کے ساتھ سلف صالحینؒ کی تحقیق پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔ دیگر مسائل کی طرح وہ بدعت کی تعریف میں بھی سلف کی پیروی کرتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا کریم بخش صاحبؒ (المتوفی ۱۳۶۵ھ) لکھتے ہیں: اصطلاحِ شریعت میں بدعت ہر وہ فعلِ دین ہے جس کو قرونِ ثلاثہ کے اہلِ حق کی اکثریت نے قبول نہ کیا ہو، یا اِن پاک زمانوں میں اس کو خلافِ دین کہا گیا ہو، یا خود ان زمانوں کے بعد پیدا ہو جس میں عقیدۃً غیر ضروری کو ضروری سمجھا جائے، یا ضروری کو غیر ضروری"۔ (حقیقۃ الایمان ص۳۸)۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "بدعت کہتے ہیں ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب و سنّت اور قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو، اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے"۔ (حمائل شریف ص۱۰۷)۔

اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۷۲ھ) لکھتے ہیں کہ "بدعت ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کی اصل شریعت سے ثابت نہ ہو، یعنی قرآن مجید اور احادیث شریف میں اس کا ثبوت نہ ملے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانہ میں اس کا وجود نہ ہو، اور اُسے دین کا کام سمجھ کر کیا یا چھوڑا جائے"۔ (تعلیم الاسلام حصہ چہارم ص۲۷)

قارئین کرام! ان ٹھوس حوالجات کو پڑھ پڑھ کر اور سُن سُن کر آپ یقیناً اُکتا چکے ہوں گے، مگر ہم بھی مجبور ہیں۔ ہمیں ایسے حضرات سے سابقہ پڑچکا ہے جو دین سے یقیناً بے بہرہ ہیں مگر لوگوں کے ایمان اور دین کو شبہات کی بدولت لُوٹنے میں بڑے چُست اور ہوشیار ہیں، اور عوام بیچارے ان کے جُبوں اور قبہ نما دستاروں میں اُلجھ کر متاع ایمان گنوا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان گندم نما جَو فروشوں سے محفوظ رکھے۔ ان عبارات میں آپ نے بخوبی ملاحظہ کر لیا کہ کیا دیوبندی حضرات اور کیا بریلوی اور کیا وہ اکابرِ علماء اُمت جو فریقین کے نزدیک مسلّم ہیں۔ بدعت کی تعریف میں دِین کی قید لگاتے ہیں اور علم اور عمل اور حال — عبادات و معاملات سب کو اس میں درج کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ جو عقیدہ یا عمل یا حال کتاب و سنّت اجماع و قیاسِ شرعی کے تحت درج نہ ہو وہ بدعت ہے۔ دِین کی اور عقیدہ کے علاوہ عمل کی خاص طور پر قید لگاتے ہیں اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ کی عبارت میں حضرات صحابہ کرامؓ کا ذکر بھی (کل قول وفعل لم یثبت عن الصّحابةؓ هو بدعة) گزر چکا ہے۔ اس سب بحث کو پیشِ نظر رکھ کر آپ مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی ثم گجراتی کی تحقیقِ انیق بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے۔ احادیثِ صحیحہ اور اقوالِ علماء و فقہاء اور محدّثین کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کل محدثة بدعة (مشکوٰۃ باب الاعتصام) ہر نیا کام بدعت ہے۔ اس میں دینی یا دُنیاوی کی قید نہیں۔ نیز ہم اشعة اللمعات اور مرقات کی عبارتیں نقل کر چکے ہیں۔ اُس میں دینی کام کی قید نہیں لگائی"۔ (جاء الحق وزہق الباطل ص۲۱۲)۔

نیز لکھتے ہیں کہ: "ان دونوں عبارتوں (مرقات اور اشعة اللمعات کی عبارت) میں نہ تو دینی کام کی قید ہے اور نہ زمانۂ صحابہؓ کا لحاظ ہے۔ جو کام بھی ہو دینی ہو یا دُنیاوی حضور علیہ السلام کے بعد جب بھی ہو، خواہ

زمانۂ صحابہؓ میں یا اس کے بعد، وہ بدعت ہے"۔ (جاء الحق ص۲۰۶)۔

مفتی صاحب کا یہ ارشاد سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ سابق عبارات میں اس کی پوری تحقیق عرض کی جاچکی ہے کہ شرعی بدعت میں جو مذموم اور قبیح ہے، دین کی قید ملحوظ ہے بلکہ ایک روایت میں فی دیننا کے الفاظ آئے ہیں۔ وثانیاً اگر بالفرض مرقات اور اشعۃ اللمعات کی عبارتوں میں دین کی قید اور صحابہ کرامؓ کا ذکر نہیں تو کیا کسی اور کی عبارت میں بھی اس کا ذکر نہ ہوگا؟ لیجئے ہم مفتی صاحب کو مرقات اور اشعۃ اللمعات سے دین کی قید بتاتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کی ایک بدعتی کو سلام کا جواب نہ دینے کی روایت باحوالہ پہلے عرض کی جاچکی ہے۔ اس روایت میں بلغنی قد احدث کی شرح کرتے ہوئے علامہ ملا علی ن القاریؒ لکھتے ہیں کہ:

قد احدث ای ابتدع فی الدین ما لیس منہ۔ (مرقات علی المشکوٰۃ ج ۱ ص۲۳)۔ یعنی اس نے دین میں ایسی چیز نکالی ہے، جو دین سے نہیں ہے۔

اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ: "رسیدہ است مرا کہ وے احداث نمودہ و پیدا کردہ است در دین چیزے را کہ نمودہ است"۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص۱۰۲)

لیجئے مفتی صاحب کی منہ مانگی مراد پوری ہوگئی اور مرقات و اشعۃ اللمعات کی عبارتوں میں دین کی قید نکل آئی۔ اب مفتی صاحب ان سے پوچھ لیں کہ انہوں نے محض اپنی طرف سے دین کی قید کیوں لگائی ہے اور احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کی خلاف ورزی کیوں کی ہے؟ اسی طرح علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین اور ما انا علیہ واصحابی کی شرح میں ان دونوں بزرگوں کی عبارتیں ملاحظہ کرلیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل سنت ہے یا بدعت؟ طبیعت صاف ہو جائے گی، اور اشعۃ اللمعات کی یہ عبارت پہلے نقل کر دی گئی ہے کہ حضرات خلفاء راشدینؓ نے اجتہاد و قیاس سے جو احکام صادر کئے ہیں، وہ بھی سنت ہیں: "و اطلاق بدعت برآں نتواں کرد، چناں کہ فرقہ زائغہ کنند"۔ مفتی احمد یار خان صاحب تو صحابہؓ کے عمل کو بھی الزامی طور پر بدعت کہہ کر بدعت کا چور دروازہ کھولتے ہیں۔ تعجب اور حیرت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو حضرات خلفاء راشدینؓ کے عمل کو سنت فرمائیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کو معیار حق

قرار دیں اور خیر القرون کے نقشِ قدم پر چلنے کی وصیت فرمائیں، اور مفتی احمد یار خان صاحب یہ کہیں کہ خواہ زمانہ صحابہؓ میں یا اس کے بعد، وہ بدعت ہے۔ وثالثاً مفتی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے، احادیثِ صحیحہ اور اقوالِ علماء و فقہا اور محدثین کے خلاف ہے۔ یہ ان کا خالص بہتان اور افتراء اور سفید جھوٹ ہے۔ دینی کام کی قید نہ تو احادیثِ صحیحہ کے خلاف ہے اور نہ اقوال فقہا اور محدثین کے خلاف ہے۔ کسی ایک معتبر امام و فقیہہ اور محدثؒ عالم کا حوالہ پیش نہیں کیا جا سکتا جو یہ کہتا ہو کہ بدعت مذمومہ اور شرعی بدعت کی تعریف میں دین کی قید ملحوظ نہیں۔ فھل من مبارزٍ ؎

ستعلم لیلیٰ ای دین تداینت
و ای غریم فی التقاضی غریمھا

حضرت امام مالکؒ کا حوالہ الاعتصام سے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ابتدع فی الاسلام کی قید لگاتے ہیں اور باقی علماء اور فقہا و محدثین کی عبارتیں (بلکہ فریقِ مخالف کے محقق اور مسلّم علماء کی عبارتیں بھی) عنقریب نقل کی جا چکی ہیں، اور ائمہ لغت سے بھی یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ وہ بدعت کی تعریف کرتے ہوئے دین کی قید سے بے اعتنائی اور بے پروائی نہیں کرتے اور کل محدثة بدعة کے متعلق بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کتاب و سنت کے مقابلہ میں اس کو بیان کرکے یہ متعین فرما دیا ہے کہ اس سے مراد شرعی بدعت ہے اور حافظ ابنِ کثیرؒ اور علامہ زبیدیؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد شرعی بدعت ہے، لغوی نہیں۔ ضرورت تو نہیں کہ ہم کچھ اور عرض کریں، مگر مفتی صاحب کی خود فریبی اور مغالطہ آفرینی کے پیشِ نظر چند حوالجات اور سپردِ قلم کئے جاتے ہیں۔

حبرِ امت ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ (المتوفی ۶۸ھ) آیت فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ الآیۃ کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

۱؎ شیخ عبد الحق صاحبؒ، حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت خط لنا الخ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ صراطِ مستقیم صرف وہ ہے جس پر سلف صالحینؒ از صحابہؓ و تابعین باحسان و من بعدہم برایں اعتقاد و بریں طریقہ بودہ اند و ایں بدع و اہواء در مذاہب و اقوال ابدعہ وا قوال حادث شدہ۔ (اشعۃ اللمعات ج اص ۱۴۲)

دخل فی ھذہ الاٰیۃ کل محدث فی الدین و کل مبتدع الی یوم القیٰمۃ۔ | اس ایت میں ہر وہ بدعت جو دین میں نکالی جائے اور تمام بدعتی جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے داخل ہیں۔

(خازن ج۱ ص۵۰۹ و معالم برخازن ج۱ ص۵۰۹)

مفتی صاحب ہمّت کر کے مفسر قرآن اور بلند پایہ صحابی سے دریافت کریں کہ آپ نے فی الدّین کی قید محض اپنی طرف سے کیوں لگائی ہے۔ بدعت تو ہر نئی چیز کا نام ہے، دینی ہو یا دنیاوی ؟

حضرت حسّان تابعیؒ (المتوفّٰی بعد ۱۳۰ھ) فرماتے ہیں :

ما ابتدع قوم بدعۃ فی دینھم الا نزع اللّٰہ من سنّتھم مثلھا ثم لا یعیدھا الیھم الی یوم القیٰمۃ۔ (دارمی ص۲۶ و مشکوٰۃ ج۱ ص۳۱) | کوئی قوم دین میں بدعت نہیں نکالے گی مگر اللہ تعالیٰ اُتنی ہی مقدار میں سُنّت اُن سے اُٹھالے گا۔ اور پھر قیامت تک ان کو وہ سنّت واپس نہ دے گا۔

حضرت حسّانؒ بھی بدعت کے ساتھ فی دینھم کی قید لگاتے ہیں اور سنّت اور بدعت کا تقابل کر کے یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ اگر سنّت دینی کام ہے تو بدعت بھی دینی ہی کام کا نام ہے بلکہ حضرت غضیف رضؓ بن الحارث الثمالی (المتوفّٰی ۶۵ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلھا من السنّۃ فتمسك بسنّۃٍ[1] خیر من احداث بدعۃ۔ (مسند احمد ج۴ ص۱۰۵ و مشکوٰۃ ج۱ ص۳۱) | کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی قوم بدعت ایجاد نہیں کرے گی مگر اسی کی مقدار میں سنّت اُن سے اُٹھالی جائے گی۔ سو سنّت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی بدعت کا تقابل سنّت سے کیا ہے۔ اگر سنّت دینی کام ہے، تو بدعت بھی دینی کام ہوگا۔ اگر بدعت دنیاوی کام ہو جیسا کہ مفتی صاحب کو دھوکا ہوا ہے تو اتحادِ محل نہ رہا۔ پھر بدعت کے لئے احداث سے سنّت کیسے رفع ہوگی ؟

---

[1] شیخ عبدالحق دہلویؒ لکھتے ہیں کہ سنّت بمعنی سیرت وطریقہ مسلوک در دین (اشعۃ اللمعات ج۱ ص۱۶۱) یعنی سنّت کے معنی سیرت کے اور دین میں اُس راستہ کے ہیں جس پر چلا جائے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی (المتوفیٰ ۷۹۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

ان البدعة المذمومة هو المحدث فی الدین من غیر ان یکون فی عهد الصحابة والتابعین ولا دل علیه الدلیل الشرعی (شرح المقاصد ج ۲ ص ۲۷۱)

مذموم بدعت وہ ہے جو دین کے اندر ایجاد کی جائے۔ اور وہ حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعین کے عہد میں نہ ہو اور نہ اس پر کوئی شرعی دلیل دلالت کرتی ہو۔

علامہ عبد العزیز فرہارویؒ رد بدعت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ھو کل ماحدث فی الدین بعد زمن الصحابة بلا حجة شرعیة (بزاس ص ۱۲)

بدعت ہر وہ چیز ہے جو حضرات صحابۂ کرامؓ کے زمانہ کے بعد بلا حُجتِ شرعیہ دین میں نکالی جائے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ جس بدعت کی مذمت کی گئی ہے وہ بقول مفتی احمد یار خان صاحب ہر نیا کام نہیں جو دینی ہو یا دُنیاوی، بلکہ وہ بدعتِ مذموم ہے جو محدث فی الدین ہو، اور یہی بدعت حرام ہے۔ اور جو بدعت امورِ دین میں نہ ہو اس کی حرمت ثابت کرنا بقول خان صاحب بریلوی ایک دشوار کام ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک مقام پر ارقام فرماتے ہیں:

"از حق تعالیٰ تضرع است کہ ہر چہ در دین محدث شدہ است و مبتدع گشتہ کہ در زمانِ خیر البشر و خلفاء راشدین او نبودہ اگرچہ آں چیز در روشنی مثل فلق صبح بود ایں ضعیف را با جمعے کہ با و مستند اند گرفتارِ عمل نگرداناد و مفتونِ حسن آں مبتدع نکناد بحرمة سید المرسلین۔" (مکتوبات حصہ سوم ص ۲۷ مکتوب ۱۸۶)

اسی مکتوب میں حضرت مجدد صاحبؒ نے حضرات خلفاء راشدین کے علاوہ حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ سے لے کر فریقِ مخالف کے مسلّم عالم مولوی احمد رضا خان صاحب بریلویؒ تک سب بدعت کے ساتھ دین کی قید لگاتے ہیں مگر مفتی احمد یار خان صاحب ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! کیا بعید ہے کہ وہ یہ کہہ دیں سہ

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح — نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں

الغرض مذموم بدعت صرف وہ ہے جو کارِ ثواب اور دین سمجھ کر کی جائے اور اسی کی مذمت

پر حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعین اور سلف صالحین کا اجماع ہے چنانچہ علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ یعنی :

لاجماع السلف الصالح من الصحابة والتابعین ومن یلیهم علیٰ ذمّها کذلك (الاعتصام ج۱ ص۱۸۱)

حضرات صحابۂ کرامؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ وغیرہم سلف صالحینؒ کا اسی بدعت کی مذمت پر اجماع و اتفاق رہا ہے۔

اور اس میں دینی کام کی قید موجود ہے۔ دنیوی اُمور اس بدعت میں ہرگز داخل نہیں ہیں بلکہ یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکروہ تک بھی نہیں چہ جائیکہ وہ حرام اور بدعتِ مذمومہ میں داخل ہوں۔ ہمارے کہنے پر یقین نہ آئے تو آپ شیخ الاسلام ابن دقیق العیدؒ (المتوفی ۷۰۲ھ) کی سُن لیجئے :

انا اذا نظرنا الی البدع المتعلقة بامور الدنیا لم تساو البدع المتعلقة بامور الاحکام الفرعیة ولعل البدع المتعلقة بامور الدنیا لا تکرہ اصلاً بل کثیر منها یجزم فیه بعدم الکراهة واذا نظرنا الی البدع المتعلقة بالاحکام الفرعیة لم تکن مساویة للبدع المتعلقة باصول العقائد۔ (احکام الاحکام ج۱ ص۵)

ہم نے جب ان بدعتوں کو دیکھا جو اُمور دنیا سے متعلق ہیں تو وہ اُن بدعات کے مساوی نظر نہ آئیں جو بدعات فرعی احکام سے متعلّق ہیں اور شاید کہ وہ بدعتیں جو اُمورِ دُنیا سے متعلّق ہیں بالکل مکروہ بھی نہ ہوں بلکہ ایسی بہت سی دنیوی بدعات کے متعلق یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکروہ بھی نہیں ہیں اور جب ہم نے ان بدعات کو دیکھا جو فرعی احکام سے متعلّق ہیں تو وہ ان بدعات کے مساوی نہیں جو بدعات اصول عقائد سے متعلّق ہیں۔

اِس عبارت کو ذہن نشین کر لیجئے جس میں صراحت سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بدعت عقائد میں بھی ہوتی ہے اور اعمال میں بھی۔ دینی اُمور میں بھی اور دُنیوی میں بھی۔ مگر دنیوی اُمور کی بدعت نہ تو حرام ہے اور نہ مذموم، بلکہ مکروہ تک بھی نہیں۔ جو لوگ اُمورِ دنیاوی کو بدعت کی مد میں شامل کرتے ہیں، وہ نرے جاہل ہیں۔ ہم نہیں کہتے۔ مؤلّف انوار ساطعہ شرح جواہر توحید سے نقل کرتے ہیں :

ومن الجهلة من یجعل کل امر لم یکن فی زمن اصحابه بدعة مذمومة وان لم یقم دلیل علیٰ قبحه تمسکا بقوله صلی الله علیه

وہ لوگ جاہل ہیں جو ہر اس چیز کو جو حضرات صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں نہ تھی، بدعتِ مذمومہ قرار دیتے ہیں اگرچہ اس کی قبح پر کوئی دلیل تام نہ ہو سکی ہو، اور وہ جاہل

وسلم ایاکم ومحدثات الامور ولا یعلمون المراد بذٰلک ان یجعل فی الدّین ما لیس منه - (انوارِ ساطعہ ص۳۴)

دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نئی نئی چیزوں سے بچو- اور وہ جاہل یہ نہیں جانتے کہ محدثات الاُمُور سے مراد یہ ہے کہ دین میں ایسی چیز ایجاد کی جائے جو اس میں نہ ہو-

ان تمام اقتباسات کو دیکھئے اور پھر مفتی احمد یار خان صاحب کی علمی تحقیق ملاحظہ کیجئے- وہ لکھتے ہیں :

"آج کل دنیا میں وہ وہ چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں جن کا خیر القرون میں نام و نشان بھی نہ تھا، اور جن کے بغیر اب دُنیاوی زندگی مشکل ہے- ہر شخص ان کے استعمال پر مجبور ہے- ریل، موٹر، ہوائی جہاز، سمندری جہاز، تانگہ، گھوڑا گاڑی- پھر خط، لفافہ، تار، ٹیلیفون، ریڈیو، لاؤڈ سپیکر وغیرہ یہ تمام چیزیں اور ان کا استعمال بدعت ہے، اور انہیں ہر جماعت کے لوگ بِلا تکلّف استعمال کرتے ہیں- بولو دیوبندی وہابی بغیر بدعاتِ حسنہ کے دُنیاوی زندگی گذار سکتے ہیں ؟ ہرگز نہیں !" (انتہیٰ بلفظہ جاء الحق وزہق الباطل ص۲۱۱)

اس کی تحقیق تو اپنے مقام پر آئے گی کہ بدعتِ حسنہ کیا ہے اور بدعتِ سیّئہ کیا ہے ؟ مگر سابق عبارات کو ملاحظہ کر کے مفتی صاحب کو مناسب ہے کہ وُہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنا محاسبہ کر لیں کہ غلطی ان کی ہے جو ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں یا دیوبندیوں اور وہابیوں کی ہے ؟ ؎

مِری تعمیر میں مضمر ہے اِک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

قارئینِ کرام ! غور تو کیجئے کہ خود مفتی احمد یار خان صاحب حدیث من احدث فی امرنا ھٰذا ما لیس منه فھو ردّ کا کیا معنیٰ کرتے ہیں- وہ لکھتے ہیں : "جو شخص ہمارے اس دین میں وہ عقیدے ایجاد کرے جو کہ دین کے خلاف ہوں وہ مردود ہے- ہم نے مَا کے معنیٰ عقیدے اس لئے کئے کہ دین عقائد ہی کا نام ہے، اعمال فروع ہیں" (بلفظہ جاء الحق ص۲۰۴ و ص۲۰۵)

مفتی صاحب سے دریافت کیجئے کہ آپ نے محض اپنی طرف سے احادیثِ صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدّثین کے خلاف کرتے ہوئے کیوں دین کی قید لگائی ہے ؟ خصوصاً جب کہ بقول آپ کے اشعۃ اللمعات اور مرقات کی عبارتوں میں بھی دین کی قید نہیں لگائی گئی- فرمائیے کیا داعیہ پیش آیا ہے ؟ اور

پھر یہ بھی خوب کہی کہ دین عقائد ہی کا نام ہے، اعمال فروع ہیں۔ بلاشک نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ احکام عقائد کے لحاظ سے فروع ہیں مگر اپنے مقام پر وہ ارکانِ اسلام اور اصولِ دین بھی ہیں، اور قرآن کریم اور احادیث میں نماز اور جہاد وغیرہ احکام پر صراحت کے ساتھ لفظ دین کا اطلاق کیا گیا ہے۔ بیسیوں مثالیں اس پر پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہمارا مقصد ابھی بہت وسیع ہے لہٰذا اشارہ ہی کافی ہے۔ الغرض عقائد ہوں یا اعمال، بدعت سب میں ہوتی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی محض اپنی طرف سے اختراع مفتی صاحب نے مَا کے معنی کو صرف عقائد پر بند رکھا ہے اور اسی کی بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "ثابت ہوا کہ بدعت عقیدے کو فرمایا گیا"۔ (جاء الحق ص۲۰۵) ۔ آگے لکھتے ہیں: بدعت اور بدعتی پر جو سخت وعیدیں احادیث میں آئی ہیں ان سے مراد بدعتِ اعتقادیہ ہی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کے ڈھانے پر مدد دی یعنی بدعتِ اعتقادیہ والے کی فتاویٰ رشیدیہ جلد اوّل کتاب البدعات ص۹ میں ہے جس بدعت میں ایسی شدید وعید ہے وہ بدعت فی العقائد ہے جیسا کہ روافض خوارج کی بدعت"۔ (بلفظہٖ، جاء الحق و زھق الباطل ص۲۰۵)۔

بلاشک وعید شدید ایسی ہی بدعت پر وارد ہوئی ہے جو عقائد کی بدعت ہے مگر مفتی صاحب ہی بتائیں کہ کیا علمِ غیب، حاضر و ناظر اور مختارِ کل اور بشریت وغیرہ کے مسائل عقائد ہیں یا محض دل لگی کا سامان ہے؟ اور کیا ایسی شدید وعید ایسی بدعتِ اعتقادیہ پر آئے گی یا نہیں؟ خیر القرون میں تو یہ عقائد کسی کے نہ تھے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ اگر وعیدِ شدید کا اطلاق بدعتِ اعتقادیہ پر ہوا ہے تو احکام اور فروع اور غیر اعتقادی اُمور پر نفسِ بدعت کا اطلاق ہی نہ ہو اور ان پر نفسِ وعید بھی نہ ہو۔ متعدد حوالے سپردِ قلم کئے گئے ہیں کہ بدعت، اعتقاد اور عمل دونوں میں ہوتی ہے۔ حافظ ابنِ کثیرؒ کی عبارت میں قول و فعل کے الفاظ اور صاحبِ قاموس کی عبارت میں اہواء و اعمال کی قید اور علّامہ شمنیؒ وغیرہ محققین کی عبارت میں علم و عمل اور حال کی قید اور ابنِ دقیق العیدؒ کی عبارت میں احکامِ فرعیہ اور اصولِ اعتقادیہ کی قید خاص طور پر مذکور ہے۔ حافظ ابنِ رجبؒ لکھتے ہیں کہ:

فکل من احدث شیئاً ونسبہ الی الدین ولم یکن له اصل من الدین یرجع الیه فهو ضلالة والدین بری منه وسواء فی ذٰلك الاعتقادات او الاعمال او الاقوال الظاهرة والباطنة واما ما وقع فی کلام السلف من استحسان بعض البدع فانما ذٰلك فی البدع اللغویة لا الشرعیة۔ (جامع العلوم والحکم ص۱۹۳)

جس نے بھی کوئی چیز ایجاد کی اور اس کو دین کی طرف منسوب کیا جب کہ اس کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے جس کی طرف وہ راجع ہو تو وہ گمراہی ہے اور دین اس سے بری ہے برابر ہے کہ وہ ایجاد کردہ چیز اعتقادات ہوں یا اعمال یا اقوال ظاہرہ اور باطنہ، رہا سلف کے کلام میں بعض بدعات کے حسن کا ثبوت تو بجا ہے۔ مگر وہ حسن لغوی بدعات میں ہے نہ کہ شرعی بدعات میں۔

اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ:

"ولازم است اتباع سنّت سنیہ او در عبادات و عادات و اعتقاد باید کرد کہ ہرچہ خلاف سنّت وطریقہ او است باطل است وہرچہ پیدا کردہ اند وہر کہ پیدا کردہ است از انچہ بداں تغیرِ سنّت ومخالفت آں لازم آید قولاً وعملاً واعتقاداً ضلالت است ومردود قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ھٰذا ما لیس منه فهو ردّ وفرمود کل بدعة ضلالة وگفتہ اند ہرگز در دلی کہ گرفتارِ بدعت است نورِ ولایت درنیاید" (مکتوبات شیخؒ ص۳۴۹ برحاشیہ اخبار الاخیار)۔

حضرت شیخ صاحبؒ کی اس عبارت میں ایک تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ جو چیز جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سُنّت کی مُغیّر اور مخالف ہو، وہ بدعت ضلالت اور مردود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر نو ایجاد اور احداث مردود نہیں دنیوی ہو یا دینی۔ بلکہ وہ احداث مردود ہے جو سنّت کا مُغیّر اور مخالف ہو۔ دوسرا یہ امر واضح ہوا کہ عبادات، عادات اور اعتقاد تمام چیزوں میں سنّت کی پیروی لازم ہے اور اس کی مخالفت بدعت اور مردود ہے۔ تیسرا یہ امر واضح ہوا کہ کل بدعة ضلالة سے ہر نیا کام مراد نہیں جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ بقول شیخ صاحبؒ اس سے شرعی بدعت مراد ہے جو سنّت سنیہ کے مخالف ہو اور چوتھا یہ امر واضح ہوا کہ بدعتی میں نورِ ولایت کبھی نہیں آسکتا۔ اسلئے کہ نورِ ولایت

تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہوتا ہے اور بدعتی اس سے سراسر محروم ہوتا ہے۔

ایک وہم اور اُس کا ازالہ ممکن ہے مفتی احمد یار خان صاحب یہ فرمادیں کہ مَیں نے یہ تو نہیں کہا کہ دین کی قید اس حدیث میں نہیں ہے، مَیں نے تو یہ کہا ہے کہ دینی کام کی قید محض اپنی طرف سے ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ پیش کردہ عبارات میں دونوں قیدیں موجود ہیں۔ دین کی قید بھی اور عمل کی قید بھی۔ اور یہ روشن ہو چکا ہے کہ عقیدہ ہو یا عمل، جو بھی دین میں نو ایجاد کیا جائے گا وہ باطل اور مردود ہے۔ اور حدیث من احدث فی امرنا ھذا ما الخ مطلق ہے۔ حرف مَا عقائد اعمال اور اقوال و خواہشات سب کو شامل ہے جیسا کہ باحوالہ عرض کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو محض عقائد پر بند کر دینا جیسا کہ مفتی صاحب نے کیا ہے سراسر باطل ہے بلکہ اس حدیث کے دوسرے سیاق میں صراحت کے ساتھ عمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو ردٌّ۔ (بخاری ج ۲ ص ۱۰۹۲ و مسلم ج ۲ ص ۷۷ و مسند احمد ج ۶ ص ۱۴۰)

جس نے کوئی ایسا کام کیا[1] جس پر ہماری طرف سے ثبوت موجود نہیں تو وہ کام مردود ہوگا۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ بدعت صرف اعتقاد کا نام ہی نہیں بلکہ بدعتِ عملی بھی ہوتی ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس ارشاد میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ جس کام کے لئے آپ سے ثبوت موجود نہ ہو اور جس پر آپ کی مُہر نہ لگی ہوئی ہو تو وہ عمل باطل اور مردود ہوگا۔

لیجئے ہم مفتی احمد یار خان صاحب کی زبانی ان کو یہ مسئلہ منوا دیتے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ:

"بدعت کے شرعی معنیٰ ہیں وہ اعتقاد یا وہ اعمال جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانۂ حیات ظاہری میں نہ ہوں، بعد میں ایجاد ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدعتِ شرعی دو طرح کی ہوئی بدعتِ اعتقادی اور بدعتِ عملی"۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص ۲۰۴)

---

[1] بلکہ ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۶ کی روایت میں من صنع امرًا علیٰ غیر امرنا فھو ردٌّ کے الفاظ آئے ہیں اور یہی الفاظ من غیر امرنا کے مسند احمد ج ۶ ص ۷۳ میں بھی ہیں یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کا ہماری طرف سے ثبوت نہیں تو وہ مردود ہے

اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں کہ بدعت دو طرح کی ہوتی ہے بدعتِ اعتقادی اور بدعتِ عملی اور وعید دونوں پر وارد ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بدعتِ اعتقادی پر وعید شدید آئی ہے اور بدعتِ عملی پر نفسِ وعید وارد ہوئی۔ مگر وعید کی مد اور اس کی زد میں دونوں بدعتیں آتی ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی ایک اور غلطی وہ لکھتے ہیں کہ: "اگر مان لیا جاوے کہ بدعت میں دینی کام کی قید ہے تو دینی کام اُسی کو تو کہتے ہیں جس پر ثواب ملے (الیٰ ان قال) اور دنیا کا کوئی کام بھی نیّت خیر سے کیا جاوے اِس پر ثواب ملتا ہے (الیٰ ان قال) لہٰذا مسلمان کا ہر دُنیاوی کام دینی ہے۔ اب بتاؤ کہ نیّت خیر سے پلاؤ کھلانا بدعت ہے یا نہیں"؟ (جاء الحق ص۲۱۲)۔

اس کا فلسفہ تو مفتی صاحب ہی جانیں کہ پلاؤ کی تخصیص میں کیا حکمت مضمر ہے؟ اور اس کا راز بھی وہی جانیں کہ لوگوں کو پلاؤ کھلانے کی ترغیب کیوں دی ہے کھانے کی کیوں نہیں دی؟ مگر مفتی صاحب یہ تو بتائیں کہ کیا انہوں نے کتب فقہ اور اصول فقہ[1] میں مُبَاح کی تعریف بھی کہیں پڑھی ہے؟ اگر اور کتابیں نصیب نہیں ہو سکیں تو خلاصہ کیدانی ہی ملاحظہ کر لیتے۔ اور اگر وہ بھی دستیاب نہ ہو تو انوارِ ساطعہ تو پیش نظر ہی ہوگی جس سے رطب و یابس حوالے چُن چُن کر جاء الحق تیار کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

"اور بعضے مُباح یعنی اُن کے کرنے میں نہ ثواب نہ عذاب"۔ (بلفظہٖ انوار ساطعہ ص۴۷)

لیجئے مسلمانوں کے بعض کام ایسے بھی نکل آئے جن کے کرنے میں گو عذاب بھی نہیں مگر ثواب بھی نہیں ہے بلکہ خود مفتی صاحب نے اپنے استدلال میں ایک عبارت نقل کی ہے جس میں اس کی تصریح ہے کہ مباح سے ثواب متعلق نہیں ہوتا (دیکھئے جاء الحق ص۳۰۵) مفتی صاحب کو اس سے بڑا ثبوت اور کیا درکار ہے؟ ؎

مانتے جس کو نہ تھے لیجئے پہنچے وہاں

اہلِ بدعت حضرات کا ایک اُصولی مغالطہ دیگر اہلِ بدعت حضرات عموماً اور مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار خاں صاحب خصوصاً اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ لیس منہ سے وہ عقائد

---

[1] مباح وغیرہ کے متعلق توضیح ص۲۶ میں لکھا ہے لایثاب و لا یعاقب علیہ۔ یعنی نہ تو اس کے کرنے میں ثواب ملتا ہے اور نہ عذاب۔

اور اعمال مراد ہیں جو سنّت اور دین کے خلاف ہوں اور مخالفت کا یہ مطلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہی ان پر موجود ہو اور جو امور مسکوت عنہا ہیں ان کا احداث بدعت نہیں اور اگر بدعت بھی ہوں تو بدعتِ حسنہ ہوں گے۔ چنانچہ مولوی عبد السّمیع صاحب لکھتے ہیں کہ :

"پس جمیع اہلِ اسلام کو جاننا چاہیئے کہ حدیث من احدث فی امرنا کے ذیل میں جو شارحین حدیث لکھ رہے ہیں کہ نکالنا اس چیز کا جو مخالف کتاب و سنّت کے نہ ہو بُرا نہیں۔ اس کے صاف یہی معنٰی ہیں کہ جس چیز کی نہی کتاب اور حدیث رسول اللہ میں موجود نہیں، اس کا نکالنا بُرا نہیں۔ اور جس کی نہی موجود ہو، وہ ایجاد و احداث مردود ہے۔ (بلفظہٖ انوار ساطعہ ص۳۷)

اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ :

"اگر اعمال بھی ہوں تو لیس منہ سے مراد وہ اعمال ہیں جو خلافِ سنّت یا خلافِ دین ہوں"۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۱۳)

الجواب : یہ ان کی اُصولی غلطی اور جہالت کا بدترین مظاہرہ ہے۔ اولاً اس لئے کہ ابھی حدیث نقل کی جا چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کوئی ایسا کام کیا (لیس علیہ امرنا) جس پر ہمارا ثبوت موجود نہیں تو وہ مردود ہوگا۔ یہ تو آپ نے نہیں فرمایا کہ وہ کام مردود ہوگا (نھینا عنہ) جس پر ہماری نہی موجود ہو یا جس سے ہم نے منع کیا ہو، اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس چیز پر (باوجود اس کے کہ اُس وقت اس کا سبب اور محرک موجود تھا) آپ کی طرف سے ثبوت موجود نہ ہو تو وہ یقیناً بدعت ہوگی اگرچہ اس پر صریح نہی موجود نہ ہو۔

وثانیاً جس چیز پر آپ کی نہی موجود ہو وہ تو ممنوع اور منہی عنہ ہو گئی۔ وہ چیز احداث اور ابتداع کی مد میں کیسے رہی؟ پھر بدعت اور احداث کو الگ بیان کرنے کی کیا ضرورت رہی حالانکہ بدعت اور احداث نہی سے الگ چیز ہے جیسا کہ صحیح روایات اور اجماعِ اُمّت سے ثابت ہے۔

وثالثاً اگر احداث اور بدعت کی یہ تعریف ہے کہ اُس پر نہی موجود ہو تو پھر اس کی دو قسمیں بدعت حسنہ

اور بدعتِ سیئہ کیسے بنالی گئی؟ کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہی کے بعد بھی اس کا احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ اس میں حسن موجود ہو؟ اور اس صریح نہی کے ہوتے ہوئے علماء اُمّت یہ نہ سمجھ سکے کہ آپ کی نہی کا اقل درجہ کراہت ہے۔ پھر بدعت کے یہ احکام کہ واجب، مندوب، حرام، مکروہ اور مباح کیسے تجویز ہوئے (دیکھئے شرحِ مسلم للنوویؒ ج ۱ ص ۲۸۵ و مدخل لابن امیر الحاجؒ ج ۲ ص ۲۵۷)۔

ورابعاً یہ کہنا کہ جس چیز کی نہی کتاب وسنّت میں نہ ہو، اس کا نکالنا اور کرنا بُرا نہیں، یہ بھی سراسر باطل اور قطعاً مردود ہے اور محدّثین عظامؒ و فقہاء کرام کے صریح ضوابط کے خلاف ہے۔ علماءِ اسلام نے اس کی تصریح کی ہے کہ جیسے عزائم سے خدا تعالیٰ کی بندگی اور عبادت وخوشنودی کی جاتی ہے اسی طرح رخصتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی متعلق ہے اور جس طرح جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا کسی کام کو کرنا سنّت ہے اسی طرح کسی کام کو چھوڑنا بھی سنّت ہے۔ لہٰذا آپ کے ترکِ فعل کی اتباع بھی سنّت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے۔ چنانچہ حضرت ملا علی ن القاریؒ اور شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ ایک حدیث شریف یوں پیش کرتے ہیں:

ان اللہ یحب ان یؤتیٰ رخصۃ کما یحب ان یؤتیٰ عزائمہٗ (مرقات ج ۲ ص ۱۵ واشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۲۸ طبع ملتان)

کہ اللہ تعالیٰ جیسے عزائم کی ادائیگی کو پسند کرتا ہے اسی طرح وہ اسکو بھی پسند کرتا ہے کہ اسکی رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے۔

نیز حضرت ملا علی ن القاریؒ مشکوٰۃ شریف کی پہلی حدیث انما الاعمال بالنیات کی شرح میں یہ نقل کرتے ہیں:

والمتابعة كما تكون في الفعل يكون في الترك ايضاً فمن واظب على فعل لم يفعله الشارع فهو مبتدع (مرقات ج ۱ ص ۴۱)۔

کہ متابعت جیسے فعل میں ہوتی ہے اسی طرح ترک میں بھی متابعت ہوتی ہے۔ سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے۔

اور اسی موقع پر شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ:

"اتباع ہمچناں کہ در فعل واجب است در ترک نیز

اتباع جیسے فعل میں واجب ہے اسی طرح ترک میں بھی

ماہ کتاب ہذا کا ص ۲۸۴ بھی ملاحظہ کیجئے۔

می باید پس آنکہ مواظبت نماید بر فعل آنچہ شارع نکردہ باشد مبتدع بود، کذا قال المحدثون۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۲)	اتباع ہوگی۔ سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہوگا اسی طرح محدثین کرامؒ نے فرمایا ہے۔

اور مظاہر حق ج ۱ ص ۱۹ میں بعینہٖ یہ مضمون مذکور ہے:

شرح مسند امام ابو حنیفہؒ میں ہے:

والاتباع کما یکون فی الفعل یکون فی الترک فمن واظب علیٰ مالم یفعل الشارع صلی اللہ علیہ وسلم فھو مبتدع لشمول قولہ صلی اللہ علیہ وسلم من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو ردّ۔ (انتہی) (مواہب لطیفہ شرح مسند ابی حنیفہؒ بحث تلفظ بالنیۃ)	اتباع جیسے فعل میں ہے اسی طرح ترک میں بھی ہے۔ سو جس نے ایسے فعل پر مواظبت کی جس شارع علیہ السلام نے نہیں کیا تو وہ مبتدع ہوگا۔ کیونکہ اس کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ قول شامل ہے کہ جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا ثبوت نہیں تو وہ مردود ہوگا۔

امام علامہ السید جمال الدین المحدث (المتوفی سنہ) فرماتے ہیں:

ترکہ صلی اللہ علیہ وسلم سنۃ کما ان فعلہ سنۃ۔ (مواہب لطیفہ بحث مذکور)۔ (الجنہ[1] ص ۱۴۳)۔	آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز اور کام کو ترک کرنا بھی سنت ہے جیسا کہ آپ کا فعل سنت ہے۔

ان تمام عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی کام کو نہ کرنا ایسا ہی سنت ہے جیسا کہ آپ کا کسی کام کو کرنا سنت ہے۔ اور جو شخص آپ کی اس سنت پر عمل نہیں کرتا، وہ محدثین کرامؒ کی تصریح کے مطابق بدعتی ہوگا۔ اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں، کہ وہ تمام کام جو اہل بدعت کرتے ہیں ان کے دواعی اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وقت بھی موجود تھے مگر آپ نے ان کو ترک کیا ہے اور آپ کا ان کو ترک کرنا سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے۔

---

[1] الجنہ لاصحاب السنۃ مؤلفہ مولانا عبد الغنی خان صاحب صدر مدرس مدرسہ عین العلم شاہجہان پور جس پر حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ کی بلند پایہ اور گراں قدر تقریظ موجود ہے۔ اس کتاب میں جہاں بھی الجنہ کا حوالہ آئے گا اس سے یہی کتاب مراد ہوگی۔ بڑی بہترین کتاب ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ دعا میں سجع سے بچو، کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام دعا میں سجع نہیں کیا کرتے تھے (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۳۸)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ:

ان رفعکم ایدیکم بدعة مازاد رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم علیٰ هذا یعنی الی الصّدر (مسند احمد ج ۲ ص ۶۱)۔

تمہارے (اس طرح) ہاتھ اٹھانے بدعت ہیں کیونکہ آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے سینۂ مبارک سے اُوپر ہاتھ نہیں اُٹھائے۔[له]

حضرت عمارہؓ بن رویبہ (المتوفی سـ۔ھ) نے بشر بن مروان کو منبر پر دونوں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے دیکھا، تو سخت لہجہ میں یوں ارشاد فرمایا کہ:

قبّح اللّٰه هاتین الیدین لقد رأیت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم مایزید علیٰ ان یقول هکذا بیدہٖ واشار باصبعه المسبحة (مسلم ج ۱ ص ۲۸۷)

اللہ تعالیٰ ان دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا ناس کرے میں نے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اشارہ کی انگلی سے زیادہ اُٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا (اور یہ دونوں ہاتھ اُٹھا رہا ہے)۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابنِ عباسؓ، حضرت ابنِ عمرؓ اور حضرت عمارہؓ بن رویبہ تینوں جلیل القدر صحابی ہیں اور وہ ایسے اُمور کا سختی سے ردّ فرما رہے ہیں جو آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے ثابت نہیں۔ اور ابنِ عباسؓ دعا میں سجع کرنے سے صرف اس لئے منع کرتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور آپ کے حضرات صحابۂ کرامؓ نے ایسا نہیں کیا۔ اگرچہ دعا اپنے مقام پر ایک بہت بڑی عبادت ہے لیکن بقید سجع محض اس لئے منع ہے کہ آپ سے اور آپ کے صحابۂ کرامؓ سے ایسا ثابت نہیں۔ اور حضرت ابنِ عمرؓ یہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دُعا میں ہاتھ اُٹھانے ثابت ہیں مگر صرف سینۂ مبارک تک ہی، اور تم لوگ سینہ سے اُوپر اُٹھا کر آپ کے عمل کے خلاف کرتے ہو، لہٰذا یہ فعل بدعت ہے۔ اور حضرت عمارہؓ بن رویبہ بشر بن مروان کے لئے قبّح اللّٰه الخ کے سنگین الفاظ سے صرف

له یعنی عام دعا میں کیونکہ استسقاء وغیرہ کی مخصوص ادعیہ اس سے مستثنیٰ ہیں دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۳۱ وقال متفق علیہ۔

اس لئے بددعا کرتے ہیں کہ آپ کے عمل پر اس نے زیادتی کی ہے جو ہر حالت میں قابلِ ملامت ہے۔

غور تو کیجئے کہ کس طرح یہ اکابر آپ کے عمل پر زیادتی کو اور تغیر ہیئت اور کیفیت کو بدعت قرار دیتے اور اس سے منع کرتے ہیں علامہ سدید الدین کاشغری الحنفیؒ (المتوفی فی حدود ۷۰۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

والزیادۃ علیٰ ثمان رکعات لیلاً و علیٰ اربع رکعات نہاراً مکروہ بالاجماع۔ (منیۃ المصلی ص۱۰۲)

رات کے وقت آٹھ رکعات سے زیادہ اور دن کے وقت چار رکعات سے زیادہ ایک سلام کے ساتھ نفلی نماز پڑھنا آئمہ احنافؒ کے اجماع سے مکروہ ہے۔

اور نہر الفائق میں اس کی تصریح ہے کہ مکروہ تحریمی ہے۔ حضرات فقہاء احنافؒ نے اس کی دلیل یہ پیش کی ہے: لعدم ورود الاثر بہ۔ اس لئے مکروہ ہے کہ اس کے لئے کوئی اثر اور دلیل موجود نہیں ہے اور ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفیؒ (المتوفی ۵۸۷ھ) بعض فقہاء کرام سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں یکرہ لان الزیادۃ علیٰ ھذا لم ترو عن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الخ (البدائع والصنائع ج۱ ص۲۹۵) یعنی یہ اس لئے مکروہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس سے زیادہ مروی نہیں ہے۔ اور صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ:

ودلیل الکراھۃ انہ علیہ السلام لم یزد علیٰ ذٰلک ولولا الکراھۃ لزاد تعلیما للجواز (ہدایہ ج۱ ص۱۲۷)

کراہت کی دلیل یہ ہے کہ آپؐ سے زیادت منقول نہیں اگر کراہت نہ ہوتی تو آپ تعلیم جواز کیلئے زیادہ بھی کر دیتے۔

فتاویٰ کبیریٰ، درمختار، فتاویٰ عجیب، فتاویٰ ابراہیم شاہی اور کنز العباد شرح اوراد میں ہے کہ:

یکرہ الدعاء عند ختم القراٰن فی شہر رمضان وعند ختم القراٰن بجماعۃ لان ھذا لم ینقل عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم ولا عن الصحابۃؓ (بحوالہ الجنۃ ص۱۴۲)

رمضان میں ختم قرآن کے وقت دعا کرنا اور اسی طرح ختمِ قرآن کے وقت مل کر دعا کرنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ سے ایسا کرنا منقول نہیں ہے۔

دیکھا آپ نے کہ حضرات فقہاء کرامؒ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کے عدمِ فعل کو ایک مستقل قاعدہ اور ضابطہ سمجھ کر متعدد مقامات میں اس سے استدلال کیا ہے۔ مزید چند

حوالہ جات اور سن لیجئے:

الامام المحقق المدقق علی بن ابی بکر الحنفیؒ صاحب ہدایہ (المتوفی ۵۹۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

ویکرہ ان یتنفل بعد طلوع الفجر باکثر من رکعتی الفجر لانہ علیہ السلام لم یزد علیہما مع حرصہ علی الصلوٰۃ۔ (ہدایہ جلد ۱ ص۷۱)

طلوعِ فجر کے بعد فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کوئی زاید (نفلی) نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود نماز پر حریص ہونے کے اس سے زیادہ نماز نہیں پڑھی۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ شیخ الاسلامؒ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدمِ فعل کو کراہت کی دلیل بنایا ہے حالانکہ اس موقع پر نفلی نماز کے ترک کرنے پر صاحبِ ہدایہ کی رائے میں کوئی صریح نہی موجود نہیں ہے۔ اور باوجود اسکے حضرات فقہاء احنافؒ کے وکیل "صاحبِ ہدایہ" اسکو بُرا اور مکروہ کہتے ہیں اسلیے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں اور اگر حدیث لا صلوٰۃ بعد الفجر الا سجدتین (جو نصب الرایہ ج۱ ص۲۵۵ وغیرہ میں ہے) صحت کے ساتھ ثابت ہوجائے تو نورٌ علیٰ نور ممانعت قولاً وفعلاً ثابت ہوجائے گی۔ ایک دوسرے موقع پر صاحبِ ہدایہ یوں لکھتے ہیں:

ولیس فی الکسوف خطبۃ لانہ لم یُنقل۔ (ہدایہ ج۱ ص۱۵۶)

صلوٰۃ کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ خطبہ منقول نہیں ہے۔ جو صلوٰۃ کسوف کے لیے شرط ہو جو خطبہ منقول ہے وہ ایک وہم کے ازالہ کیلئے تھا۔

دیکھیے صاحبِ ہدایہ عدمِ نقل کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرماتے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، اس لئے یہ ممنوع اور منہی عنہ ہے۔ اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ:

ولا یتنفل فی المصلّٰی قبل صلوٰۃ العید لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یفعل ذٰلک مع حرصہ علی الصلوٰۃ ثم قیل الکراھۃ فی المصلّٰی خاصۃ وقیل فیہ و فی غیرہ عامۃ لانہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یفعلہ۔ (ہدایہ جلد ۱ ص۱۵۳)

اور عیدگاہ میں نمازِ عید سے پہلے نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود نماز پر حریص ہونے کے ایسا نہیں کیا۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت عیدگاہ کے ساتھ خاص ہے، یہ بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عیدگاہ اور غیر عیدگاہ دونوں میں کراہت ہوگی، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عیدگاہ وغیر عیدگاہ دونوں میں نماز نہیں پڑھی۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ صاحبِ ہدایہ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدمِ فعل کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش کیا ہے حالانکہ صراحۃً مرفوع حدیث سے نہی اس پر پیش کرنا ایک طرف رہا کہ آپ نے عید گاہ میں، یا عید کے دن کسی دوسری جگہ نفل پڑھنے سے علی الخصوص منع کیا ہے۔ مؤلف انوارِ ساطعہ اور مفتی احمد یار خان صاحب کے نزدیک اس فعل کو بُرا اور مکروہ نہیں ہونا چاہیئے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہی اس پر موجود نہیں ہے۔

علامہ ابراہیم حلبی الحنفیؒ (المتوفی ۹۵۶ھ) نے صلوٰۃ رغائب (جو رجب میں پڑھی جاتی ہے) وغیرہ کے بدعت اور مکروہ ہونے کی یہ دلیل پیش کی ہے:

ان الصحابة والتابعين و من بعدهم من الائمة المجتهدين لم ينقل عنهم (کبیری ص۴۳۳)	کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور بعد کے ائمہ مجتہدین سے یہ منقول نہیں ہے۔

مشہور حنفی امام احمد بن محمدؒ جو احد الفقہاء الکبار تھے (المتوفی ۴۴۶ھ) ایک مسئلہ کی تحقیق میں یوں ارقام فرماتے ہیں:

لانها بدعة لم تنقل عن الصّحابة والتابعين۔ (الواقعات)	یہ بدعت ہے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے منقول نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی مستند ترین کتاب محیط اور فتاویٰ عالمگیری سے کون مسلمان ناواقف ہوگا؟ ان میں صراحت سے یہ لکھا ہے:

قرأة الكافرون الى الاخر مع الجمع مكروهة لانها بدعة لم ينقل ذٰلك عن الصّحابة والتابعين (عالمگیری باب الکراہت ص۲۶۴ جلد ۴)	سورۂ کافرون کا آخر تک بالجمع پڑھنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ وہ بدعت ہے، حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے منقول نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی صحیح روایت نہیں پیش کی جا سکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ صلاۃ رغائب پر آپ کی نہی موجود ہے اور سورۂ کافرون کو آخر تک بالجمع پڑھنے سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ لیکن حضرات فقہاء احناف اس کو مکروہ بھی کہتے ہیں اور بدعت بھی۔ اور دلیل صرف اتنی ہی پیش

کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ سے منقول نہیں ہے۔ اگرچہ ان پر صریح نہی بھی موجود نہیں ہے۔ مولوی عبدالسمیع صاحب وغیرہ کے خود ساختہ اور خود تراشیدہ قاعدہ کے رُو سے ان اشیاء کو بدعت اور مکروہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ان میں صریح نہی موجود نہیں ہے۔ دیکھئے اب مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ ان حضرات فقہاء احنافؒ کی بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے حنفی ہونے کا ثبوت دیتے ہیں یا صرف اسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔ ان عبارات میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا خصوصیت سے حضرات فقہاء احنافؒ نے ذکر کیا ہے کہ چونکہ یہ یہ کام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین سے منقول نہیں لہذا بدعت ہے۔ مفتی صاحب کو اپنی یہ عبارت دیکھ کر کہ "بدعت وہ کام ہے جو حضور علیہ السلام کے بعد پیدا ہوا اس میں صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا ذکر نہیں" (جاء الحق ص۲۱۵) حق کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ خدا توفیق دے مرقات اور اشعۃ اللمعات وغیرہ میں سنۃ الخلفاء الراشدینؓ ما انا علیہ واصحابی اور خیر القرون کی حدیثیں بھی بغور دیکھ لیں کہ کیا حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی بات کو تسلیم کرنا سنّت ہے یا بدعت؟ فیصلہ انہی پر ہے۔ (بہارِ شریعت حصہ چہارم ص۳۲ میں ہے شب قدر میں جماعت کے ساتھ نماز نفل بعض لوگ ادا کرتے ہیں۔ فقہاء اسے ناجائز و مکروہ و بدعت کہتے ہیں اور لوگ اس بارے میں جو حدیث بیان کرتے ہیں محدثینؒ اسے موضوع بتلاتے ہیں الخ)

حق بات جانتے ہیں مگر مانتے نہیں — ضد ہے جناب شیخ تقدس مآب میں

بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی تحقیق

نہایت مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی قدرے وضاحت کر دی جائے تاکہ کسی کوتاہ فہم اور اہلِ فریب کو اس سے غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اور اگر ہو چکی ہے تو بشرطِ انصاف زائل ہو جائے۔

بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ لغوی بدعت اور شرعی بدعت۔ لغوی بدعت ہر اُس نو ایجاد کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہوئی ہو، عام اس سے کہ وہ عبادت ہو یا عادت۔ اور اس کی پانچ قسمیں ہیں۔ واجب، مندوب، حرام، مکروہ، مباح۔ اور شرعی بدعت وہ ہے جو قرونِ ثلاثہ کے بعد پیدا ہوئی ہو اور اُس پر قولاً فعلاً، صراحۃً اور اشارۃً کسی طرح بھی شارع کی طرف سے اجازت موجود نہ ہو۔ یہی وہ بدعت ہے جس کو بدعت ضلالۃ اور بدعتِ قبیحہ

اور بدعتِ سیئہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ان البدعة علیٰ قسمين بدعة لغوية و بدعة شرعية فالاول هو المحدث مطلقاً عادةً كانت او عبادةً وهى التى يقسمونها الى الاقسام الخمسة والثانى وهو ما زيد علىٰ ما شرع من حيث الطاعة بعد انقراض الازمنة الثلاثة بغير اذن من الشارع لا قولاً ولا فعلاً ولا صريحاً ولا اشارةً وهى المراد بالبدعة المحكوم عليها بالضلالة۔ (ترویح الجنان ص— والجنہ ص۱۶۱)

بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لغوی بدعت، اور دوسری شرعی بدعت۔ لغوی بدعت ہر نو ایجاد کا نام ہے جو عبادت یا عادت، اور اسی بدعت کی پانچ قسمیں کی جاتی ہیں اور دوسری وہ بدعت ہے جو طاعت کی مد میں کسی مشروع امر پر زیادت (یا کمی) کی جائے مگر ہو قرونِ ثلاثہ کے ختم ہونے کے بعد اور یہ زیادتی شارع کے اذن سے نہ ہو، نہ اس پر شارع کا قول موجود ہو اور نہ فعل نہ صراحت اور نہ اشارہ، اور بدعتِ ضلالہ سے یہی مراد ہے۔

بدعتِ حسنہ اور قبیحہ کی مزید بحث کے لئے ارشاد السّاری ج ۳ ص۴۴۳، عمدۃ القاری ج ۵ ص۳۵۶ نووی شرح مسلم ج ۱ ص۲۸۵ اور مدخل ج ۲ ص۲۵۷ وغیرہ کتابوں کی طرف مراجعت کریں۔

حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ:

والتحقيق انها ان كانت مما تندرج تحت مستحسن فى الشرع فهى حسنة وان كانت مما تندرج تحت مستقبح فى الشرع فهى مستقبحة والا فهى من قسم المباح وقد تنقسم الى الاحكام الخمسة (فتح الباری ج۴ ص۲۱۹)

تحقیق یہ ہے کہ اگر بدعت، شریعت کی کسی پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے تو وہ بدعت حسنہ ہوگی اور اگر وہ شریعت کی کسی غیر پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے تو وہ بدعتِ قبیحہ ہوگی، ورنہ مباح ہوگی اور بدعت پانچ احکام کی طرف منقسم ہے۔

اسی کے قریب قریب عبارت علامہ عینیؒ کی ہے۔ ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ج ۵ ص۳۵۶۔

اب اس بات پر غور کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ مستحسن فی الشّرع کیا ہے اور مستقبح فی الشّرع کیا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ (المتوفّٰی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

البدعة بدعتان بدعة خالفت کتابا او سنة او اجماعا او اثراً عن بعض اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فھذہ بدعة ضلالة وبدعة لم تخالف شیئا من ذٰلك فھذہ قد تکون حسنة لقول عمرؓ نعمت البدعة ھٰذہ۔

بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ بدعت ہے جو کتاب یا سنّت یا اجماع یا کسی صحابی کے اثر کے مخالف ہو ایسی بدعت گمراہی ہے اور دوسری بدعت وہ ہے جو ان میں سے کسی ایک کے مخالف نہ ہو تو ایسی بدعت کبھی اچھی ہوتی ہے جیسے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یہ کیا ہی اچھی نو ایجاد اور بدعت ہے۔

(موافقۃ صریح المعقول الصحیح المنقول لابن تیمیہؒ علیٰ منہاج السنۃ ج ۲ ص ۱۲۸)

اس کی پوری تحقیق قارئین کرام نے پڑھ لی ہے کہ مخالفت جیسے قول میں ہوتی ہے، اسی طرح فعل میں بھی مخالفت ہوتی ہے۔ جو کام آنحضرت صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود دواعی، واسباب کے ترک کیا اور خیر القرون نے بھی اُسے ترک کیا تو وہ یقیناً بدعت اور ضلالت ہوگا۔ کیونکہ وہ کتاب وسنّت اور اجماعِ خیر القرون اور قیاس صحیح کے مخالف ہے، اور جو ان میں سے کسی دلیل میں داخل ہو تو وہ کبھی اچھا ہوگا، جس پر ثواب ملے گا اور کبھی صرف مباح ہوگا جس پر نہ ثواب ہوگا نہ عذاب۔

قیاس کی بحث میں مجالس الابرار کا حوالہ اور مذکورہ بالا عبارتیں پیش نظر رکھ کر بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیّئہ کی تعریف یوں ہوگی:۔ بدعتِ حسنہ وہ دینی کام جس کا مانع آنحضرت صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد زائل ہوگیا ہو، یا اس کا داعیہ، محرک اور سبب بعد کو پیش آیا ہو اور کتاب وسنّت اور اجماع و قیاس سے اس پر روشنی پڑتی ہو اور ان میں سے کسی دلیل سے اس کا ثبوت ملتا ہو تو وہ بدعتِ حسنہ اور بالفاظِ دیگر لغوی بدعت ہوگی جو مذموم نہیں ہے۔ علامہ ابن رجبؒ وغیرہ کی عبارتیں نقل کی جاچکی ہیں جو اس پر صراحت سے دلالت کرتی ہیں۔ اور جس چیز کا محرّک اور داعیہ اور سبب آنحضرت صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں موجود تھا مگر آپ نے وہ دینی کام نہیں کیا اور حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ نے بھی باوجود کمال عشق ومحبّت اور محرّکات و اسباب کے نہیں کیا تو وہ کام بدعتِ قبیحہ اور بدعتِ سیّئہ اور بدعتِ شرعیہ کہلائے گا جو ہر حالت میں مذموم اور ضلالت و گمراہی ہوگا۔ باقی غیر مجتہد کا اجتہاد خصوصاً اس زمانہ میں ہرگز کسی بدعت کو حسنہ نہیں قرار دے سکتا۔ چنانچہ حضرات فقہاء کرامؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

"در نصاب الفقہ می آرد ہر آنچہ بدعتِ حسنہ مجتہداں قرار دادہ اند ہماں صحیح است و اگر کسے دریں زمانہ چیزے بدعتِ حسنہ قرار دہد خلاف است زیرا کہ در مصفّٰی میگوید کہ کُلّ بدعة ضلالة فی زماننا" (انتہٰی) (فتاویٰ جامع الروایات - والجُنہ ص۶) - یعنی نصاب الفقہ میں ہے کہ بدعتِ حسنہ وہ ہے جس کو حضرات مجتہدینؒ نے بدعتِ حسنہ قرار دیا ہو - اور اگر کوئی شخص اس زمانہ میں کسی چیز کو بدعتِ حسنہ قرار دے گا تو وہ حق کے خلاف ہے کیونکہ مصفّٰی میں ہے کہ ہمارے زمانہ میں ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس عبارت سے صراحت کے ساتھ یہ بات واضح ہو گئی کہ بدعتِ حسنہ صرف وہی ہو گی، جس میں حضرات مجتہدینؒ کا اجتہاد کار فرما ہو گا، اور اجتہاد و قیاس صرف اُن احکام اور مسائل میں ہی ہو سکتا ہے جو غیر منصوص ہوں اور ان کے دواعی اور اسباب آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور خیر القرون میں موجود نہ ہوں بلکہ بعد کو ظہور پذیر ہوئے ہوں - اس نئی تہذیب کے زمانہ میں جو شخص بدعت کو حسنہ قرار دیتا ہے، اس کا قول سراسر باطل اور مردود ہے - اور ایسی چیز کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سہ

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں   نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اور یہی وہ بدعت ہے جس کے متعلق حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ (وغیرہ) فرماتے ہیں کہ "چیزے کہ مردود باشد حُسن از کجا پیدا کند" (مکتوبات حصّہ سوم ص۷) یعنی جو چیز مردود ہے وہ حُسن اور خوبی کہاں سے پیدا کرے گی؟

مفتی احمد یار خان صاحب کی تعلّی مفتی احمد یار خان صاحب نے تمام بدعاتِ سیّئہ کو بدعاتِ حسنہ قرار دے کر اور بزعمِ خود اس کارروائی پر مرقات اور اشعۃ اللمعات کی مجمل عبارتوں سے دلائل پیش کر کے یہ مورچہ ایسا فتح کیا کہ فاتحانہ بلکہ حاکمانہ رنگ میں یوں فرماتے ہیں کہ "دنیا کا کوئی دیوبندی کوئی غیر مقلد اور کوئی شرک و بدعت کی رٹ لگانے والا ان چار چیزوں (بدعت، شرک، دین اور عبادت) کی تعریف ایسی نہیں کر سکتا جس سے اس کا مذہب بچ جائے - آج بھی ہر دیوبندی اور ہر غیر مقلد کو اعلانِ عام ہے کہ ان کی ایسی صحیح تعریف کرو جس سے محفل میلاد حرام ہو" - (بلفظہ، جاء الحق ص۲۱۳) -

عرض کیا جاچکا ہے کہ باوجود محرّک اور سبب کے کسی کام کا خیر القرون میں نہ ہونا اور اس کا ترک کرنا سنّت ہے۔ اور سنّت کی مخالفت بدعت بھی ہے اور گمراہی بھی۔ مفتی صاحب ہی بتائیں کہ خیر القرون میں میلاد کس نے منائی؟ فیصلہ انہی پر ہے۔ بدعت کی تعریف تو اس کتاب میں ملاحظہ کرلیں، جس سے بخوبی واضح ہوگیا کہ اکابرینِ علماء دیوبند کے کسی کام کو بدعت کے ساتھ دُور کی نسبت بھی نہیں ہے' اور شرک اور عبادت وغیرہ کی تعریف راقم الحروف کے رسالہ گلدستۂ توحید وغیرہ میں ملاحظہ کیجئے' اور اپنی خاص محفل میں تو خوب تعلّی کا اظہار کیجئے، مگر میدان میں تعلّی کا کوئی کام نہیں۔ آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں اور بقول شیخ مصلح الدین سعدی (المتوفّی ۶۹۱ھ) ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست　　　شاید کہ پلنگ خُفتہ باشد

فائدہ: یہ تحقیق ان حضرات کے نظریے کے مطابق ہے جو بدعت کی تقسیم کے قائل ہیں، اور جو حضرات اس تقسیم کے قائل نہیں (مثلاً حضرت مجدّد الف ثانیؒ وغیرہ) تو وہ بدعتِ حَسنہ کو سنّت میں داخل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نزاع صرف لفظی ہوگا جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالسّمیع صاحب لکھتے ہیں:

"یہ کہ (جو) بدعت کی تقسیم نہیں کرتے وہ بدعت حَسنہ کو سُنّت میں داخل کرتے ہیں پس بدعتِ حَسنہ کا لفظ وہی کہے گا جو تقسیم بدعت کا قائل ہوگا۔ اور جو تقسیم کا قائل نہ ہوگا وہ بدعتِ حَسنہ کو سنّت کہے گا۔" (انوار ساطعہ ص۴۵)

باب سوم

بدعات کے جواز پر جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں اُن پر ایک نظر

دیگر اہل بدعت حضرات عموماً اور مفتی احمد یار خان صاحب خصوصاً لا تسئلوا عن اشیاء (الآیۃ) اور قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا (الآیۃ) نقل کر کے لکھتے ہیں۔ "نیز فرماتا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ (اطل میں مَنْ حَرَّمَ ہے) زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الآیۃ) ان آیات سے معلوم ہوا کہ حُرمت کی دلیل نہ ملنا حلال ہونے کی دلیل ہے نہ کہ حرام ہونے کی۔ یہ حضرات اس سے حُرمت ثابت کرتے ہیں الخ" (جاء الحق ص۲۱۹)۔ ان آیات سے بدعات کے جواز پر تو ہرگز ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا جیسا کہ ظاہر ہے۔ مگر مرکزی نقطہ ان آیات سے اباحت کا سمجھا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔

کیا اصل اشیاء میں اباحت ہے؟ اکثر مبتدعین حضرات بدعات کے جواز پر ان آیات سے غلط مفہوم اخذ کر کے یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ چونکہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اس لئے یہ کام جائز اور مُباح ہیں، اور اسی قاعدہ پر وہ بے شمار بدعات کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبد السمیع صاحب چند احادیث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ "ان احادیث سے علماء نے ایک اصلِ عظیم پیدا کی ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے"۔ (انوارِ ساطعہ ص۳۶)۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں "نہایت ضروری جو حضرات کہ ہر بدعت یعنی کام کو حرام جانتے ہیں وہ اس قاعدہ کُلّیہ کے کیا معنی کریں گے کہ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ۔ "تمام چیزوں کی اصل یہ ہے کہ وہ مُباح ہیں یعنی ہر چیز مباح اور حلال ہے"۔ پھر

آگے شامی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: المختار ان الاصل الاباحة عند الجمهور من الحنفية والشافعية ۔ جمہور حنفی اور شافعی کے نزدیک یہ ہی مسئلہ ہے کہ اصل مباح ہوتا ہے۔" (جاء الحق ص۲۱۸ و راجع صنہ۳۰)۔

جواب: قطع نظر اس سے کہ بعض محقّقین کے نزدیک قاعدہ کلیہ صرف یہ ہے ان لا کلیة اور اس سے بھی صرفِ نظر کر لیجئے کہ ہر بدعت حرام ہی نہیں ہوتی بلکہ بعض بدعتیں مکروہ بھی ہوتی ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اباحتِ اصلیہ کا کیا مفہوم ہے اور احادیث سے اس پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ اور کیا یہ قاعدہ حضرات فقہاء کرامؒ کا اتفاقی اور طے شدہ ہے یا اس میں بھی اختلاف ہے؟ اور راجح مسلک کے رُو سے یہ کس گروہ کا مسلک ہے؟ اور یہ اختلاف ورُودِ شرع سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ نہایت متانت اور سنجیدگی سے ان اُمور پر غور کرنا ہے۔ اولاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلّی الله علیه وسلم الامر ثلثة امر بیّن رشده فاتبعه وامر بیّن غیّه فاجتنبه وامر اختلف فیه فَکِلْهُ اِلَی اللّٰهِ عزّ وجلّ۔ (رواه احمد۔ مشکوٰة ج۱ ص۳۱)

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کام تین قسم کے ہیں: ایک وہ کہ اس کا ہدایت ہونا واضح ہو سو اسکی اتباع کرو اور دوسرا وہ کام ہے کہ اسکی گمراہی ظاہر ہو سو اس سے اجتناب کرو۔ اور تیسرا وہ جس میں اشتباہ واقع ہو سو اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دو۔

اس روایت کے آخری جملہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس معاملہ کا حکم مخفی ہو اور اس میں اشتباہ ہو تو ایسے معاملہ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر کے اُس میں توقّف کرنا چاہیئے، نہ یہ کہ اس کے ساتھ مباح کا سا معاملہ ہو۔ چنانچہ علامہ طیبی الحنفیؒ (المتوفّٰی ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں:

وما لم یثبت حکمه بالشرع فلا تقل فیه شیئا وفوّض امره الی الله۔

کہ جس چیز کا حکم شرع سے ثابت نہ ہو تو اس میں تم کچھ بھی نہ کہو اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔

اور حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ فَکِلْهُ اِلَی اللّٰهِ کی شرح میں لکھتے ہیں:

پس بسپار او را بخدا و توقّف کن در آں۔ سو اس کو تم خدا تعالیٰ کے حوالے کر دو، اور

(اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۹۷) اس میں توقف کرو۔

اس حدیث اور اس کی شرح سے بخوبی علم ہوگیا کہ جس چیز کا حکم شرع سے ثابت نہ ہو اس میں توقف کیا جائے گا اور اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ نہ یہ کہ اس کو مباح سمجھ کر اس پر جواز کا فتویٰ صادر کیا جائے گا۔ اور حضرت ابو ثعلبۃ الخشنیؓ (المتوفی ۷۵ھ) کی وہ روایت بھی اسی توقف کی دلیل ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا و حرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدوداً فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ (رواہ الدار قطنی ۔ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۲)	اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض متعین فرمائے ہیں سو ان کو مت ضائع کرو۔ اور کچھ چیزوں کو حرام کر دیا ہے سو ان کی پردہ دری مت کرو۔ اور کچھ حدود مقرر کئے ہیں سو ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے بغیر نسیان کے سکوت کیا ہے سو ان سے بحث نہ کرو۔

یہ روایت بھی توقف کی دلیل ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ باقی رہی وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ تو اس حدیث سے بھی توقف ہی مراد ہے۔ اس سے اباحت کا اثبات درست نہیں ہے کما لا یخفیٰ۔

مشہور امام علاء الدین محمد بن علی الحصکفی الحنفیؒ (المتوفی ۱۰۸۸ھ) لکھتے ہیں :

علی ما ھو المنصور من ان الاصل فی الاشیاء التوقف۔ (درمختار ج ۱ ص ۷۲)	یعنی منصور مسلک یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے۔

اور طوالع الانوار حاشیۂ درِّ مختار میں اسی موقع پر ہے :

علی ما ھو المنصور ای المؤید بالادلۃ القویۃ من ان الاصل فی الاشیاء التوقف فلا یعرف اباحۃ المباح الا بقولہ وفعلہ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔	یعنی جس مسلک کی تائید قوی دلائل سے ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے۔ سو مباح کی اباحت بھی جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے سوا معلوم نہیں ہو سکتی۔

اور یہی مضمون اس موقع پر طحطاوی حاشیۂ درمختار میں بھی ہے۔

اور تعلیقاتِ شرح منار میں ہے :

قال اصحابنا الاصل فیھا التوقف الخ ھذا اصح شیئ عندی فی ھذا الباب لان التوقّف اصل التقوی فی الامر المسکوت عنہ وھو مذھب ابی بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ و اشباھھم من الصّحابۃؓ والصّحیح ان الاصل فی الافعال التحریم وھو مذھب علیؓ وائمۃ اھل البیت ومذھب الکوفیین منھم ابوحنیفۃؒ ۔ (بحوالہ الجنہ ص۱۶۵)	اور ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ اصل اشیاء میں توقف ہے اور اس باب میں میرے نزدیک یہی صحیح ترین قول ہے کیونکہ جس چیز کے بارے میں شریعت کی طرف سے سکوت ہو اسمیں توقّف ہی اصل تقویٰ ہے اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور ان جیسے دیگر جلیل القدر حضرات صحابۂ کرامؓ کا یہی مذہب ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ اصل افعال میں حُرمت ہے، اور یہی حضرت علیؓ اور حضرات ائمہ اہلِ بیتؒ اور اہلِ کوفہ کا مسلک ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے ۔

لیجئے اس عبارت نے یہ آشکارا کر دیا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ میں سے تین حضرات اور اسی طرح دیگر جلیل القدر حضرات صحابۂ کرامؓ کا یہ مسلک ہے کہ اصل اشیاء میں توقّف ہے اور حضرت علیؓ اور اہلِ کوفہ کا جن میں خصوصیت سے حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں، یہ مسلک ہے کہ اصل اشیاء میں حُرمت ہے ۔

اور شیخ احمد المعروف بہ مُلّا جیون الحنفیؒ (المتوفی ۱۱۳۰ھ) لکھتے ہیں :

ان الاصل فی الاشیاء الاباحۃ کما ھو مذھب طائفۃ بخلاف الجمھور فان عندھم الاصل ھو الحرمۃ الی ان قال وعند الشافعی الاصل ھو الحرمۃ فی کل حال ۔ (تفسیر احمدی ص۱۰)	کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے جیسا کہ ایک گروہ کا مسلک ہے، جمہور اس کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اصل اشیاء میں حُرمت ہے اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اصل اشیاء میں بہرحال حرمت ہے ۔

اور مشہور اصولی اور محقّق عالم مُلّا محب اللہ بہاری الحنفیؒ (المتوفی ۱۱۱۹ھ) لکھتے ہیں :

الاباحۃ حکم شرعی لانہ خطاب الشرع تخییراً ۔ (مسلّم الثبوت ص۲۵) ۔	اباحت حکمِ شرعی ہے کیونکہ اباحت شرع کا خطاب ہے جس میں کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ۔

اور علامہ ابن رُشدؒ لکھتے ہیں :

ومختلف فیہ وھو المباح (بدایۃ المجتہد ج ۱ صـ۴)۔ جس کے کرنے نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، وہ مباح ہے۔

اور ملا مبین شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ:

المباح ما اذن الشارع بالتخییر بین فعلہ وترکہ۔ مباح وہ ہے جس میں شارع نے اس کے کرنے اور نہ کرنے میں اختیار دیا ہو۔

امام محمد بن محمد الغزالیؒ (المتوفی ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

وحد المباح انہ الذی ورد الاذن من اللہ تعالیٰ بفعلہ وترکہ غیر مقرون بذم فاعلہ ومدحہ ولا بذم تارکہ ومدحہ۔ (المستصفیٰ ج ۱ صـ۶۶)۔ مباح کی تعریف یہ ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کرنے اور چھوڑنے کا اذن دیا گیا ہو۔ نہ تو اس کے کرنے والے کی مذمت اور تعریف ہو، اور نہ چھوڑ دینے والے کی مذمت اور تعریف کی گئی ہو۔

ان تمام عبارات سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ مباح بھی ایک شرعی حکم ہے جس کے کرنے اور نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے۔ اور کسی مباح کی اباحت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بعض نے اصل اشیاء میں اباحت تسلیم کی ہے لیکن جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرات آئمہ اہل بیتؒ اور کوفہ کے فقہاءؒ و محدثینؒ اور خاص طور پر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ اصل اشیاء میں حرمت کے قائل ہیں اور باقی جمہور اصل اشیاء میں توقف کے قائل ہیں بلکہ صاحب درِ مختار نے صاف لکھا ہے کہ:

الصحیح من مذھب اھل السنۃ ان الاصل فی الاشیاء التوقف والاباحۃ رأی المعتزلۃ۔ (درّ مختار مجتبائی ج ۱ صـ۳۴۵)۔ اہلِ سنّت والجماعت کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے اور اباحت کا قول معتزلہ کا خیال اور رائے ہے۔

مفتی صاحب تو دوسروں سے اس قاعدہ کا معنیٰ دریافت کرتے تھے مگر اس عبارت کو سامنے رکھ کر انہیں سوچنا چاہیئے کہ اباحت کس کا مسلک ہے اور اس کے اختلافی ہونے میں تو شاید ہی کوئی کوڑمغز شک اور شبہ کرے گا۔ جب اصل ہی متفق علیہ نہیں تو اس پر قیاس کی دیوار رکھنا اور اس پر بدعات کی عمارت

کھڑی کرنا کیسے صحیح ہوگا؟ علاوہ بریں جو علماء اباحت کے قائل ہیں وہ بھی اموال اور نفوس میں فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ ملّا محبّ اللہ صاحبؒ اپنی بے نظیر اور دقیق کتاب میں فرماتے ہیں:

واما الخلاف المذکور بین اھل السنۃ ان اصل الافعال الاباحۃ کما ھو مختار اکثر الحنفیۃ والشافعیۃ او اصلھا الحظر کما ذھب الیہ غیرھم وقال صدر الاسلام الاباحۃ فی الاموال والحظر فی الانفس الخ (مسلم الثبوت ص۲۲)	بہرحال اہلِ سنّت والجماعت کے درمیان جو اختلاف مذکور ہے کہ اصل اشیاء اور افعال میں اباحت ہے جیسا کہ اکثر حنفیہؒ اور شافعیہؒ کا مختار مسلک ہے یا اصل ان میں منع ہے جیسا کہ دوسرے علماء کا مسلک ہے۔ امام صدرالاسلام نے یوں تطبیق دی ہے کہ اموال میں اباحت اصل ہے اور نفوس میں حظر اور منع اصل ہے۔

اس عبارت سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ سنّت والجماعت کا آپس میں اختلاف محض اباحت اور توقّف تک ہی محدود نہیں بلکہ اباحت اور حظر و منع کا اختلاف بھی ہے۔ اگر ایک گروہ اشیاء اور افعال کو اصل میں مباح کہتا ہے تو دوسرا ان کو اصل میں ممنوع اور محظور ٹھہراتا ہے اور امام صدرالاسلامؒ اموال اور نفوس میں فرق کرتے ہوئے اوّل کو اصل میں مباح اور ثانی کو محظور اور ممنوع قرار دیتے ہیں۔

وثانیاً جو حضرات اباحت اصلیہ کے اُصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے تتبّع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اُصول اُمورِ تعبدّیہ کے لئے نہیں بلکہ اُمورِ عادیہ کے لئے ہے۔ بالفاظ دیگر وہ معاملات میں تو اس قاعدہ کو قابلِ عمل بناتے ہیں لیکن عبادات میں اس پر عمل نہیں کرتے۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو نئی نئی عبادات کے ایجاد کرنے کا حق ہوگا اور وہ ایجاد کردہ عبادتیں اسی اُصول پر مباح اور درست ٹھہریں گی۔ مثلاً فرض کیجئے کہ کوئی بدعت پسند پانچ نمازوں کے علاوہ ایک چھٹی نماز ایجاد کرے اور اس کی ہر رکعت میں دو دو رکوع اور چار چار سجدے ایجاد کرے تو کیا اس اباحتِ اصلیہ کے قانون سے اس نو ایجاد نماز کو بھی جائز کہا جائے گا؟ الغرض اباحتِ اصلیہ کے قانون کو عبادت میں جاری کرنا سراسر جہالت ہے۔ چنانچہ علّامہ ابو اسحاق شاطبی غرناطیؒ (المتوفّی سنہ ۷۹۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا یصح ان یقال فیما فیہ تعبّد انہ مختلف فیہ علی قولین ھل ھو علی المنع ام ھو علی	اُمورِ تعبدّیہ کے متعلق یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ ممنوع الاصل ہیں یا مباح الاصل۔

الاباحة بل هو امر زائد على المنع لان التعبديات انما وضع الشارع فلا يقال فی صلوٰة سادسة مثلاً انها على الاباحة فللمكلف وضعها على احد القولين ليتعبد بها لله لانه باطل باطلاق۔ (الاعتصام ج ۱ ص۳۰)

(الغرض وہ اس اختلاف کے تحت نہیں ہیں) کیونکہ امورِ تعبدیہ کو شارع ہی نے مقرر کیا ہے۔ فرض کیجیے کہ اگر کوئی شخص چھٹی نماز ایجاد کرے تو اسکے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اباحتِ اصلیہ کے قول کی بنا پر یہ مباح اور جائز ہے اور مکلف کو اسکی ایجاد کا حق ہے کیونکہ یہ مطلقاً باطل ہے (ملخصاً)۔

اور علامہ عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب الحنبلیؒ (المتوفی ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں:

وان كان قد زاد فی العمل المشروع ما ليس بمشروع فزيادته مردودة عليه بمعنى انها لا تكون قربة ولا يثاب عليها ولكن تارة يبطل بها العمل من اصله فيكون مردوداً كمن زاد ركعة عمداً فی صلاته مثلاً وتارة لا يبطله ولا يرده من اصله كمن توضأ اربعا اربعا۔

(جامع العلوم والحکم ص۴۳)

کہ اگر کسی نے عملِ مشروع میں کوئی ایسی چیز زائد کر دی جو زیادت مشروع نہ تھی تو اس کی وہ زیادت مردود ہوگی بایں طور کہ وہ عبادت تصور نہ ہوگی اور اس کو اس پر ثواب نہ ملے گا لیکن کبھی اس زیادت کی وجہ سے سرے سے اصل عمل ہی باطل ہوجاتا ہے اور وہ اس اعتبار سے مردود ہے جیسے مثلاً کسی شخص نے عمداً نماز میں کوئی رکعت زائد کر دی۔ اور کبھی وہ عمل اصل سے تو باطل نہ ہوگا اور نہ اس معنی میں مردود ہوگا جیسے کوئی آدمی چار چار مرتبہ وضو کرے (مگر ایسا شخص ثواب کا اہل نہ ہوگا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس عملِ مشروع کا فعل یا ترک کی صورت میں شریعت نے ایک معیار قائم کر دیا ہے تو اس میں اپنی مرضی اور خواہش سے کوئی کمی یا زیادتی کرنا مردود ہوگا۔ اور اس زیادت کی وجہ سے کبھی تو سرے سے سارا عمل ہی مردود ہوجائے گا۔ اور کبھی بایں طور مردود ہوگا کہ اس پر ثواب نہ ملے گا۔ اور وہ قربت اور عبادت نہ ہوگا۔

وثالثاً حضرات فقہاء کرام کا یہ اختلاف کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حظر اور توقف، تو یہ وُرُودِ شرع سے قبل کا معاملہ ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دُنیا میں مبعوث ہونے سے قبل

ایک گروہ اشیاء و افعال میں اباحت کا قائل ہے اور ایک حرمت و حظر یا توقف کا (باستثنائے کفر کے کہ وہ ہر زمانہ میں حرام ہی رہا ہے) بالفاظ دیگر یہ اختلاف ہماری شریعت سے پہلے کا ہے نہ کہ شریعت کے اجراء کے بعد کا۔ شریعت نازل ہوچکنے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حُرمت و حظر یا توقف۔ کیونکہ ہر عبادت اور ہر معاملہ کی شریعت مطہرہ نے حدود اور قیود متعین کردی ہیں ان میں کمی و بیشی اور پس و پیش کرنا ہرگز صحیح اور درست نہیں ہے۔ لہٰذا اباحتِ اصلیہ کا قول بھی مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کو مفید نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ عبد العلی بحر العلوم الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۲۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

یظهر من تتبع کلامهم ان الخلاف قبل ورود الشرع۔	علماء کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف دُرودِ شرع سے قبل کا ہے۔

نیز وہ اسی مسئلہ کی محققانہ بحث کرتے ہوئے ایک علمی تمہید کے بعد فرماتے ہیں:

فاذاً لیس الخلاف الا فی زمان الفترة الذی اندرست فیه الشریعة بتقصیر من قبلهم وحاصله ان الذین جاؤ بعد اندراس الشریعة وجهل الاحکام فاما جهلهم هذا یکون عذراً فیعامل مع الافعال کلها معاملة المباح اعنی لا یؤاخذ بالفعل ولا بالترک کما فی المباح و ذهب الیه اکثر الحنفیة والشافعیة الی ان قال وانما هذا ای القول بالاباحة الاصلیة بناء علی زمان الفترة قبل شریعتنا یعنی اذلا اباحة حقیقة بل معنی نفی الحرج ولعل المراد من الافعال ماعدا الکفر ونحوه فان حرمتهما فی کل شرع	اس تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اختلاف زمانۂ فترۃ کے بارے میں ہے جس میں پہلے لوگوں کی کوتاہی کی وجہ سے شریعت مِٹ چکی تھی اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جو شریعت کے مٹ جانے کے بعد آئے اور احکام سے ان کو واقفیت نہ رہی تو ان کا جہل تصور عذر ہوگا اور سب افعال کے ساتھ مباح کا معاملہ کیا جائے گا یعنی نہ فعل پر ان کا مواخذہ ہوگا اور نہ ترک پر، جیسا کہ مباح کا حکم ہے اور یہی اکثر حنفیہؒ اور شافعیہؒ کا مسلک ہے۔ (پھر آگے فرمایا) اور یہ بات یعنی اباحتِ اصلیہ کا قول ہماری شریعت سے قبل زمانۂ فترۃ پر محمول ہے۔ اور اباحت بھی بایں معنی کہ حرج کوئی نہ ہوگا اور شاید کہ مراد افعال سے کفر وغیرہ کے علاوہ ہے۔ کیونکہ کفر وغیرہ کی حرمت ہر ایک شریعت میں واضح اور غیر مبہم طور پر بیان

بَیِّنٍ ظہوراً تاماً۔ (فواتح الرحموت ج ۱ ص ۴۹، ۵۰)   کی گئی ہے۔

اس عبارت سے یہ معاملہ بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ اکثر حضرات شافعیہؒ اور حنفیہؒ کا اباحتِ اصلیہ کے بارے میں جو مختار قول ہے وہ ورودِ شرع سے قبل کے متعلق ہے۔ ورودِ شرع کے بعد وہ اباحتِ اصلیہ کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب البدائع والصنائع میں اور خاص طور پر تلویح شرح توضیح میں اس کی تصریح کی ہے کہ یہ اختلاف قبل البعثت کا ہے۔ قبل الشرع اور قبل البعثت کے الفاظ خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ **الحاصل** : اشیاء میں اباحتِ اصلیہ کا قول حضرات فقہاء کرامؒ کا متفق علیہ قول نہیں بلکہ بقول صاحبِ درّ مختار یہ معتزلہ کا مذہب ہے، اہل السنّت کا نہیں اور اہل السنّت میں بھی بہت سے علماء کا قول توقّف بلکہ حظر بلکہ حُرمت کا ہے۔ اور وہ بھی عبادات سے نہیں بلکہ معاملات سے متعلق ہے پھر اباحتِ اصلیہ کا قول وُرُودِ شرع سے قبل کا ہے بعد کا نہیں۔ لہٰذا اس سے استدلال کر کے بدعات کی ترویج کرنا جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کر رہے ہیں، دینِ اسلام سے اعلیٰ درجہ کی خیانت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو اس سے بچائے۔ مگر مفتی صاحب اور ان کی پارٹی کو اس سے کیا تعلق؟ ان کا تو اپنا کام بنتا رہے، اسلام بگڑے یا سنورے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم ؎

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے   وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

مَنْ سنّ سنّۃً حسنۃً سے بدعات پر استدلال اور اس کا جواب | اکثر بدعت پسند حضرات اپنے مدعیٰ پر اس روایت کو بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ اس کو نقل کر کے اس کا جواب بھی دیا جائے حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ (ترجمہ مولوی عبد السمیع صاحب کا ہے)

من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فعمل بھا بعدہٗ کتب لہٗ مثل اجر من عمل بھا ولا ینقص من اجورھم شیئ۔ (مسلم ج ۲ ص ۳۴۱)

کہ جس نے جاری کیا اسلام میں طریقہ نیک پھر اس کے بعد اس طریقہ حسنہ پر عمل کیا گیا تو لکھا جاوے گا اس شخص کے واسطے اس قدر اجر اور ثواب کہ جس قدر سب عمل کرنے والوں کو اس کے بعد ہوگا اور اُن لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کاٹ کر اُس کو نہ دیں گے (انوار الساطعہ ص ۴۴)

جواب : اس روایت سے بدعات کی ترویج اور اُن کے جواز پر استدلال کرنا باطل اور مردود ہے۔

اولاً اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہؓ (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص۳۰) اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ (ملاحظہ ہو ہامش مشکوٰۃ ج ۱ ص۳۰) اور حضرت غضیف بن الحارث الثمالیؓ (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص۳۱) کی روایتوں میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من تمسک بسنتی جس نے میری سنّت سے تمسک کیا اور مضبوطی سے اس کو پکڑا، اور فرمایا: فتمسک بسُنّۃٍ خیر الخ کہ سنّت کے ساتھ تمسک کرنا بہتر ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ اُمّتی کا کام سنّت پر چلنا اور اس سے تمسک کرنا ہے، سنّت جاری کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ رہا حضرات خلفاء راشدینؓ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ اور خیر القرون کا معاملہ، تو محل نزاع سے خارج ہے، اور اس کی پوری بحث پہلے گذر چکی ہے۔

وثانیاً خود اسی روایت میں مَن سَن فی الاسلام الخ کے بجائے یہ الفاظ بھی آئے ہیں ایما داع دعا الیٰ ھدی کہ جس داعی نے ہدایت کی طرف دعوت دی (مسلم ج ۲ ص۳۴۱ وابن ماجہ ص۱۹ ومجمع الزوائد ج ۱ ص۱۶۸) اور اسی روایت کے دوسرے طریق میں ہے:

من احیا سنّۃ من سنّتی قد اُمیتَتْ بعدی (ابن ماجہ ص۱۹، ترمذی ج ۲ ص۹۲، مشکوٰۃ ج ۱ ص۳۰) — کہ جس نے میری کسی ایسی سنّت کو زندہ کیا جو میرے بعد مُردہ ہو چکی تھی۔

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے:

من احیا سنۃ من سنّتی فعمل بھا النّاس - الحدیث - (ابن ماجہ ص۱۹) — کہ جس نے میری سنّتوں میں سے کوئی سنّت زندہ کی کہ لوگ اس پر عمل پیرا ہوئے۔

اور نیز فرمایا:

من استن خیراً (ابن ماجہ ص۱۹) — کہ جو شخص کسی اچھے راستہ پر چلا۔

اور ایک روایت میں ہے:

من علم علما فلہ اجر من عمل بہ لا ینقص من اجر العامل (ابن ماجہ ص۲۱ ج) — جس نے کوئی علم سکھلایا تو اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا عمل کرنے والے کو اور اس کے اجر میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔

ان روایات سے اس مجمل روایت کی تفصیل اور تشریح ہو جاتی ہے کہ سنّت اور طریقہ کا جاری کرنا مراد

نہیں ہے بلکہ اس کی طرف دعوت دینا، اس کی تعلیم دینا، اس کو زندہ کرنا اور خود اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کرنا مراد ہے۔ اس سے یہ مطلب سمجھنا اور مراد لینا کہ از خود کسی سنّت کو جاری کرتا ہے یقیناً غلط ہے اور ان روایات کی صریح خلاف ورزی ہے۔

وثالثاً[۳] اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز کا شریعت میں دلالۃً واشارۃً ثبوت موجود ہو، اس کے اجراء کرنے میں ثواب ہوگا، اور وہ وہی فعل ہوگا جس کا داعیہ اور محرک خیر القرون میں موجود نہ ہو بلکہ بعد کو پیش آیا ہو اور ادلہ اربعہ میں سے کسی دلیل کے تحت وہ داخل ہو۔ چنانچہ اسی حدیث میں حسنۃً کی قید موجود ہے اور اہلِ سنّت کے نزدیک کسی امرِ شرعی میں حُسن یا قبح نہیں پایا جا سکتا جبتک کہ شریعت سے اس کا ثبوت نہ ہو۔ اور بدعات کی تو شریعت نے جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے، اس سے بھلا ان کا حسن ہونا کہاں سے اور کیسے ثابت ہوگا؟ الغرض اس روایت سے بدعات کے جواز پر استدلال کرنا محض جہالت اور شریعتِ مطہرہ سے خالص بغاوت ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کی ایک اور غلطی اکثر اہلِ بدعت ہر قسم کی بدعات کے جواز پر ایک حدیث پیش کیا کرتے ہیں جس کو مفتی احمد یار خان صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وقال علیه السلام ما رأه المسلمون حسنًا فهو عند الله حسن۔ (جاء الحق ص۲۰۱)	جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

اس روایت کو سامنے رکھ کر وہ جملہ بدعات کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسلمان ان کو اچھا سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوں گی، اور اچھے کام پر تو نہ گرفت ہوتی ہے اور نہ گناہ۔

اس روایت کے متعلق چند ضروری ابحاث ہیں جن کو سمجھنا نہایت ہی اہم ہے۔

اوّل[۱] بحث یہ ہے کہ اگرچہ بعض حضرات فقہائے کرامؒ نے اس روایت کو مرفوع بیان کیا ہے لیکن یہ روایت مرفوع نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود پر موقوف ہے۔ چنانچہ علامہ جمال الدین الزیلعی الحنفیؒ (المتوفی ۷۶۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولم اجده الا موقوفًا علی ابن مسعودؓ۔	میں نے اس روایت کو حضرت عبداللہؓ بن مسعود پر

(نصب الرایہ ج ۴ ص۱۳۳) موقوف ہی پایا ہے۔

اور مشہور محدث، علامہ الامام صلاح الدین ابوسعید العلائیؒ (المتوفی ۷۶۱ھ) فرماتے ہیں:

لم اجدہ مرفوعًا فی شیئ من کتب الحدیث اصلاً ولا بسند ضعیف بعد طول البحث وکثرۃ الکشف والسوال وانما ھو قول ابن مسعود موقوف علیہ (بحوالہ فتح الملہم ج ۲ ص۴۰۹)

میں نے اس روایت کو باوجود طویل بحث وتحیص اور زیادہ کھوج اور سوال کے حدیث کی کسی کتاب میں کسی ضعیف سند کے ساتھ بھی مرفوع نہیں پایا، بلکہ یہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا موقوف قول ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابی کا قول خصوصًا حضرت عبداللہؓ بن مسعود جیسے بارگاہِ نبوت میں معتمد علیہ کا، اپنے مقام پر ایک وزنی دلیل ہے۔ مگر اصولِ حدیث کے رُو سے مرفوع اور موقوف کا جو فرق ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جو حیثیت حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث کی ہے وہ یقینًا کسی صحابی کے قول کی نہیں ہے، اگرچہ وہ صحیح بھی ہو۔ حافظ ابنِ کثیرؒ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے اس موقوف قول کو پیش کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

اسناد صحیح۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص۳۲۸) کہ اس کی سند صحیح ہے۔

دوسری[1] بحث یہ ہے کہ المسلمون سے کون مسلمان مراد ہیں؟ اگر الف اور لام اس میں جنس کے لئے ہو تو لازم یہ آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اُمت کے تہتّر فرقے سب کے سب ناجی ہو جائیں کیونکہ ہر ایک فرقہ از راہِ تدیّن اپنے معمول کو حسن ہی سمجھتا ہے اور یہ اس حدیث کے خلاف ہے جو ما انا علیہ واصحابی کے الفاظ سے پیش کی جا چکی ہے۔ اور اگر الف اور لام سے استغراق مراد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوگی، تو اس سے اجماعِ اُمّت مراد ہوگی، اور اجماع کے حسن ہونے میں کیا شک ہے؟ لیکن اس سے مبتدعین کو کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ بدعات کا وجود خیر القرون میں ہرگز نہ تھا۔ لہٰذا سب مسلمانوں کا ان پر اتفاق واجماع نہ ہوا۔ اور اگر الف و لام سے عہدِ خارجی[1] مراد ہو تو اس سے مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ مراد ہوگا کہ مسلمانوں کا وہ

[1] علماء اصول کا یہ مسلک ہے کہ اصل الف و لام میں عہد خارجی ہے (دیکھئے تلویح ص۱۴۷ و ص۱۶۰ وغیرہ)

گروہ اور طبقہ جس چیز کو اچھا سمجھے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھی ہوگی اور مسلمانوں کا وہ گروہ اولین درجہ پر بتقاضائے حدیث ما انا علیہ و اصحابی صرف حضرات صحابہ کرامؓ کا گروہ ہی ہو سکتا ہے اور یہی بات صحیح ہے کہ جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ پسند کریں وہ اچھی ہوگی۔ اگر حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی اس روایت اور ان سے مروی دیگر روایات کو سرسری نظر سے دیکھ لیا جائے تو المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کا گروہ ہی متعین ہو جاتا ہے۔

چنانچہ امام ابوداؤد طیالسیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) نے یہ روایت ان الفاظ سے نقل کی ہے:

ان اللہ عزّ وجلّ نظر فی قلوب العباد فاختار محمداً فبعثہ برسالاتہ وانتخبہ بعلمہ ثم نظر فی قلوب الناس بعدہ فاختار لہ اصحابہ فجعلھم انصار دینہ ووزراء نبیہ صلّی اللہ علیہ وسلم فما رأہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن وما رأہ قبیحا فھو عند اللہ قبیح۔ (طیالسی ص۳۳)	اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں پر نظر کی تو حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے علم کے بموجب رسالت کے لئے چنا اور انتخاب فرمایا۔ پھر آپ کے بعد لوگوں کے دلوں کو دیکھا تو آپ کے صحابہ کرامؓ کو انتخاب فرمایا اور ان کو اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی کا وزیر بنایا۔ سو جس چیز کو وہ مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہوگی اور جس چیز کو وہ برا سمجھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بری ہوگی۔

(کم وبیش یہی الفاظ مسند احمد ج ص میں بھی مروی ہیں۔ الزیلعی ج ۴ ص۱۳۳ والدرایہ ص۳۰۶)

اور امام ابوعبداللہ الحاکمؒ (المتوفی ۴۰۵ھ) یہ صحیح سند کے ساتھ (جس کی تصحیح پر امام حاکم اور علامہ ذہبیؒ دونوں متفق ہیں) اس روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں:

ما رأہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن وما رأہ المسلمون سیئا فھو عند اللہ سیئ وقد رأی الصحابۃ جمیعا ان یستخلفوا ابابکرؓ۔ (المستدرک ج ۳ ص۷۸)	جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو مسلمان برا سمجھیں تو وہ عنداللہ بھی بری ہوگی اور تمام صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا اور ان کی خلافت کو اچھا سمجھا، لہٰذا ان کی خلافت عنداللہ بھی اچھی ہی ہوگی۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے نزدیک المسلمون کے لفظ میں حضرات صحابۂ کرامؓ ہی کی طرف اشارہ ہے، بلکہ تصریح کرتے ہیں کہ المسلمون سے حضرات صحابۂ کرامؓ کا پاک گروہ ہی مراد ہے۔

یہی نہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود المسلمون سے حضرات صحابۂ کرامؓ ہی مراد لیتے ہیں بلکہ اُمت کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ حضرات صحابۂ کرامؓ کے نقشِ قدم پر چلیں اور ان کی خلاف ورزی نہ کریں۔ کیونکہ ان کی اتباع ہی میں فلاح ہے۔

وعن ابن مسعودؓ قال من کان مستنًّا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا تؤمن علیہ الفتنۃ اولئك اصحٰب محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کانوا افضل ھذہ الامۃ ابرّھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلّفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیّہ ولاقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوھم علیٰ اثرھم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم۔ (رواہ رزین مشکوۃ ج ۱ ص ۳۲)

حضرت ابنِ مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص سنت پر چلنا چاہتا ہے تو وہ ان بزرگوں کے قدم پر چلے جو فوت ہو چکے ہیں کیونکہ زندہ کبھی فتنہ سے مامون نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے صحابہ ہیں جو اس امت کے نہایت افضل لوگ اور نہایت بھلے قلوب والے اور نہایت گہرے علم والے اور نہایت کم تکلف اور کم بناوٹ والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کے قائم کرنے کے لئے انتخاب کیا تھا۔ ان کی فضیلتوں کو پہچانو اور ان کے نقشِ قدم پر چلو اور جسقدر ہو سکے اُن کے اخلاق اور سیرت کو مشعلِ راہ بناؤ کیونکہ وہ لوگ ہدایتِ مستقیم پر تھے۔

اس روایت سے نہایت صراحت اور وضاحت سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے نزدیک المسلمون کا مصداق صرف اولئك اصحٰب محمّد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے، اور یہی وہ مفہوم ہے جس کو جناب نبی کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ما انا علیہ واصحابی سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے حضرات صحابۂ کرامؓ کی اتباع کی تاکید اور اس کے خلاف ابتداع کی مذمّت کی ہے۔

اتبعوا اٰثارنا ولا تبتدعوا فقد کفیتم۔ ہمارے نقشِ قدم کی پیروی کرو اور اپنی طرف سے بدعتیں مت

ایجاد کرو کیونکہ (دین مکمل ہو چکا ہے اور) تم کفایت کئے گئے ہو (الاعتصام جلد ۱ ص ۵۴)

اور دوسری طرف سختی سے ان لوگوں کی تردید کی اور ان کو مسجد سے نکال دیا جنہوں نے مل کر بلند آواز سے ذکر کرنے اور درود شریف پڑھنے کو پسند کیا تھا (جس کا ذکر با حوالہ آگے آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ) اور ان کے اس فعل کو انہوں نے ما رأہ المسلمون حسنا کے تحت حسن اور اچھا نہ سمجھا کیونکہ ان لوگوں کا یہ طریقہ حضرات صحابہ کرامؓ کے طریقہ کے خلاف تھا۔

تیسری بحث یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کے پاک نفوس مراد ہیں تو اس روایت کا مطلب یہ ہوا کہ جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ نے اچھا سمجھا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہو گی اور جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ نے برا اور قبیح سمجھا تو وہ چیز عند اللہ بھی بری اور قبیح ہی ہو گی۔ اور اہل بدعت حضرات کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ بیشتر بلکہ جملہ وہ بدعات جن پر وہ کاربند ہیں حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت نہیں ہیں۔ اگر وہ چیزیں ان کے نزدیک بھلی اور اچھی ہوتیں تو وہ ہرگز اُن سے نہ چھوٹتیں۔ اور اگر وہ ان کے نزدیک بری اور قبیح نہ ہوتیں تو وہ ضرور ان پر عمل کرتے۔ ان کا علم بھی وسیع اور عمیق تھا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق بھی کامل تھا۔ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت بھی ان میں اعلیٰ درجہ پر تھا لہٰذا جس چیز کو انہوں نے قبیح سمجھ کر اُس پر عمل نہیں کیا تو یقیناً وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی قبیح اور بری ہی ہو گی۔ بہرکیف یہ روایت جملہ بدعات کی تردید کی دلیل ہے نہ کہ ان کی تائید اور ان کی ترویج اور اشاعت کی۔ مگر اللہ تعالیٰ جس کو سنت کے سمجھنے کی توفیق دے اور پھر اس پر عمل کی توفیق بخشے۔ یہ راستہ ہے تو کافی دشوار گذار مگر بحمد اللہ تعالیٰ سہ

ہم خوش ہی خوش ہیں عشق سے گو راہِ عشق میں
زنجیر و طوق و دار و رسن جا بجا ملے!

باب چہارم

عبادات کے اندر اپنی طرف سے اوقات اور کیفیات کا تعین کرنا بدعت ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ کوئی چیز اصل ہی میں بُری ہو تو وہ بدعت ہوگی بلکہ وہ اہم طاعات اور عبادات بھی جن کو شریعت نے مطلق چھوڑا ہے اُن میں اپنی طرف سے قیود لگا دینا یا ان کی کیفیت بدل دینا، یا اپنی طرف سے اوقات کے ساتھ متعین کر دینا، یہ بھی شریعت کی اصطلاح میں بدعت ہوگی، اور شریعتِ اسلامی اس کو پسند نہیں کرے گی۔ حضرت ابو ہریرۃؓ (المتوفی ۵۸ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم قال لا تختصوا لیلۃ الجمعۃ بقیام من بین اللیالی ولا تختصوا یوم الجمعۃ بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصوم احدکم۔ (مسلم ج ۱ - ص ۳۶۱)

کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کی رات کو دوسری راتوں سے نماز اور قیام کے لئے خاص نہ کرو اور جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے روزہ کے لئے خاص نہ کرو۔ مگر ہاں اگر کوئی شخص روزے رکھتا ہے اور جمعہ کا دن بھی اس میں آجائے، تو الگ بات ہے۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی فضیلت نمازِ جمعہ کی وجہ سے ہے محض اس فضیلت کے سبب جمعہ کی رات کو نماز وغیرہ کے لئے اور دن کو روزہ کے لئے خاص کرنا صحیح نہیں ہے۔

علامہ ابو اسحاق شاطبیؒ بدعات کی تعیین اور تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ومنها التزام الكيفيات والهيئات المعينة كالذكر بهيئة الاجتماع على صوت واحد (الى ان قال) ومنها التزام العبادات المعينة فى اوقات معينة لم يوجد لها ذلك التعيين فى الشريعة - (الاعتصام ج ۱ ص۳۴)

اور انہی بدعات میں سے کیفیات مخصوصہ اور ہیئات معینہ کا التزام ہے جیسے کہ ہیئت اجتماع کے ساتھ ایک آواز پر ذکر کرنا (پھر آگے فرمایا) اور انہی بدعات میں سے خاص اوقات کے اندر ایسی عبادات معینہ کا التزام کر لینا بھی ہے جن کے لئے شریعت مطہرہ نے وہ اوقات مقرر نہیں کئے ہیں۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

فاذا ندب الشرع مثلا الى ذكر الله فالتزم قوم الاجتماع على لسان واحد وبصوت واحد او فى وقت معلوم مخصوص عن سائر الاوقات لم يكن فى ندب الشرع مايدل على هذا التخصيص الملتزم بل فيه مايدل على خلافه - (الاعتصام - ج ۱ - ص۳۱)

جب شریعت نے کسی چیز کی ترغیب دی ہو مثلاً ذکر اللہ سو اگر ایک قوم اس کا التزام کرلے کہ ایک زبان ہو کر ایک آواز سے وہ ذکر کرتی ہے یا دیگر اوقات کے علاوہ کسی معلوم اور مخصوص وقت کے اندر وہ ذکر کرتی ہے تو شریعت کی ترغیب اس معین تخصیص اور التزام پر ہرگز دلالت نہیں کرتی بلکہ وہ اس کے خلاف دلالت کرتی ہے۔

حافظ ابن دقیق العید لکھتے ہیں کہ:-

ان هذه الخصوصيات بالوقت وبالحال والهيئة والفعل المخصوص يحتاج الى دليل خاص يقتضى استحبابه بخصوصه وهذا اقرب

یعنی یہ خصوصیات وقت یا حال اور ہیئت، اور فعل مخصوص کیساتھ کسی خاص دلیل کی محتاج ہیں جو علی الخصوص انکے استحباب پر دلالت کرے اور یہی چیز اقرب الی الصواب ہے۔

پھر آگے لکھتے ہیں:-

لان الحكم باستحبابه على تلك الهيئة الخاصة يحتاج دليلا شرعيا عليه ولابد-

کیونکہ کسی چیز کے کسی خاص ہیئت کے ساتھ مستحب ہونے پر لازم اور لابدی ہے کہ دلیل شرعی موجود ہو۔

پھر آگے روافض کی عید غدیر کی تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ما احدثته الروافض من عيدٍ ثالث سموه عيد الغدير وكذلك الاجتماع واقامة شعاره فی وقت مخصوص علیٰ شئ مخصوص لم يثبت شرعا وقريب من ذٰلك ان تكون العبادة من جهة الشرع مرتبة علیٰ وجهٍ مخصوص فيريد بعض النّاس ان يحدث فيها امرا اخر لم ترد به الشرع زاعما انه يدرجة تحت عموم فهذا لا يستقيم لان الغالب علی العبادات التعبد وماخذها التّوقيف۔

(احكام الاحكام ج ۱ ص ۵۱)

شیعوں نے جو تیسری عید جس کو وہ عید غدیر کہتے ہیں ایجاد کی ہے۔ اس کے لئے اجتماع اور اس کے بطور شعار کے قائم کرنے پر جو مخصوص وقت اور خاص ہیئت کے ساتھ کی جاتی ہے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اور اسی کے قریب یہ بات بھی ہے کہ کوئی عبادت شریعت میں کسی خاص طریقہ پر ثابت ہو، اور بعض لوگ اس کے اندر کچھ تغیر کر دیں اور خیال یہ کریں کہ یہ بھی عموم کے نیچے داخل ہے تو ان کا ایسا خیال درست اور صحیح نہ ہوگا کیونکہ عبادات کے اندر تعبدی طریقہ غالب ہے اور اس کا ماخذ (جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام سے) اطلاع پائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

صاحب مجالس الابرار ایک خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ مسجد میں اجتماعی طور پر ذکر کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی ایک روایت کا حوالہ دیتے ہوئے (اس روایت کا ذکر اپنے مقام پر ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں :

هٰكذا يقال بكل من اتیٰ فی العبادات البدنية المحضة بصفةٍ لم تكن فی زمن الصّحابة رضؓ۔

(مجالس الابرار ص ۱۳۳)

ہر اس شخص کے متعلق ایسا ہی کہنا چاہیئے (کہ وہ بدعت کا مرتکب ہے) جو خالص بدنی عبادات میں کوئی ایسی صفت اور ہیئت پیدا کرے جو حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں نہ تھی۔

کیونکہ اس تغیر ہیئت کی وجہ سے دین بدل جائے گا اور اسی کا نام تحریفِ دین ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریفِ دین کے اسباب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

ومنها التشدد وحقيقته اختيار عبادات شاقة لم يامر بها الشارع كدوام الصّيام والقيام والتبتل وترك التزوج وان يلتزم

اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ تشدد اختیار کر لیا جائے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایسی مشکل عبادات کو اختیار کر لیا جائے جن کے متعلق شریعت نے حکم نہیں دیا مثلاً کوئی دوامی طور پر

السنن والآداب کالتزام الواجبات (الیٰ ان قال) فاذا کان ھذا المتعمق او المتشدد معلم قوم ورئیسھم ظنوا ان ھذا امر الشرع ورضاہ وھذا اداء رھبان الیھود والنصاریٰ۔ (حجۃ اللہ ج ۱ صفحہ ۱۲۰)

روزہ رکھے اور قیام کرے اور عزلت نشینی اختیار کرے اور نکاح کرنا چھوڑ دے اور مثلاً یہ کہ سنتوں اور مستحبات کا ایسا التزام کرے جیسے کہ واجبات کا کیا جاتا ہے (پھر فرمایا) جب کوئی ایسا متعمق یا متشدد کسی قوم کا معلم یا رئیس بن جاتا ہے تو قوم یہ خیال کر لیتی ہے کہ اس کا یہ عمل شرع کا حکم اور اس کا پسندیدہ امر ہے، اور یہی بیماری تھی یہود اور نصاریٰ کے صوفیوں میں۔

یہی وجہ ہے کہ قانونِ الٰہی نے انسانوں کو ان کی اپنی مرضی پر نہیں چھوڑا۔ عبادات و معاملات حتیٰ کہ حکومت اور سلطنت کے احکام میں بھی ان کو پابند کر دیا ہے تاکہ وہ اپنی اہواء و خواہشات کے تحت اللہ تعالیٰ کے دین کا حلیہ نہ بگاڑ دیں۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

فجاءت الشرائع بحملھم علیٰ ذلک فی جمیع احوالھم من عبادۃ او معاملۃ حتی فی الملک الذی ھو طبیعی للاجتماع الانسانی فاجرتہ علی منھاج الدین لیکون الکل محوطا بنظر الشارع۔ (مقدمہ صفحہ ۱۹۰)

شرائع اسلامیہ اسی لئے تو آئی ہیں کہ لوگوں کو تمام حالات میں (خواہ وہ) عبادات ہوں یا معاملات حتیٰ کہ ملکی انتظام جو لوگوں کے اجتماع کا ایک طبعی امر ہے، دین پر ہی قائم رہنے کی تلقین کریں اور ان کو دین کے طریقہ پر محض اسلئے قائم رہنے کی تلقین کی ہے تاکہ ان کے تمام معاملات شارع کی نگرانی میں ہوں۔

مشہور فقیہ ابوحنیفہ ثانی علامہ زین العابدین ابن نجیم المصری الحنفیؒ (المتوفی ۹۷۰ھ) لکھتے ہیں:

لان ذکر اللہ تعالیٰ او قصد بہ التخصیص بوقت دون وقت او بشیء دون شیء لم یکن مشروعا حیث لم یرد بہ الشرع لانہ خلاف الشرع۔ (بحر الرائق ج ۲ صفحہ ۱۵۹)

اسلئے کہ ذکر اللہ کی جب کسی ایک ہی وقت کے ساتھ تخصیص کا قصد کر لیا گیا اور دوسرے وقت میں وہ نہ ہوا یا کسی شے کے ساتھ ذکر اللہ کو مخصوص کر لیا گیا دوسری چیز کے ساتھ، وہ خاص نہ کیا گیا تو وہ مشروع نہ ہوگا کیونکہ اس کے متعلق شریعت میں کوئی تخصیص نہیں آئی لہٰذا وہ خلافِ شرع ہوگا۔

علامہ موصوف بھی یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ گو اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک بڑی عبادت ہے لیکن جب شریعت نے

اس کو کسی خاص وقت کے ساتھ یا جہر اور اخفاء یا اجتماع و انفراد وغیرہ کسی خاص کیفیت اور ہیئت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تو اس کو اپنی طرف سے کسی خاص وقت یا کسی خاص کیفیت کے ساتھ متعین کر دینا غیر مشروع ہوگا، بلکہ تحریفِ دین۔ اس لئے کہ شریعت نے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"و عملِ فقیر نیز بر ہمیں است و ہیچ روزے را بر روزِ دیگر ترجیح نمی دہد تا آنکہ ترجیح آنہا از شارع معلوم نکند کالجمعۃ و رمضان و نحو ہما" (مکتوبات حصہ چہارم ص۶۷)	اس فقیر کا عمل بھی اسی پر ہے کہ کسی دن کو کسی دن پر ترجیح نہیں دیتا، تاوقتیکہ اُس کی ترجیح شارع سے معلوم نہ کرلے۔ جیسا کہ جمعہ اور رمضان وغیرہ کی ترجیح شارع سے معلوم ہو چکی ہے۔

اِن اقتباسات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ جب شریعت نے کسی رات یا دن کو کسی عبادت کے لئے مخصوص نہ کیا ہو، اور جب ذکر اللہ وغیرہ عبادات کو کسی خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ متعین نہ کیا ہو تو اپنی طرف سے وقت اور کیفیت کا متعین کرنا اور اس تعین کا التزام کرنا بدعت بھی ہے اور غیر مشروع بھی۔

حضرات صحابہ کرامؓ کا ایسی کیفیات اور ہیئات کی تعیین سے متعلق کیا فیصلہ ہے؟

خوش کن سے خوش کن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ اور خوش آئند سے خوش آئند اقوال اور بہتر سے بہتر اشعار ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت پیش نہیں کر سکتا، وہ کامل اتباع رسول اور عمل ہے۔ انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اُس کے نیک اور معصوم اقوال اور خیالات نہیں، بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے نشۂ دینی سے سرمست ہو کر اپنی جان دے دینا آسان ہے مگر پوری عمر ہر چیز میں، ہر حالت میں اور ہر کیفیت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کے پل صراط کو اس طرح طے کرنا کہ کسی بات میں سنّتِ محمدیہؐ سے قدم اِدھر اُدھر نہ ہو، سب سے زیادہ مشکل امتحان ہے اس اتّباع کے امتحان میں تمام حضرت صحابۂ کرامؓ پورے اُترے۔ آپؐ کی زندگی کے آئینہ میں حضرات صحابۂ کرامؓ نے اپنی زندگیاں سجائیں اور یہ بولتی چالتی، جیتی جاگتی تصویریں ہر مسلمان کی زندگی کی حالت اور ہر کیفیت کا آئینہ

بن جاتی ہیں اور اسی اتباع کے صحیح جذبہ نے حضرات تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور بعد کو آنے والوں کا یہ اہم فرض قرار دیا کہ وہ آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا اور ایک ایک جنبش کو معلوم کریں اور پچھلوں کو بتائیں تاکہ اپنے اپنے امکان بھر ہر مسلمان اس پر چلنے کی کوشش کرے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود : حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کا گزر مسجد میں ذاکرین کی ایک جماعت پر ہُوا جس میں ایک شخص کہتا تھا۔ سَو مرتبہ اللّٰہُ اکبر پڑھو تو حلقہ نشین لوگ کنکریوں پر سو مرتبہ تکبیر کہتے۔ پھر وہ کہتا۔ سَو بار لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھو تو وہ سو بار تہلیل پڑھتے۔ پھر وہ کہتا، سَو دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہ کہو، تو وہ سنگریزوں پر سو دفعہ تسبیح پڑھتے۔ حضرت ابنِ مسعودؓ نے فرمایا۔ تم ان سنگریزوں اور کنکریوں پر کیا پڑھتے تھے۔ وہ کہنے لگے ہم تکبیر و تہلیل و تسبیح پڑھتے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا :

فقال فعدوا من سیئاتکم فانا ضامن ان لا یضیع من حسناتکم شیءٌ ویحکم یا امّة محمد صلی اللہ علیہ وسلم ما اسرع ھلکتکم ھٰؤلاء صحابةؓ بینکم متوافرون وھٰذا ثیابہ لم تبل وآنیتہٗ لم تکسر (الیٰ ان قال) او مفتحی باب ضلالة۔ (مسند دارمی ص۳۸ قلت بسند صحیح)

تم ان کنکریوں پر اپنے گناہ شمار کیا کرو۔ میں اس کا ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہوگا۔ تعجب ہے تم پر اے امتِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، کیا ہی جلدی تم ہلاکت میں پڑ گئے ہو۔ ابھی تک حضرات صحابہ کرامؓ تم میں بکثرت موجود ہیں، اور ابھی تک جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کپڑے پُرانے نہیں ہوئے اور ابھی تک آپ کے برتن نہیں ٹوٹے (آگے فرمایا) اندریں حالات تم بدعت اور گمراہی کا دروازہ کھولتے ہو۔

علامہ قاضی ابراہیم صاحبؒ، حضرت ابنِ مسعودؓ کی ایک روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں :

انا عبد اللہ بن مسعود فو الذی لا الٰہ غیرہٗ لقد جئتم ببدعة ظلماء او لقد فقتم علی اصحٰب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مجالس الابرار ص۱۳۳)

میں عبداللہؓ بن مسعود ہوں خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم نے یہ نہایت تاریک اور سیاہ بدعت ایجاد کی ہے، یا کیا تم علم میں جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے بڑھ گئے ہو؟

اور شیخ الاسلام ابنِ دقیق ان کی ایک روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں :

فقال اذا رأیتموہ فاخبرونی قال فاخبروہ فاتاہ ابنِ مسعودؓ متقنعا فقال من عرفنی فقد عرفنی و من لم یعرفنی فانا عبدُاللہؓ ابن مسعود تعلمون انکم لاھدیٰ من محمد صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ (الیٰ ان قال) لقد جئتم ببدعۃ عظمیٰ او لقد فضلتم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم علما فھذا ابن مسعودؓ انکر ھذا الفعل مع امکان ادراجہ تحت عموم فضیلۃ الذکر۔

(احکام الاحکام ج ۲ ص ۵۲)

فرمایا حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے جب تم اس کو دیکھو تو مجھے اطلاع دو۔ راوی کہتا ہے کہ ان کو اطلاع دی گئی وہ موقع پر پہنچے اور وہ سر پر کپڑا اوڑھے ہوئے تھے۔ فرمایا مجھ کو جو جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا تو میں بتا دیتا ہوں کہ میں عبداللہؓ بن مسعود ہوں۔ تم جانتے ہو کہ تم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ سے زیادہ ہدایت پر ہو (العیاذ باللہ تعالیٰ) پھر فرمایا تم نے ایک بہت بڑی بدعت ایجاد کی ہے یا تم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ پر علم میں فضیلت حاصل کر چکے ہو؟ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے مخصوص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ اس فعل کا انکار کیا ہے حالانکہ فضیلتِ ذکر کے عام دلائل کے تحت اس کا ادراج ممکن تھا۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا مطلب اس سے صرف یہ تھا کہ اگرچہ تکبیر و تہلیل اور تسبیح و تحمید کی بہت کچھ فضیلتیں وارد ہوئی ہیں اور وہ محبوب ترین ذکر ہے لیکن اس کا یہ خاص طرز و طریقہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کا بتایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ خود تمہارا ایجاد کردہ ہے۔ لہٰذا یہ بدعت ضلالت بھی ہے اور گمراہی بھی، بدعتِ عظمیٰ بھی ہے اور بدعتِ ظلماء بھی اور بقول امام ابنِ دقیق العیدؒ اس مخصوص کیفیت کو حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فضیلتِ ذکر کی عام دلیلوں کے نیچے داخل نہیں کیا۔

اور اس روایت کو فریقِ مخالف بھی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں :۔

"عبداللہؓ بن مسعود نے جہر سے ایک جماعت ذکر اللہ کرنے والوں کو دھمکایا اور ان کے فعل کو بدعت قرار دیا کتبِ فقہ اور حدیث میں یہ روایت مذکور ہے" (انوار ساطعہ ص ۲۴۲)۔ اور دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔ "اس روایت میں لفظ قاص ہے۔ یعنی ایک آدمی قصہ گو رات کے وقت قصہ کہنے بیٹھا تھا، اور درمیان قصہ گوئی

کے لوگوں کو کہتا جاتا تھا کہ ایسا کہو، ایسا کہو۔ یہ خبر عبد اللہ رضؓ بن مسعود کو پہنچی۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور ان کو دھمکایا کہ تم نے یہ بدعت نکالی ہے۔ واضح ہو کہ یہ انکار کرنا عروض ہیئت جدید کے سبب نہ تھا بلکہ وہ اس کا مجمع کرنا قصّہ گوئی کے واسطے یہ خلافِ شرع تھا، گو ذکر اللہ بھی کبھی درمیان میں ہوتا ہو، اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصّہ گویوں کو جو بے اصل قصّہ بیان کرتے تھے، مسجد سے نکال دیا کرتے تھے" (انوارِ ساطعہ، بلفظہ ص۳۸)۔

مولوی عبد السمیع صاحب نے اُصولی طور پر یہ روایت تو صحیح تسلیم کر لی ہے۔ ہاں البتہ اسکی یہ تاویل کی ہے کہ یہ مجلس بے اصل قصّہ گوئی کی وجہ سے حضرت عبد اللہ رضؓ بن مسعود کو پسند نہ آئی اور اسلئے انہوں نے اس کو بدعت اور ضلالت کہا۔ اور اس کی دلیل لفظ قاص ہے (ایک قصّہ گو) اور ذکر اللہ کی یہ توجیہ کی کہ ذکر ضمنی طور پر کبھی کبھی اثنائے قصّہ گوئی میں ہوتا رہا۔ مگر صاحبِ انوارِ ساطعہ کی یہ تاویل نہایت رکیک اور سراسر باطل ہے۔ اوّلاً اسلئے کہ جس روایت اور روایت کے جن الفاظ سے ان کو دھوکا ہوا ہے وہ یہ ہیں:

قاص یجلس باللیل ویقول للناس قولوا کذا و قولوا کذا۔ (احکام الاحکام ج ا ص۵۲)

کہ ایک بیان کرنے والا رات کو بیٹھ جاتا اور لوگوں سے کہتا تم یہ کہو اور تم یہ کہو۔

یہ روایت اور اس کے الفاظ صراحت کے ساتھ اس بات کو آشکار کرتے ہیں کہ وہ قاص لوگوں ہی سے کہلواتا تھا، اور ان کو طریقہ بتلاتا تھا کہ تم یہ کہو، تم یہ کہو۔ اس روایت میں کہیں اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں کہ وہ بیہودہ اور لایعنی قصّہ گوئی کرتا تھا، اور درمیان میں کبھی کبھی لوگوں سے ذکر اللہ بھی کروایا کرتا تھا۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ جو کچھ وہ کہتا جاتا تھا وہی کچھ جملہ اہلِ مجلس کہتے جاتے تھے۔ وثانیاً ہم نے مسندِ دارمی کی صحیح روایت سے یہ عرض کر دیا ہے کہ وہ سو سو مرتبہ اللہ اکبر، سو سو مرتبہ لا الٰہ الا اللہ اور سو سو مرتبہ سبحان اللہ وغیرہ ان کو پڑھواتا تھا، اور وہ اس کے پیچھے پیچھے پڑھتے جاتے تھے۔ اور ان کا اس اجتماعی رنگ میں ذکر کرنا ہی حضرت ابنِ مسعود رضؓ کو ناگوار گزرا اور اسی کو انہوں نے بدعتِ ضلالہ اور بدعتِ ظلمی سے تعبیر کیا ہے۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ کا یہ کہنا کہ "انکار کرنا عروضِ ہیئتِ جدید کے سبب نہ تھا" ان کی ذاتی اختراع اور ایجاد بندہ ہے جو کسی صورت میں بھی قابل

التفات نہیں ہے۔ مسندِ دارمی کا بعض مضمون مکرر ملاحظہ کر لیا جائے۔

فوقف علیھم فقال ما ھذا الذی اراکم تصنعون قالوا یا ابا عبد الرحمٰن حصا نعد به التکبیر والتھلیل والتسبیح قال فعدوا سیئاتکم۔ (الحدیث)

(مسند دارمی ص۳۸)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ انکے پاس کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ یہ کیا معاملہ ہے جو میں تم سے دیکھ رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا اے ابو عبد الرحمٰن (یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی کنیت تھی) ہم ان سنگریزوں پر اللہ اکبر، لاالٰہ الا اللہ اور سبحان اللہ شمار کرتے ہیں۔ فرمایا تو تم ان پر اپنے گناہ شمار کرو۔

غور فرمائیے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ صاحبِ انوارِ ساطعہ کے اتباع ہی از رہِ انصاف یہ فرمائیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قصہ گوئی کو بدعتِ عظمٰی سے تعبیر کیا ہے یا سنگریزوں پر تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھنے کو؟ اور یہ انکار عوارضِ ہیئتِ جدیدہ کی وجہ سے تھا یا قصّہ گوئی کی وجہ سے؟ اور ان لوگوں نے اپنا قصور سنگریزوں اور کنکریوں پر تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھنا بیان کیا ہے یا قصہ گوئی سُننا؟ اور حضرت ابنِ مسعودؓ نے فعدوا سیئاتکم ارشاد فرما کر تکبیر و تسبیح وغیرہ کے شمار کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس عمل کو بدعت کہا ہے یا اس سے قصہ گوئی کا کنکریوں پر شمار کرنا مراد ہے؟ الغرض صاحبِ انوارِ ساطعہ کی یہ تاویل سراسر مردود ہے۔ حضرت ابنِ مسعودؓ کا انکار صرف عوارضِ ہیئتِ جدیدہ کی وجہ سے تھا۔ اسی کی طرف شیخ الاسلام ابنِ دقیق العیدؒ نے اشارہ کیا ہے اور اسی کو قاضی ابراہیمؒ نے بصفۃٍ لم تکن فی زمن الصّحابۃ سے تعبیر کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ کا انکار اس مخصوص ہیئت اور خاص کیفیت کے ساتھ اور متعیّن صفت کے ساتھ ذکر اللہ پر جمع ہونے کی وجہ سے تھا اور اسی کو انہوں نے بدعتِ ظلماء اور بدعتِ عظمٰی اور ضلالت فرمایا ہے۔

وثالثًا لفظ قاص کے معنی لغتِ عربی میں بیان کرنے والا ہے، عام اس سے کہ اچھی بات بیان کرے یا بُری۔ ہاں عُرف میں قاص قصّہ گو کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ اچھے قصّے بیان کرے یا بُرے۔ لفظ قاص سے علی التعین قِصّہ گو مراد لینا اور قِصّہ گو سے بے اصل قِصّہ گو مراد لینا عجیب منطق ہے۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ قرآن کریم میں یَقُصُّ الْحَقَّ یا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ اور قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ وغیرہ کی طرف

دھیان کرتے تو ہرگز ٹھوکر نہ کھاتے۔

حضرت ابن مسعودؓ اور باآوازِ بلند مسجد میں مل کر درود شریف پڑھنا | درود شریف کا پڑھنا ایک بہت بڑی عبادت ہے مگر انفرادی طور اور آہستہ۔ چنانچہ مشہور فقیہ علامہ محمد بن محمدؒ الخوارزمی المشہور بالبزازی الحنفیؒ (المتوفی ۸۲۷ھ) صاحبِ بزازیہ جہر بالذکر کا مسئلہ نقل کرتے ہیں:

عن فتاوی القاضی انہ حرام لما صح عن ابن مسعودؓ انہ اخرج جماعۃ من المسجد یھللون و یصلون علی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم جھرًا وقال لھم ما اراکم الا مبتدعین۔ (شامی ج ۲ ص ۳۵) (فتاوی بزازیہ ج ۳ ص ۳۷۵ علی ھامش الھندیۃ)

قاضی صاحب کے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ جہر سے ذکر کرنا حرام ہے کیونکہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے صحیح روایت کیساتھ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو مسجد سے محض اس لئے نکال دیا تھا کہ وہ بلند آواز سے لا الٰہ الا اللہ اور بلند آواز سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتی تھی اور فرمایا کہ میں تمہیں بدعتی ہی خیال کرتا ہوں۔

انقلابِ زمانہ دیکھئے کہ آج جو شخص بلند آواز سے جماعت کے ساتھ مل کر درود شریف نہیں پڑھتا، اہلِ بدعت اس کو مسجد سے نکال دیتے ہیں۔ مگر حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے بلند آواز کے ساتھ مسجد میں جہر کے ساتھ درود شریف پڑھنے والوں کو مسجد سے نکال دیا اور فرمایا۔ میرے نزدیک تم بدعتی ہو۔ فریقِ مخالف کو اس صحیح روایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

قارئینِ کرام نے حضرت ابنِ مسعودؓ کا فیصلہ تو ملاحظہ کر ہی لیا ہے۔ اب، ذرا مولوی محمد عمر صاحب اچھروی کی بھی سُن لیجئے کہ وہ کیا فرماتے ہیں: "فرقہ وہابیہ دیوبندیہ نماز کے بعد بلند آواز سے اجتماعی طور پر درود شریف پڑھنے کو بدعت کہتے ہیں اور پڑھنے والے کو روکتے ہیں۔ اور احناف کی مساجد میں صلوٰۃ فریضہ کے بعد درود شریف کو بلند آواز سے لازمی پڑھا جاتا ہے۔ اب تم اپنے عمل سے فیصلہ کر لو کہ تم وہابی ہو یا حنفی" انتہٰی (بلفظہٖ مقیاس حنفیت ص ۲۱۹) مولوی محمد عمر صاحب اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اور گریبان میں منہ ڈال کر خوفِ خدا کو دل میں رکھتے ہوئے اور قبر و آخرت کا نقشہ سامنے رکھ کر یہ فیصلہ خود صادر فرمائیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کے اس فیصلہ کے بموجب وہ سنّی ہیں یا بدعتی؟ اور بلند آواز سے اجتماعی طور پر درود شریف پڑھنے کو تو خود دیوبندی

وغیرہ ہی بدعت کہتے ہیں یا حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے بھی بدعت کہا ہے؛ ہوش میں آ کر جواب دیجئے۔
باقی خود کو زبانی طور پر حنفی کہہ دینے سے کوئی حنفی نہیں بن جاتا۔ سچ ہے ع

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یہ روایت فریقِ مخالف کے ہاں بھی صحیح اور مسلّم ہے۔ چنانچہ مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں "چنانچہ حموی میں ہے فی فتاویٰ القاضی الجھر بالذکر حرام وقد صح عن ابنِ مسعودؓ انه سمع قوما اجتمعوا فی مسجد یھللون ویصلون علیه الصلوٰة والسلام جھرًا فراح الیھم وقال ماعھدوا ذٰلک علیٰ عھدہ علیه الصلوٰة والسلام وما اراکم الا مبتدعین فما زال یذکر ذٰلک حتی اخرجھم من المسجد۔ اور روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان لوگوں کو فقط احداثِ ہیئت جدیدہ کیلئے نہیں بلکہ یہ سمجھ کر نکالا تھا کہ یہ ذکرِ جہر کرنا ان کا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہے، اور یہ ہی ہم کہتے ہیں کہ جو احداث مخالف امر شارع کی ہو وہ منع ہے الخ" (بلفظہٖ انوار ساطعہ ص ۳۸-۳۹)

الغرض علامہ قاضیؒ، امام بزازیؒ، علامہ شامیؒ اور علامہ حمویؒ سب کے سب بزرگ حضرت ابنِ مسعودؓ کی اس روایت کو وقد صح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو صحیح کہتے ہیں اور خود صاحبِ انوارِ ساطعہ وقد صح کے الفاظ سے اس کی تصحیح نقل کرتے ہیں۔ اگر امام سیوطیؒ کو اس کی سند معلوم نہیں ہو سکی، جیسا کہ سباحۃ الفکر ص ۶۸ میں نقل کیا گیا ہے کہ اس اثر کی سند اور اس کے مخرج کا پتہ ہونا چاہیئے تاکہ اس کی صحت اور ضعف کا حال کھلے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اور صاحبِ روح البیان نے جو اس روایت کو بلا وجہ جھوٹ اور افترا کہا ہے (تفسیر روح البیان جلد ۲ ص ۲۴۳) تو ان کا قول سرے سے قابلِ التفات ہی نہیں ہے۔ وہ تو موضوع اور جعلی حدیثوں کو صحیح، اور صحیح احادیث کو ضعیف کہہ جاتے ہیں۔ پھر حدیث کی تصحیح اور تضعیف اُن کا مقام ہی نہیں ہے۔ یہ مسلّم محدثینؒ اور صاحبِ بصیرت فقہاء کا کام ہے۔ صاحب رُوح البیان تو ایک صوفی مزاج مفسّر ہیں جنہوں نے رطب و یابس سبھی کچھ تفسیر میں جمع کر دیا ہے (دیکھئے اکسیر ص ۸۲) اور اُنہوں نے جو یہ کہا ہے کہ یہ احداث ہیئتِ جدیدہ کے لئے نہیں، یہ توجیہ بھی صحیح نہیں کیونکہ حضرت ابنِ مسعودؓ اس کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں :-

ما عهد ذالک علیٰ عهده صلی الله علیه وسلم۔ | کہ یہ طرز و طریقہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں لوگوں میں معہود نہ تھا۔

ان کا یہ قول نصِ صریح ہے کہ یہ کیفیت اور احداث ہیئت جدیدہ آپ کے زمانہ مبارک میں نہ تھی۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس مخصوص طریقہ سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ خود حضرت ابنِ مسعودؓ کی پیش کردہ دلیل کو چھوڑ کر ذکر بالجہر سے منع کی عام روایتوں کو اس کی دلیل بنانا جیسا کہ صاحبِ انوار ساطعہ ص۳۸ میں آیت کریمہ، وَادْعُوا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً اور حدیث اربعوا علیٰ انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا غائبا کو نقل کر کے لکھتے ہیں: اس سے بعض صحابہ سمجھ گئے کہ ذکر جہر منع ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے لوگوں کو منع فرمایا تو یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ ہے جو کسی طرح سے مسموع نہیں ہے۔ خیر بہرحال صاحبِ انوارِ ساطعہ اس کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود مسجد میں بلند آواز کے ساتھ مل کر درود شریف پڑھنے اور ذکر بالجہر کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف سمجھتے تھے۔ کاش کہ اہلِ بدعت اس سے کچھ عبرت حاصل کرتے۔ باقی امام احمدؒ کی کتاب الزہد کے حوالہ سے حضرت ابو وائل تابعیؒ کا جو یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود ذکر کرنے سے منع کرتے تھے میں تو جب کبھی حضرت عبداللہؓ کی مجلس میں جا کر بیٹھا، ان کو ذکر اللہ کرتے ہوئے ہی پایا (تجویز الرحمان)۔ تو یہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی جہر سے ممانعت والی روایت کا ہرگز جواب نہیں ہے۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ ذکر اللہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے کا ذکر قرآن کریم، صحیح احادیث اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے اور یہ ایک بہت بڑی عبادت اور طاعت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اجتماعی صورت میں، اور وہ بھی مسجد میں جہر سے ذکر کرنا اور اسی ہیئت کے ساتھ جہر سے درود شریف پڑھنا حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے ثابت ہے یا وہ اس کو منع کرتے اور اس کو بدعت کہتے ہیں؟ آپ نے صحیح روایات سے یہ معلوم کر لیا کہ وہ ان دونوں کو بدعت اور ان پر عمل کرنے والوں کو بدعتی کہتے ہیں اور ان کا وجود تک مسجد میں گوارا نہیں کرتے اور فوراً ان کو مسجد سے باہر نکال دیتے ہیں۔ فریقِ مخالف از راہِ دیانت یہ فرمائے کہ مسجدوں میں اجتماعی رنگ میں جہر سے ذکر اور درود شریف پڑھنے والوں کو منع کرنے سے ہم ہی وہابی ہوتے ہیں یا حضرت عبداللہؓ بن مسعود

کو بھی اس مبارک فتویٰ سے کچھ حصّہ نصیب ہو سکتا ہے۔ جواب غور سے دینا ہوگا ؎

من نگویم کہ ایں مکن آن کن　　مصلحت بیں و کار آساں کن

حضرت ابن مسعودؓ کا مقام جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں۔ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آفتابِ نبوّت سے اکتسابِ نُور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ کرام نجومِ ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے ایسے جزوی فضائل اور مناقب حاصل تھے کہ دوسرا کوئی ان میں ان کا ہم پلّہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیّت حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی بھی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان پر اس درجہ اعتماد تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "جس چیز کو تمہارے لئے ابن مسعودؓ پسند کرے میں بھی تمہارے لئے اس چیز کو پسند کرتا ہوں اور اس پر راضی ہوں"۔ (مستدرک ج ۳ ص۳۱۹ صحیح) اور نیز ارشاد فرمایا کہ "جس چیز کو تمہارے لئے عبداللہؓ بن مسعود پسند نہ کرے میں بھی اس چیز کو تمہارے لئے پسند نہیں کرتا"۔ (الاستیعاب ج ۱ ص۳۵۹)۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ حضرت ابنِ مسعودؓ حضرات خلفاء راشدینؓ سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم ج ۲ ص۲۹۳)

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں درجہ اوّل کے مفسّر جن کو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کلّی اعتماد حاصل ہے۔ وہ اس اجتماعی صورت میں ذکر بالجہر کرنے اور مل کر بلند آواز کیساتھ دُرود شریف پڑھنے والوں کو بدعتی کہتے ہیں اور اس فعل کو پسند نہیں کرتے۔ جب ان کو یہ فعل پسند نہیں تو سابق روایت کے پیش نظر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ فعل ہرگز پسند نہیں۔ اب جس کا جی چاہے ان کی پیروی کرے یا کسی اور کی۔ ع سبی اپنا اپنا امام اپنا اپنا۔

بالکل تنہائی میں یا تعلیم کی خاطر ذکر بالجہر کا معاملہ الگ ہے۔ راقم نے اس کی پوری تفصیل اپنی کتاب حکم الذکر بالجہر میں کر دی ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ: حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عروہؒ بن الزبیرؓ دونوں مسجد میں داخل ہوئے:

فاذا عبد اللہ بن عمرؓ جالس الی حجرۃ　　تو دیکھا کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے

عائشۃؓ والناس یصلون الضحی فی المسجد، فسألناہ عن صلوٰتھم فقال بدعۃ۔ (بخاری ج۱ ص۲۳۸، مسلم ج۱ ص۴۰۹)

پاس بیٹھے ہیں اور کچھ لوگ مسجد میں چاشت کی نماز پڑھ رہے ہیں ہم نے حضرت ابنِ عمرؓ سے ان لوگوں کی نماز کے بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بدعت ہے۔

چاشت کی نماز صحیح اسانید کے ساتھ متعدد حضرات صحابۂ کرامؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کی ہے لیکن چونکہ آپ کے زمانۂ مبارک میں اجتماعی ہیئت سے خاص اہتمام اس کے لئے نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ کیف ما اتفق جہاں جہاں بھی کوئی ہوتا تھا، وہاں ہی وہ نمازِ چاشت پڑھ لیتا تھا۔ اور یہ نفلی نماز ہے اور نفلی نماز کو بجائے مسجد کے گھر میں پڑھنے کی زیادہ فضیلت حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ مگر حضرت ابنِ عمرؓ نے جب لوگوں کو اس نماز کے لئے مسجدوں میں اجتماع اور خاص اہتمام دیکھا۔ تو ان کے اس فعل کو انہوں نے بدعت قرار دیا۔ چنانچہ اسی روایت کی شرح میں حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں:

مرادہ ان اظہارھا فی المسجد والاجتماع لھا ھو بدعۃ لا ان اصل صلوٰۃ الضحیٰ بدعۃ۔ (نووی شرح مسلم ج۱ ص۴۰۹)

حضرت ابنِ عمرؓ کی مراد یہ ہے کہ چاشت کی نماز کو مسجد میں ظاہر کرکے پڑھنا اور اس کے لئے اجتماع اور اہتمام کرنا یہ بدعت ہے۔ حضرت ابنِ عمرؓ کی یہ مراد نہیں کہ اصل سے چاشت کی نماز ہی بدعت ہے۔

تہجد کی نماز کی بہت بڑی فضیلت حدیثوں میں آئی ہے اور یہ بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کی ہے۔ لیکن اگر اس کے لئے بھی ضرورت سے زائد اجتماع کیا گیا تو وہ بھی مکروہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک ایسے ہی فرقہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"نمازِ تہجد را بجماعت میگزارند از اطراف و جوانب دراں وقت مردم از برائے نماز تہجد جمع می گردند و بجمعیتِ تمام ادا مینمایند و ایں عمل مکروہ است بکراہت تحریمیہ جمعے از فقہاء کہ تداعی شرط کراہت داشتہ اند جواز جماعت نفل را مقید بنا حیۂ مسجد ساختہ زیادہ از سہ کس

نمازِ تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں اور اطراف و جوانب سے اس وقت لوگ نمازِ تہجد کے لئے جمع ہوتے ہیں اور خاص اہتمام سے اس کو ادا کرتے ہیں اور یہ عمل مکروہ ہے اور کراہت بھی اس میں تحریمی ہے۔ حضرات فقہاء کی ایک جماعت تداعی اور اہتمام کی شرط کو مکروہ کہتی ہے اور نفل نماز کے باجماعت ادا کرنے کو

را باتفاق مکروہ گفتہ اند۔ (مکتوبات حصہ سوم ص۱۰)

مسجد کے کونہ کے ساتھ مقید کرتی ہے اور تعین سے ناآدمیوں کے اجتماع کو باتفاق مکروہ کہتی ہے۔

امام ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں کہ:

الا ترى ان ابن عمرؓ قال فى صلاة الضحىٰ انها بدعة لانه لم يثبت عنده فيها دليل ولم ير ادراجها تحت عمومات الصلوٰة لتخصيصها بالوقت المخصوص وكذلك قال فى القنوت الذى كان يفعله الناس فى عصره انه بدعة ولم ير ادراجه تحت عمومات الدعاء وكذلك روى الترمذى من قول عبد الله بن مغفل لابنه فى الجهر بالبسملة اياك والحدث ولم ير ادراجه تحت دليل عام (احكام الاحكام ج ۱ ص۵۳)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضرت ابن عمرؓ نے چاشت کی نماز کو بدعت کہا کیونکہ ان کے نزدیک اس کی دلیل ثابت نہ تھی اور انہوں نے اس کو نماز کے اثبات کی عام دلیلوں کے تحت درج نہ کیا اسلئے کہ چاشت کی نماز وقتِ مخصوص کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی طرح انہوں نے قنوت کے بارے میں جو ان کے زمانہ میں لوگ پڑھا کرتے تھے بدعت کہا اور اس کو دعا کی عام دلیلوں کے نیچے درج نہ کیا۔ اور اسی طرح امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہؓ بن مغفل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ جہر سے بسم اللہ پڑھنے کی بدعت سے گریز کرنا، اور اس کو عام دلیل کے نیچے انہوں نے درج نہ کیا۔

یہ معلوم ہے کہ نفسِ نماز، قنوت اور بسم اللہ کی بڑی فضیلت آئی ہے مگر چونکہ مخصوص ہیئت اور کیفیت سے اور خاص اوقات کے اندر ان کا ثبوت نہ تھا، اس لئے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابنِ مغفلؓ نے ان کو بجائے عمومات کے تحت درج کرنے کے بدعت کہا اور اس سے بچنے کی تلقین کی۔

علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ:

ان الاصل اذا ثبت فى الجملة لا يلزم اثباته فى التفصيل فاذا ثبت مطلق الصلوٰة لا يصح منه اثبات الظهر والعصر او الوتر او غيرها حتى ينص عليه على الخصوص (الاعتصام ص۱۸۲)

کسی چیز کی اصل جب اجمالی درجہ میں ثابت ہو تو اس سے تفصیلی رنگ میں اس کا ثبوت لازم نہیں آتا (مثلاً) جب مطلق نماز ثابت ہو تو اس سے ظہر و عصر یا وتر وغیرہ کسی خاص نماز کا اثبات نہیں ہوتا تاوقتیکہ خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح نہ ہو

اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں : "اتباعِ وحی باید کرد بسیار امرے محمود کہ در حد ذات فضیلت وارد اما تخصوص مقام وارد نشدہ و درست نیامدہ چنانچہ مصافحہ بعد از نماز و امثال آن"۔ (اشعۃ اللمعات)۔ نیز لکھتے ہیں کہ : "آنکہ بعضے مردم مصافحہ میکنند بعد از نماز یا بعد از نمازِ جمعہ چیزے نیست و بدعت است از جہت تخصیصِ وقت"۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۱۲)۔

اگرچہ اپنے مقام پر مصافحہ اور معانقہ سنت ہے مگر چونکہ ہر نماز کے بعد اور اسی طرح نمازِ جمعہ کے بعد اس کا ثبوت نہیں، لہٰذا یہ بدعت ہے۔ متعدد کتابوں میں اس مصافحہ کی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً التوشیح، للعلامہ طیبیؒ۔ ملتقط۔ ایضاح المطالب۔ محک الطالبین۔ خلاصۃ الفقہ۔ کافی۔ فتاویٰ ابراہیم شاہی۔ ناصری۔ حاشیۃ المصابیح۔ مجالس الابرار۔ مدخل اور فتاویٰ ابن حجر وغیرہ (دیکھئے الجنہ ص ۱۳۰/۱۴۶)۔

علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں :

یکرہ المصافحۃ بعد اداء الصلوٰۃ علیٰ کل حال لانہا من سنن الروافض وھکذا الحکم فی المعانقہ۔ (انتہیٰ) بحوالہ الجنہ ص ۱۳۰)

نماز سے فارغ ہو چکنے کے بعد مصافحہ کرنا ہر حالت میں مکروہ ہے کیونکہ یہ رافضیوں کی سنت ہے اور یہی حکم معانقہ کا ہے۔

باقی امام نوویؒ نے جو کتاب الاذکار میں اس مصافحہ کو لا بأس بہ کہا ہے تو یہ ان کی غلطی ہے چنانچہ ملا علی القاریؒ اور ابنِ امیر الحاجؒ نے امام نوویؒ کی شرح و بسط سے تردید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مصافحہ بدعت ہے۔ علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں :

لا دلیل فی الشرع یدل علیٰ تخصیص تلک الاوقات بھا بل ھی مکروھۃ (الاعتصام ج ۱ ص ۲۸۰)

شرع میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے ان اوقات کے اندر مصافحہ کی تخصیص ثابت ہوتی ہو بلکہ یہ مصافحہ مکروہ ہے۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ احکامِ عامہ سے اُمورِ خاصہ کا اثبات ہرگز صحیح نہیں ہے، تاوقتیکہ ان کی تخصیص کے لئے کوئی الگ اور مستقل خاص دلیل موجود نہ ہو۔ کیونکہ شریعت کی کسی عام دلیل کو اپنی مرضی سے خاص کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ مطلق کو اس طرح مقید کر دینا اور عمومات کو اس طرح سے خصوص کے قالب میں ڈھال دینا، یہی احداث فی الدین اور منصب تشریع پر دست اندازی ہے۔ امام غرناطیؒ نے

کیا خوب کہا ہے :

فالتقیید فی المطلقات التی لم یثبت بدلیل الشرع تقیید ھا رأی فی التشریع (الاعتصام ج۱ ص۲۸۴)

کہ ان مطلقات کو مقید کرنا کہ جن کی تقیید شریعت سے ثابت نہیں ہے شریعت میں اپنی رائے کو دخل دینا ہے۔

دلائل شرعیہ کی موجودگی میں اپنی رائے سے قیاس کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑے مجرم ہیں خصوصاً جب کہ ان میں اجتہاد اور تفقہ کی صحیح معنوں میں اہلیت ہی موجود نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْکَذِبَ۔ الآیۃ (پ۱۴، النحل ۱۵۰)

اور مت کہو اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر بہتان باندھو۔

حافظ ابن کثیرؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

ویدخل فی ھذا کل من ابتدع بدعۃ لیس لہ فیھا مستند شرعی اوحلل شیئاً مما حرم اللہ اوحرم شیئاً مما اباح اللہ بمجرد رأیہ وتشھیہ (تفسیر ابن کثیر ج۲ ص۵۹۱)

کہ اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے بلا دلیل شرعی کے کوئی بدعت گھڑی یا محض اپنی رائے اور خواہش سے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال یا حرام کی ہوئی کو حلال کر دیا۔

علامہ آلوسیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے معنیٰ کا حاصل جیسا کہ امام عسکریؒ نے صراحت کی ہے یہ ہے کہ تم اس چیز کو حلال و حرام مت کہو جس کی حلت و حرمت خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحقؐ سے ثابت نہ ہو ورنہ تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہنے والے ہو جاؤ گے۔

لان مدار الحل والحرمۃ لیس الا حکمہ سبحانہ (روح المعانی ج۱۴ ص۲۴۳)

کیونکہ حلت اور حرمت کی مدار صرف اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے۔

اور یہی حال ہے زمانۂ حال کے مبتدعین کا کہ وہ ہر بات کو اپنی نارسا عقل سے ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ نُصوص قطعیہ اور احادیثِ صحیحہ کی باطل تاویلات کر کے خود بھی گمراہ ہوتے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور وُہ بدعت کو لے کر اس سے سُنّت کو مٹانے کے درپے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

سیلی امورکم بعدی رجال یطفؤن السنۃ

میرے بعد کچھ مرد تمہارے اُمور کے سرپرست بنیں گے۔ وہ

بالبدعۃ۔ رواہ ابن ماجہ (جامع العلوم والحکم ص۲۱۱ء۲۴۳) بدعت سے سنّت کو مٹائیں گے۔

اور یہی اہل بدعت کا وطیرہ ہے کہ وہ اپنی خواہش اور عقل کو ہر مقام پہ دخل دیتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا گناہ اور عیب ہے؟ اس میں کیا خرابی ہے؟ یہ بھی جائز ہے، یہ بھی مستحب ہے اور کارِ ثواب ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس پر انہوں نے مطلقاً غور نہ کیا کہ اگر ایک چیز مطلق جائز ہے تو قید لگانے سے شاید وہ جائز نہ ہو۔ دیکھئے قرآن کریم کا پڑھنا کارِ ثواب ہے مگر بحالتِ رکوع وسجود پڑھنا منع ہے (مسلم شریف ج ۱۔ ص۱۹۱ وغیرہ)۔ غیر محرم عورت سے نکاح تو جائز ہے مگر اس صورت میں کہ اس کی بہن یا خالہ یا پھوپھی یا بھانجی پہلے نکاح میں موجود نہ ہو۔ اپنی بیوی کے ساتھ جماع تو جائز ہے مگر بقیدِ حیض حلال نہیں ہے۔ بکری اور گندم وغیرہ تو حلال ہے مگر بقید چوری حرام ہے۔ کہاں تک اسی قاعدہ کو لکھا اور بیان کیا جائے۔ الغرض اہلِ بدعت کی یہی اُصولی غلطی ہے کہ وہ احکامِ عامہ سے اُمورِ خاصہ ثابت کرنے کی بے جا سعی کرتے ہیں۔

صاحبِ انوارِ ساطعہ کا ایک مغالطہ مولوی عبدالسمیع صاحب نے زرقانی، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق اور فتح الباری وغیرہ سے یہ نقل کیا ہے کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ چاشت کی نماز کو بدعتِ حسنہ فرماتے تھے لہٰذا حضرت ابنِ عمرؓ کا انکار مانعین کے لئے مفید نہیں۔ پھر آگے لکھتے ہیں:۔ "پس مدعیٔ بدعت ثابت کرنے والوں کا ثابت اور رد کرنے والوں کا رد ہو گیا" (بلفظہ انوارِ ساطعہ ص۲۷)۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ انوارِ ساطعہ نے اصل بات پر غور ہی نہیں کیا، ورنہ وہ ہرگز غلطی کا شکار نہ ہوتے حضرت مجاہدؒ کی روایت جو بخاری اور مُسلم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، اس میں سوال چاشت کی نماز کے بارے میں نہیں ہے کہ آیا وہ بدعت ہے یا سنّت۔ بدعتِ حسنہ ہے یا سیئہ؟ وہاں یہ مذکور ہے کہ پوچھنے والوں نے حضرت ابنِ عمرؓ سے یہ پوچھا ہے کہ یہ جو لوگ مسجد میں اجتماعی شکل میں نماز پڑھتے ہیں، ان کی یہ نماز کیسی ہے؟ اس کے جواب میں حضرت ابنِ عمرؓ نے یہ فرمایا کہ یہ بدعت ہے اور اس بدعت کو وہ حسنہ سے مقید نہیں کرتے۔ اور مطلق بدعت سے بدعتِ سیئہ ہی مراد ہوتی ہے۔ ہاں نفسِ چاشت کی نماز کو وہ بدعتِ حسنہ فرماتے ہوں تو جُدا بات ہے۔ الغرض اثبات اور چیز کا ہے اور نفی اور چیز کی ہے۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ کو بھی بالآخر یہ بات کھٹکی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اور بعض علماء نے یہ خیال کیا ہے کہ اصل نماز پر ان کا انکار نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک بدعتِ حسنہ، افضل و احسن کام تھا، اس پر کس طرح انکار فرماتے۔ بلکہ اگر انہوں نے انکار کیا ہے تو اس بات پر کیا ہے کہ لوگ اس کو نماز فرائض کی طرح جمع ہو کر اہتمام سے مسجدوں میں پڑھتے تھے۔ اور یہ بات خلافِ اصل تھی"۔ (بلفظہٖ انوارِ ساطعہ ص۲۰۲)

یہی ہم کہنا چاہتے ہیں کہ جس عبادت کو شریعتِ مطہرہ نے کسی خاص کیفیت اور مخصوص ہیئت کے ساتھ مُقیّد نہیں کیا، اور اس کے لئے کسی خاص اہتمام اور اجتماع کی ترغیب نہیں دی تو یقیناً یہ مخصوص طرز و طریقہ بدعت ہوگا۔

حضرت نافعؒ (المتوفی ۱۱۷ھ) روایت کرتے ہیں کہ:

ان رجلا عطس الی جنب ابن عمرؓ فقال الحمد للّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ فقال ابن عمرؓ وانا اقول الحمد للّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ ولیس ھکذا علمنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علمنا ان نقول الحمد للّٰہ علی کل حال۔ (ترمذی ج۲ ص۹۸ قلت وسندہ صحیح و مشکوٰۃ ج۲ ص۴۰۶)

ایک شخص نے حضرت ابنِ عمرؓ کے پہلو میں چھینک ماری اور اس شخص نے خود کہا۔ الحمد للہ والسلام علیٰ رسول اللہ۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا۔ اس کا تو میں بھی قائل ہوں کہ الحمد للہ و السلام علیٰ رسول اللہ۔ لیکن ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم نہیں دی۔ ہمیں اس موقع پر اس کی تعلیم دی ہے کہ ہم الحمد للہ علیٰ کلِّ حال کہا کریں۔

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ چھینک مارنے والا الحمد للہ کہے۔ مگر اس موقع پر والسلام علیٰ رسول اللہ کے الفاظ کی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں دی۔ پوچھئے حضرت ابنِ عمرؓ سے کہ آپ نے درود و سلام سے کیوں منع کیا اور والسلام علیٰ رسول اللہ کے الفاظ سے آپ کو کیا تکلیف ہوئی ہے؟ کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام بھیجنا بھی گناہ ہے؟ بے موقع اور بے محل درود و سلام سے تو وہابی منع کیا کرتے ہیں، آپ اس زمرہ میں کیسے شامل ہو گئے؟ مگر وہ تو سراپا مطیع رسول تھے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حمد و سلام کے موقع اور محل کو بخوبی جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس سے منع کیا۔

مولوی عبد السمیع صاحب حضرت ابنِ عمرؓ کی اس روایت کی یوں تاویل کرتے ہیں کہ "درمختار کی

کتاب الذبائح میں ہے موطنان لا اُذکر فیھما عند العطاس وعند الذبح - پس السّلام علیٰ رسول اللہ کہنا اُس کا مقابل نہی کے واقع ہوا تھا - پھر الحاق امر منہی عنہ کو کس طرح وہ رضی اللہ عنہ منع نہ فرماتے - اُمورِ منہیہ کو ہم بھی منع کرتے ہیں۔ (بلفظہٖ - انوار ساطعہ ص۱۵۲)

جواب : قطع نظر اس سے کہ یہ روایت کیسی ہے[1] - عرض یہ ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ کی مذکورہ روایت کا یہ جواب ہرگز نہیں اور یہ توجیہ القول بمالا یرضی بہ قائلہ ہے، کیونکہ حضرت ابنِ عمرؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عُطاس (چھینک) کے وقت اپنا نامِ مبارک لینے سے منع کیا ہے اس لئے میں تجھے اس سے روکتا ہوں - بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ میں اسلئے تمہیں روکتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس موقع پر ہمیں صرف الحمد للہ کی تعلیم دی ہے اور والسّلام علیٰ رسول اللہ چونکہ اس پر زائد ہے اس لئے میں اس کو جائز نہیں سمجھتا - یہ حدیث اس امر کی سند اور دلیل ہے کہ جو امر شرع میں ثابت ہوا ہو اس پر زیادہ کرنا منع ہے - حضرت ابنِ عمرؓ موطنان لا اذکر الخ سے استدلال نہیں کرتے جیسا کہ مولوی عبد السمیع صاحب نے غلطی کھائی ہے -

حضرت سالمؓ بن عبید (المتوفی سنہ ھ) کے پاس ایک شخص نے چھینک ماری اور :

فقال السّلام علیکم فقال لہ سالم وعلیک و علیٰ امّک فکانّ الرّجل وجد فی نفسہ فقال اما انی لم اقل الا ما قال النّبیّ صلی اللہ علیہ وسلم - الحدیث	یہ کہا - السّلام علیکم - حضرت سالمؓ نے جواب دیا - تم پر اور تمہاری ماں پر - اس جملہ سے وہ شخص ناراض ہوگیا حضرت سالمؓ نے کہا - بہر حال میں نے صرف وہی کچھ کہا ہے جو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا - (محصلہ)

(ترمذی ج ۲ ص۹۸ - ابوداؤد ج ۲ ص۳۲۲ - مشکوٰۃ ج ۲ ص۴۰۶ - موارد الظمان ص۴۷۹)

اس روایت کے پیش نظر مولوی عبد السمیع صاحب نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ "وہ انکار اسلئے تھا کہ وظیفہ معیّنہ شرع کا جو الحمد للہ تھا، اُس نے چھوڑ کر تحیّت ملاقات کا وظیفہ اُس کی جگہ قائم کیا تھا یہ

---

[1] خان صاحب بریلوی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ "حدیث ثابت نہیں (بلفظہٖ ملفوظات حصّہ دوم ص۱۱۸) اور علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں - ولا یصح (القول البدیع ص۱۶۹) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے -

تشریع جدید اور تبدیلِ دین ہے" (بلفظہٖ، انوار ساطعہ ص۱۵۲) ۔ بس ہم بھی اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ جو چیز شریعتِ مطہرہ نے جس جگہ رکھی ہے، اُس کو اُسی جگہ رہنے دو۔ نہ مطلق کو مقید کرو اور نہ مقید کو مطلق۔ نہ عام کو خاص کرو اور نہ خاص کو عام۔ غیر مکیّف کو کیفیت اور ہیئتِ مخصوصہ کی زنجیر میں نہ جکڑو۔ جس کو اجتماعی صورت میں کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، اس کو مجتمع ہو کر نہ کرو اور جس کو باآوازِ بلند کرنے کا حکم شریعت نے نہیں دیا، اس کو بلند آواز سے ادا نہ کرو۔ اور غیر معین بالوقت کو کسی وقت کے ساتھ خاص نہ کرو۔ کیونکہ یہ تشریع جدید اور تبدیلِ دین ہے، جس کا نام بالفاظِ دیگر بدعت ہے اور اہل السنّت والجماعت کا دامن اس قبیح ترین حرکت سے یقیناً پاک ہے۔

حضرت مجاہدؒ (المتوفی ۱۰۲ھ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے ساتھ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے داخل ہوا۔ اذان ہو چکی تھی۔ ایک شخص نے تثویب شروع کر دی (ابن ابی شیبہ، مجاہدؒ کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مؤذن نے اذان کے بعد الصّلوٰۃ الصّلوٰۃ کے الفاظ سے تثویب کی، اور لوگوں کو نماز کی دعوت دی تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا۔ تو پاگل ہے، تیری اذان میں جو دعوت تھی، کیا لوگوں کو بلانے کے لئے وہ ناکافی تھی؟) حضرت ابن عمرؓ نے مجاہدؒ سے فرمایا:

اخرج بنا فان ھٰذہ بدعۃ (ابوداؤد ج ۱ ص۷۹) مجھے یہاں سے لے چل اس لئے کہ یہ بدعت ہے۔

حضرت ابنِ عمرؓ اس مسجد سے چلے گئے اور نماز تک وہاں ادا نہ کی۔ چنانچہ دوسری روایت میں ہے:

اخرج بنا من عند ھذا المبتدع ولم یصل فیہ (ترمذی ج ۱ ص۲۵) مجھے اس بدعتی کے ہاں سے لے چل۔ اور اُس مسجد میں نماز نہ پڑھی۔

حضرت ابنِ عمرؓ کی آخر عمر میں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ اس لئے آپ نے اپنے قائد سے یہ فرمایا کہ مجھے یہاں سے لے چلو۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابنِ عمرؓ نے بدعت اور اہلِ بدعت سے کیسی نفرت کی کہ اُنہوں نے ان کی مسجد میں نماز پڑھنی بھی گوارا نہ کی۔ آج کل کا دور ہوتا تو لوگ یہ کہہ دیتے کہ مثوّب نے کسی کو گالیاں تو نہیں دیں بلکہ وہ نماز جیسی بہترین عبادت کی طرف لوگوں کو بُلا رہا ہے، اور الدّال علی الخیر کفاعلہ یہ تو اجر کا مستحق ہے۔ مگر حضرات صحابہ کرامؓ تو رمز شناس رسول تھے۔ ان کی دور رس نگاہیں بدعات کی

ظاہری چمک میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی تھیں، وہ ہدایت کے اصل منبع اور سرچشمہ تک رسائی کر لیتی تھیں۔

امام نوویؒ شرح مہذّب میں لکھتے ہیں :

روی ان علیاً رای مؤذّناً یثوّب فی العشاء فقال اخرجوا ھٰذا المبتدع من المسجد وعن ابن عمرؓ مثلہ (البحر الرائق بیان تثویب ص۲۶۱ ج۱)

کہ حضرت علیؓ نے ایک مؤذّن کو عشاء کی نماز کے لیے تثویب کرتے دیکھا اور فرمایا اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو، اور حضرت ابنِ عمرؓ سے بھی ایسی ہی روایت آتی ہے۔

علامہ غرناطیؒ لکھتے ہیں کہ سلف صالحینؒ نے جن بدعات کا انکار کیا ہے اُن میں سے ایک تثویب بھی ہے۔ (الاعتصام ص۱۱۴ ج۲) کتبِ فقہ میں جس تثویب کا ذکر ہے وہ قاضی وغیرہ مشغول حضرات کو آگاہ کرنے اور توجّہ دلانے کے لیے ہے نہ کہ درود شریف پڑھنا اور مؤذّن کی طرح بلند آواز سے چلّانا۔

حضرت علیؓ : حضرت علیؓ (المتوفی ۴۰ھ) سے ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے۔

ان رجلاً یوم العید اراد ان یصلی قبل صلوٰۃ العید فنھاہ علیؓ فقال الرجل یا امیر المؤمنین انی اعلم ان اللہ تعالیٰ لا یعذب علی الصّلوٰۃ فقال علیؓ وانی اعلم ان اللہ تعالیٰ لا یثیب علیٰ فعل حتّٰی یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او یحث علیہ فتکون صلاتک عبثا والعبث حرام فلعلہ تعالیٰ یعذبک بہ لمخالفتک لرسولہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ (شرح مجمع البحرین۔ کذا فی الجنۃ ص۱۶۵ ونظم البیان ص۷۳)

ایک شخص نے عید کے دن نمازِ عید سے پہلے نفل نماز پڑھنی چاہی تو حضرت علیؓ نے اس کو منع کیا۔ اُس نے کہا۔ اے امیر المؤمنین! میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پہ سزا نہ دے گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اور میں بالیقین جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب نہ دے گا جبتک کہ اس فعل کو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کیا نہ ہو یا اسکی ترغیب نہ دی ہو۔ پس تیری یہ نماز فعل عبث ہوگی اور فعل عبث حرام ہے اور شاید کہ تجھے اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مخالفت کی وجہ سے سزا دے۔

حضرت علیؓ کی یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے نمازِ عید سے قبل یہ نفل نماز ثابت نہیں۔ نہ آپ نے فعلاً ادا کی اور نہ قولاً اس کی ترغیب دی۔ اس لئے یہ فعل عبث ہے اور فعلِ عبث حرام ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نماز جیسی اہم اور پسندیدہ عبادت پر بھی محض اس لئے سزا دے کہ اس کے پیارے حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے فعل سے یہ ثابت نہیں اور آپ نے اس کی

ترغیب بھی نہیں دی۔ آج کل کے مفتی اُس وقت ہوتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت علیؓ پر کیسے کیسے فتوے لگاتے کہ وہ نماز جیسی عبادت سے منع کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

صاحبِ انوارِ ساطعہ اصولی طور پر اس روایت کو تسلیم کرتے ہیں مگر اپنی عادت کے مطابق اس کی تاویل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: "واضح ہو کہ یہ منع فرمانا فقط اسی باعث سے نہ تھا کہ نماز اس وقت میں آپ سے منقول نہیں ہے اور جب منقول نہیں تو بدعت ٹھہری جیسا کہ فریقِ ثانی مغالطہ میں پڑا ہے۔ بلکہ منع فرمانے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی ایک دلیل ہے جس پر علمارِ حنفیہ کا عمل ہے یعنی صریح نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے۔ شرح مجمع میں ہے روی انہ علیہ السلام قال لا صلوٰۃ فی العیدین قبل الامام۔ یہ ہی ہمارا دعویٰ ہے کہ احداث اس شئے کا منع ہے جو امر و نہی شارع کے مخالف ہو الخ" (بلفظہٖ انوارِ ساطعہ ص۳۹)۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ اتنی بات تو صراحت سے تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے نمازِ عید سے قبل ایک شخص کو نفل نماز پڑھنے سے منع کیا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کے منع کرنے کی جو دلیل شرح مجمع سے نقل کرتے ہیں کہ چونکہ یہ نماز آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریح نہی کے خلاف تھی، اس لئے حضرت علیؓ نے اس سے منع کیا۔ یہ غلط ہے اور توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کا مصداق ہے۔ سوال یہ نہیں کہ عید سے قبل نفل نماز کی ممانعت پر حضرات فقہارِ احنافؒ کے پاس کونسی دلیل ہے؟ اور آیا وہ دلیل آپ کا قول ہے یا عدمِ فعل؟ اور وہ اپنے مقام پر کسی صحیح سند سے ثابت ہے یا نہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ خود حضرت علیؓ نے اس شخص کو نمازِ عید سے قبل نفل نماز پڑھنے سے منع کرنے پر کونسی دلیل پیش کی ہے۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ نے اس پر مطلقاً غور نہیں فرمایا۔ حضرت علیؓ نے اس منع کی دلیل صرف یہ پیش کی ہے:

و انی اعلم ان اللہ تعالیٰ لا یثیب علیٰ فعل حتیٰ یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم او یحث علیہ۔	اور میں بالیقین جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب نہ دیگا جبتک کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو نہ کیا ہو یا اس کی ترغیب نہ دی ہو۔

حضرت علیؓ کا یہ فرمان کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ارشاد اس امر کی غیر مبہم اور صاف دلیل

ہے کہ حضرت علیؓ نے اس شخص کو نماز سے اس لئے منع کیا تھا کہ ان کے نزدیک جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عمل سے یہ نماز ثابت نہ تھی اور اس کی ترغیب پر آپ کا کوئی قول بھی موجود نہ تھا۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ کا وطیرہ ہی عجیب ہے۔ وہ خود قائل کی اپنی پیش کردہ دلیل کو ملاحظہ نہیں فرماتے اور گھر کی دلیل کو چھوڑ کر پڑوس سے دلائل تلاش کرتے ہیں۔ شاید انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ مگر یہ تو دلائل کا مقام ہے، خورد و نوش کا محل نہیں۔ یہاں غور و فکر اور اس کے ساتھ انصاف درکار ہے ؎

ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار
یہ حقائق ہیں تماشائے لبِ بام نہیں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ : حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت طاؤس تابعیؒ کو عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا (اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ یہ نماز صرف دو رکعت تھی) تو انہوں نے ان کو منع کیا حضرت طاؤسؒ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے کی نہی کی روایت کی تاویل پیش کی۔ حضرت ابن عباسؓ نے سخت لہجہ میں ارشاد فرمایا :

ما ادری ایعذب ام یوجر لان اللہ تعالےٰ یقول وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃٍ اذا قضی اللہ ورسولہ امرًا ان یکون لھم الخیرۃ۔ (مستدرک ج ۱ صفحہ قال الحاکمؒ والذہبی علیٰ شرطہما)

مَیں نہیں جانتا کہ اس کو اس نماز پر سزا ملے گی یا اجر ملے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو وہ اپنے خیال کو اس میں جگہ دیں۔

اس روایت میں حضرت ابنِ عباسؓ نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریح قولی نہی کی خلاف ورزی پر حضرت طاؤسؒ کو تنبیہ فرمائی ہے۔ لیکن پہلے گذر چکا ہے کہ جیسے آپ کے قول کی مخالفت گناہ ہے اسی طرح آپ کے عدمِ فعل کی مخالفت میں بھی کوئی ثواب نہیں بلکہ وہ بھی جُرم ہی ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے خلافِ سنّت نماز پڑھنے پر بھی طاؤسؒ کو سزا کا مستوجب گردانا ہے۔

حضرت سعیدؒ بن المُسَیَّبؒ : اس مضمون کی ایک روایت آتی ہے کہ ایک شخص عصر کی نماز کے بعد اکثر دو رکعتیں پڑھا کرتا تھا۔ اُس نے حضرت سعیدؒ بن المسیّبؒ سے دریافت کیا کہ :

یا ابا محمدؒ ایعذبنی اللہ علی الصلوۃ قال لا

اے ابو محمدؒ! کیا مجھے اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے کی وجہ سے سزا دیگا؟

ولکن یعذبك بخلاف السنة ۔ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ نے فرمایا کہ نہیں لیکن تجھے خدا تعالیٰ سنّت کی مخالفت کی وجہ سے ضرور سزا دے گا۔ (مسند دارمی ص۱۶۲)

حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ بھی یہی کچھ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ نفسِ نماز پر اللہ تعالیٰ کسی کو سزا نہیں دیگا کیونکہ وہ ایک عبادت ہے مگر ایسی نماز پر جس میں سنّت کی خلاف ورزی ہو اللہ تعالےٰ ضرور سزا دے دیگا۔

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص : حضرت عثمانؓ بن ابی العاص (المتوفی ۵۵ھ) کو کسی ختنہ میں دعوت دی گئی تو انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جب ان سے اس انکار کی وجہ دریافت کی گئی، تو صاف الفاظ میں یہ جواب ارشاد فرمایا کہ :

انا کنا لا نأتی الختان علیٰ عہد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ولا ندعیٰ له (مسند احمد ج۴ ص۲۱۷) ہم لوگ زمانہ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ختنوں میں نہیں جایا کرتے تھے اور نہ اس کیلئے ہمیں دعوت دی جاتی تھی۔

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص بھی اسی قاعدہ سے کام لے رہے ہیں کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ختنوں میں بلائے جانے کا دستور نہ تھا اور نہ لوگوں کو دعوتیں موصول ہوتی تھیں اس لئے میں بھی اس میں شریک ہونے پر آمادہ نہیں ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ختنوں میں شریک ہونے سے منع کیا ہے اور اس سے نہی فرمائی ہے لہٰذا میں شریک نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بن ابی العاص وغیرہ جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ نے نماز جیسی بہترین عبادت اور ذکر جیسی اعلیٰ قربت اور درود شریف جیسی عمدہ طاعت وغیرہ کو مخصوص کیفیت اور خاص ہیئت اور پابندیٔ وقت کے ساتھ ادا کرنے سے محض اس لئے منع کیا کہ اس طرز و طریقہ سے یہ کام جناب رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے نہیں کئے اور ان کی ترغیب بھی نہیں دی اور آپ کے عہدِ مبارک میں ایسا نہیں ہوتا تھا، اس لئے یہ اُمور بدعت ہیں اور معمولی بدعت بھی نہیں، بدعتِ عظمیٰ اور بدعتِ ظلماء ہیں بلکہ ضلالت بھی ہیں اور گمراہی بھی ہیں اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا۔ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے نزدیک عمل وہی مقبول

ہوگا جو اخلاص اور اتباعِ سنّت کی کسوٹی پہ پُورا اُترتا ہو، اگرچہ وہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہو، اور ایسا عمل بالکل رائیگاں ہوگا جو دیکھنے میں تو پہاڑ جتنا نظر آئے لیکن اس میں اخلاص اور اتباع سنّت کی جان اور روح موجود نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر کیا ہی خوب ارشاد فرمایا۔ ایک روایت آتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں کسی بی بی نے کہا۔ اگر عبدالرحمٰنؓ کے بچّہ پیدا ہُوا تو ہم (عقیقہ میں) ایک اونٹ ذبح کریں گے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ:

لَا بَل السّنّة افضل عن الغلام شاتان مكافئتان وعن الجارية شاة۔ (مستدرک ص ۲۳۸ ج ۴ قال الحاکمؒ والذہبیؒ صحیح)

نہیں، بلکہ سُنّت ہی افضل ہے وہ یہ کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے (عقیقہ میں) ایک بکری ہی کافی ہے۔

اونٹ اور دو بکریوں کی قیمت اور گوشت کا اگر موازنہ کیا جائے تو نمایاں فرق نظر آئے گا مگر حضرت عائشہؓ بکریوں کے بجائے اونٹ پر محض اسلیے راضی نہیں کہ انکے نزدیک سنّت کے خلاف ہے اسلیے اگر اسکی قیمت یا گوشت زیادہ ہے تو پھر بھی اسکی چنداں قدر نہیں ہے سُنّت ہی افضل ہے اور اسکی پابندی لازم ہے جمہور اونٹ اور گائے کا عقیقہ بھی جائز قرار دیتے ہیں حضرت انسؓ کی مرفوع حدیث الطبرانی فی الصغیر ص ۴۵ میں ہے: یعقّ عنه من الابل والبقر والغنم۔ (دیکھئے فتح الباری ص ۵۹۳ ج ۹ ونیل الاوطار ص ۱۴۶ ج ۵)

بدعت کی تردید کے بعض عقلی دلائل دنیا کی ہر حکومت نے اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں قوانین مرتّب کئے ہوتے ہیں اور ان پر ان کا چلنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور انکی خلاف ورزی کو کوئی حکومت گوارا نہیں کرتی۔ اگر کوئی شخص مملکتِ پاکستان میں ہندوستان، برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کے نوٹ چلانا چاہے تو یہ ایک جُرم ہوگا اور حکومت ایسے شخص پر مقدمہ چلائے گی۔ اگر پاکستانی فوج کا کوئی سپاہی امریکہ وغیرہ کسی غیر مُلکی فوج کی وردی اور یونیفارم پہن کر ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہے تو اس کا حشر سب کے سامنے ہے۔ غیر مُلکی وردی اور یونیفارم کی تو بات ہی جانے دیجئے، اگر یہی فوجی سپاہی ٹکٹ کلکٹر کی وردی میں حاضری دے تو اس کا انجام بھی مخفی نہیں ہے۔ الغرض جس محکمہ کے لئے جو لباس اور وضع قطع، جو وردی اور یونیفارم حکومتِ وقت متعیّن کرکے اس کی پابندی لازم ٹھہرائیگی

کیا مجال کہ کوئی اس کی مخالفت کر سکے۔ اسی طرح کوئی شخص ریلوے ٹکٹ کی جگہ چوگنی رقم کا ڈاک خانہ کے محکمہ کا منظور شدہ ٹکٹ دے کر کامیاب نہ ہوگا۔ اور دس پیسے کے کارڈ پر بیس روپے کا ریلوے ٹکٹ لگانا بے کار ہوگا۔ پھر کیا غضب ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعین کئے ہوئے طُرقِ عبادات میں اپنی طرف سے تغیّر روا رکھا جائے اور اس پر گرفت بھی نہ ہو۔ خدائی حکومت نہ ہوئی اندھیر نگری ہوئی (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔ دُور نہ جائیے ہمارے روزمرّہ کے معمولات میں سے ہے کہ درزی اور موچی کو اپنے لباس اور پاپوش کا ناپ اور نمبر دیتے ہیں۔ اگر ایک گرہ اور ایک نمبر بھی ہمارے حساب سے اُوپر نیچے ہو جائے تو ہم وہ لباس اور جُوتا درزی اور موچی کے سر پر دے مارتے ہیں کہ یہ ہمارے پیمانے پر پورے نہیں اُترتے۔ کپڑا بھی وہی ہو جو ہمیں پسند تھا، اور چمڑا بھی وہی ہو، جو ہمیں مرغوب تھا، مگر ہے وہ ہمارے معیار سے کم یا زیادہ، ہم اس کو کبھی لینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وعلیٰ ہذا القیاس، وزن اور ماپ وغیرہ میں کسی طرح کمی وبیشی ہم گوارا نہیں کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اعمال کا ایک معیار، ہمارے افعال کا ایک مقیاس اور ہماری زندگی کا ایک نمونہ بتایا ہے، اور وُہ اُسوۂ رسولؐ، سیرتِ رسولؐ اور اتباعِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ وتابعینؒ اور تبع تابعینؒ اس نمونہ پر صحیح اُترنے والے ہیں۔ اس اسلامی یونیفارم اور اس اتباعِ سنّت کی وردی کے خلاف تمام فیشن، جملہ رسوم اور ہر قسم کی بدعات خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کامل ومکمّل آئین اور نظام میں مردُود ہیں اور اُن پر عمل پیرا ہونے والا کوئی بھی شخص کسی طرح حقیقی نجاح وفلاح کا مستحق نہیں ہے۔

الحاصل نہ تو کوئی حکومت زندگی کے کسی شعبہ میں رعایا کو اپنی خواہش اور مرضی پر چھوڑتی ہے اور نہ ہم اپنے مزدوروں اور اجیروں کو اُن کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ شریعتِ اسلامی ایسے اعمال اور عبادات ہم سے قبول کرے، جو اُس کے بتلائے اور متعیّن کئے ہوئے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

سنّت اور بدعت کے مقام اور اس کی صحیح پوزیشن کو سمجھنے والے کے لئے یہ چند حروف بھی

کافی ہیں۔ ہاں البتہ نہ ماننے والے کے لئے دفتر کے دفتر بھی بالکل بیکار ہیں۔ سُنّت کو (جو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا قول و عمل ہے) اگر اصلی شکل و صورت میں محفوظ رکھا جائے، تو وہی قیمتی موتی ہے اور اس کی قیمت دنیا و مافیہا کے خزانے بھی پوری نہیں کر سکتے ؎

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر سے سوا کچھ اور نہیں

باب پنجم

کیا بدعات میں کوئی خوبی اور ان پر دلائل بھی پیش کئے جاتے ہیں؟

دنیا میں شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس میں اس کی خرابی کے باوجود اس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ شراب اور جوئے جیسی بدترین چیز کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے:

فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ط ان دونوں میں گناہ بڑا ہے اور لوگوں کیلئے ان میں کچھ منافع بھی ہیں۔ (پ۲۔ بقرہ۔ رکوع۲۷)

یہ ٹھیک ہے کہ ان میں گناہ بہت ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ان میں فی الجملہ منافع کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ان قلیل منافع کی وجہ سے ان کو جواز کا درجہ حاصل نہ ہو سکا بلکہ ان کے مضرات اور مفاسد کے پہلو کو غالب قرار دے کر ان کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دیا گیا اور اکبر الکبائر کی مد میں ان کا شمار کیا گیا۔ جب بھی کسی گمراہ فرقہ نے کوئی بد سے بدتر بدعت، دین کے نام پر ایجاد کی ہے تو اُس نے اس میں محاسن اور خوبیوں کا دعویٰ بھی ضرور کیا ہے۔ اور اس کی ترویج اور اشاعت کے لئے خدا اور مذہب کے نام پر، رسولؐ اور اولیاءؒ سے عشق اور محبّت کے نام پر کچھ نہ کچھ دلائل بھی تراشے ہیں اور ضرور ایسا پیرایہ اختیار کیا ہے جس سے ایک عام اور سادہ لوح مسلمان خواہ مخواہ مغالطہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مشرکینِ عرب نے شرک جیسے بدترین اور قبیح ترین فعل کو جائز اور مستحسن ثابت کرنے کیلئے تقرّبِ الٰہی کا نام ہی تو لیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللهِ (مشرکوں نے کہا) ہم ان (درمیانی وسائط) کی پوجا نہیں

زُلْفیٰ - (پ۲۳ - زمر - رکوع ۱) کرتے - صرف اس لئے کہ یہ ہمیں خدا تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں

اور دوسرے مقام پر ذکر فرمایا کہ مشرکوں نے یہ کہا :

ھٰؤُلَاءِ شُفَعَاءُ نَا عِنْدَ اللّٰہِ (پ۱۱ - یونس رکوع ۲) یہ ہمارے وسائل اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کرتے ہیں

دیکھا آپ نے کہ مشرکین نے شرک کے اثبات کے لئے تقرّبِ خداوندی کے خوش کن الفاظ سے تسکینِ قلب کا سامان مہیّا کیا، پھر انہی مشرکین نے ملّتِ ابراہیمی میں ایک بدترین بدعت ایجاد کی، کہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت وہ بالکل مادر زاد ننگے ہوجاتے تھے حتّٰی کہ عورتیں بھی ایک معمولی سے چیتھڑے کے علاوہ (جو شرمگاہ کو ڈھانپنے کے لئے بھی کافی نہ ہوتا تھا) تمام لباس اتار کر یہ کہتے ہوئے طواف کرتی تھیں : الیوم یبدو بعضہ اوکلہ - فما بدا منہ فلا احلہ (مسلم ج ۲ ص ۴۲۲ و سنن الکبریٰ وغیرہ) یعنی آج کے دن اگر میرے بدن کا بعض حصّہ یا سارا ظاہر ہے تو میں اس ظاہر شدہ حصّہ کو کسی کیلئے حلال نہیں کرتی - اور اس قبیح فعل کی توجیہ یوں نقل کی گئی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ کپڑے پہن کر ہم روزمرّہ گناہ کرتے ہیں، پھر انہی کپڑوں میں اللہ تعالیٰ کے پاک گھر کا طواف کیسے کریں؟ نیز ہم کپڑے پہن کر فی الجملہ دنیادار ہوتے ہیں اور ربّ العزّت کے گھر کا طواف ہم دنیا کی تمام آلائشوں سے پاک ہوکر کیوں نہ کریں ؟ مگر آپ نے دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) اور جناب نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے اس باطل اور بےہودہ تصوّف کی کیسی خبر لی ؟ اور کس طرح ۸ھ میں جب مکّہ مکرّمہ فتح ہوا تو جناب نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایّامِ حج میں یہ اعلان کروایا، کہ خبردار آج کے بعد کوئی مشرک یا کوئی برہنہ طواف نہیں کرسکتا - (بخاری ج ۱ ص ۲۲ وغیرہ) صدیوں کی بدعت اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں ختم کی -

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے کیا ہی پتے کی بات ارشاد فرمائی ہے :

اما بعد اوصیک بتقوی اللہ والاقتصاد	اما بعد میں تجھے خدا تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے حکم میں
فی امرہ واتباع سنّۃ نبیّہ صلی اللہ علیہ و	میانہ روی اختیار کرنے اور اس کے نبی صلی اللہ تعالیٰ
سلم وترک ما احدث المحدثون بعد ماجرت	علیہ وسلم کی سنّت کے اتّباع کرنے کی وصیّت کرتا ہوں

به سنّته و كفوا مؤنته فعليك بلزوم السنّة فانها لك باذن الله عصمة ثم اعلم انه لم يبتدع الناس بدعة الا قد مضى قبلها ما هو دليل عليها او عبرة فيها فان السنّة انّما سنها من قد علم ما في خلافها من الخطا والزلل والحمق والتعمق فارض لنفسك ما رضي به القوم لانفسهم فانهم على علم وقفوا وببصر نافذ كفّوا ولهم على كشف الامور كانوا اقوى وبفضل ما كانوا فيه اولى فان كان الهدى ما انتم عليه لقد سبقتموهم اليه۔

(ابوداؤد۔ جلد۲۔ ص۲۷۷)

اور یہ وصیّت کرتا ہوں کہ اہلِ بدعت نے جو بدعتیں ایجاد کی ہیں ان کو ترک کرنا، جبکہ سنّت اس سے قبل جاری ہے اور سنّت کی موجودگی میں بدعت کی ایجاد کی کیا مصیبت ہے؟ سنّت کو مضبوطی سے پکڑنا کیونکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے سنّت حفاظت کا ذریعہ ہے اور جان لے کہ لوگوں نے جو بدعت ایجاد کی ہے اس سے قبل ہی وہ چیز گذر چکی ہے جو اس پر دلیل ہو سکتی تھی یا اس میں عبرت ہو سکتی تھی کیونکہ سنّت ان پاک نفوس کی طرف سے آئی ہے جنہوں نے اس کے خلاف خطاء، لغزش، حماقت اور تعمق کو بغور دیکھ لیا تھا اور اس کو اختیار نہ کیا۔ تو بھی صرف اس چیز پر راضی رہ جس پر قوم راضی ہو چکی ہے کیونکہ انہوں نے علم پر اطلاع پائی اور دور رس نگاہ سے دیکھ کر بدعت سے اجتناب کیا اور البتہ وہ معاملات کی تہ تک پہنچنے پر قوی تر تھے اور جس حالت پہ وہ تھے وہ افضل تر حالت تھی۔ سو اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم گامزن ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ان سے فضیلت میں بڑھ گئے۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد واضح ہے کہ سنّت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ کا بتلایا ہوا اور متعیّن کیا ہوا طریقہ ہے۔ سنّت کے خلاف جو بدعت تھی اس طریقہ پر بھی اُن کی نگاہ اٹھی ہے۔ مگر انہوں نے ہرگز اس کو اختیار نہیں کیا۔ اور آج جو دلائل اہلِ بدعت پیش کرتے ہیں بعینہا یہ دلائل اس وقت بھی موجود تھے، مگر نہ تو اُن کو اِن دلائل سے بدعت کا جواز معلوم ہوا اور ان میں ان کے نزدیک کوئی آنکھ کو بھانے والی عبرت ہی نظر آئی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج اُن دلائل سے بدعات کا جواز اور ثبوت مِل سکتا ہے اور اُس وقت نہ مِل سکا؟ لہٰذا تم اسی چیز کو

اپنے لئے پسند کر دیں کو وہ پسند کر چکے ہیں۔ وہ بڑی فضیلت کے مالک اور دُور رس نگاہ رکھنے والے تھے اور ہدایتِ مستقیمہ پر تھے۔ پھر اگر آج یہ بدعات جائز اور کارِ ثواب ہیں تو اس کا یہی مطلب نکلے گا کہ ہم علم و تقویٰ میں دیانت اور ہدایت میں اُن سے سبقت لے گئے ہیں کہ یہ عبادات اور طاعات ان کو باوجود عمدہ ہونے کے نہ سوجھیں اور ہمیں دستیاب ہو گئیں (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

علامہ شاطبیؒ تحریر فرماتے ہیں :

انك لا تجد مبتدعا ممن ينسب الى الملة الا وهو يستشهد على بدعته بدليل شرعي فينزله على ما وافق عقله وشهوته۔ (الاعتصام ج ۱ ص۱۷۱)

تم کسی ایسے مبتدع کو نہ پاؤ گے جو ملت سے وابستگی کا مدعی ہو، مگر یہ کہ وہ اپنی بدعت پر کسی شرعی دلیل سے ضرور استشہاد کرتا اور اس طریق سے وہ اس کو اپنی عقل اور خواہش کے مطابق بنا لیتا ہے۔

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ارقام فرماتے ہیں :

"زیرا کہ ہر مبتدع وضال عقائد فاسدہ خود را بزعم فاسد خود از کتاب و سنت اخذ می کند پس ہر معنی از معانی مفہومہ ازینہا معتبر نہ باشد۔" (مکتوبات حصہ سوم ص۸ مکتوب ۱۹۳)

کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے فاسد عقائد کو اپنے فاسد خیال کے مطابق کتاب اور سنت سے اخذ کرتا ہے لیکن ہر معنی معانی مفہومہ میں سے حجت اور معتبر نہیں ہو سکتا۔

ان عبارات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر مبتدع اور گمراہ جو ملتِ اسلام سے وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے اپنے باطل اور فاسد عقائد اور خود تراشیدہ بدعات پر کتاب و سنت سے تسکینِ قلب یا الزامِ خصم کے لئے ضرور دلائل تلاش کرتا ہے اور ان دلائل کو اپنی نارسا عقل اور اپنی خواہش کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا قرآن اور حدیث کا نام لے کر خود فریبی میں مبتلا ہونا اور لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنا کسی طرح صحیح نہیں، نہ اس کی سمجھ درست ہے اور نہ قرآن کریم اور حدیث شریف سے اس کی پیش کردہ دلیل ہی صحیح ہے۔ کیونکہ یہی دلائل حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے سامنے بھی تھے مگر ان کو یہ فاسد عقائد اور خود تراشیدہ بدعات

اور رسوم ان سے سمجھ نہ آسکے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج ان سے یہ عقائدِ باطلہ اور بدعاتِ فاسدہ ثابت ہوں۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے منکرینِ تقدیر کے ایک مغالطہ کو (کہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن سے تقدیر کی نفی معلوم ہوتی ہے) دُور کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ:

لقد قرؤا منه ما قرأتم و علموا من تاویله ما جهلتم و قالوا بعد ذٰلك كله بكتاب و قدر۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۲۷۸)

یعنی حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ نے یہ آیتیں بھی پڑھی ہیں جن کو تم پڑھتے ہو لیکن وہ ان کے مطلب کو سمجھے ہیں اور تم نہیں سمجھے اور اُنہوں نے یہ سب آیات پڑھنے کے باوجود تقدیر کا اقرار کیا ہے۔

مطلب واضح ہے کہ اگر تمہاری طرف سے پیش کردہ آیات کا وہی مفہوم ہوتا جو تم پیش کرتے ہو تو یہ آیات حضرات صحابہ کرام اور اہلِ خیر القرون کے سامنے بھی تو تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اِن آیات سے اُن کو یہ مطلب سمجھ نہ آسکا، اور تم اس مطلب کو سمجھ گئے، کیسے باور کر لیا جائے کہ تم حق پر ہو اور وُہ باطل پر تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلویؒ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) نے کیا ہی فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی ہے:

"و میزان در معرفتِ حق و باطل فہمِ صحابہؓ و تابعینؒ است چنانچہ ایں جماعت از تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بانضمام قرائن حالی و مقالی فہمیدہ اند در آں تخطیۂ ظاہر نکردہ واجب القبول است الیٰ ان قال اگر بر خلاف قرن اوّل حمل میکند پس در بدعت او ملاحظہ باید نمود اگر مخالفت ادلّہ قطعیہ یعنی نصوصِ متواترہ و اجماع قطعی است او را

حق اور باطل کے سمجھنے کے لئے میزان اور معیار حضرات صحابہ کرام اور تابعین کا فہم ہے جو کچھ اس جماعت نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم سے حالی اور مقالی قرائن کے انضمام کے ساتھ سمجھا ہے جبکہ اس فہم میں خطا ظاہر نہ کی گئی ہو تو وہ فہم واجب القبول ہے (پھر آگے فرمایا) اگر قرن اوّل کے خلاف کسی بدعتی نے کوئی مفہوم لیا تو اس کی بدعت کو ملاحظہ کرنا ہوگا اگر اس کا متعین کردہ مفہوم کسی قطعی دلیل مثلاً نصوص متواترہ اور اجماعِ قطعی

کافر باید شمرد اگر مخالفت ادلہ ظنیہ قریبۃ الیقین است مانند اخبار مشہورہ و اجماع عرفی گمراہ تواں فہمید دون الکفر۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۵۶)

کے خلاف ہے تو ایسے بدعتی کو کافر شمار کرنا چاہیئے، اور اگر یہ مخالفت ظنی دلائل کی ہے جو یقین کے قریب ہیں۔ مثلاً اخبار مشہورہ اور اجماع عُرفی تو ایسے بدعتی کو گمراہ سمجھنا چاہیئے نہ کہ کافر۔

ان عبارات سے چند امور نہایت وضاحت سے ثابت ہوتے ہیں (۱) یہ کہ کوئی بدعتی اور گمراہ محض دعویٰ کرکے ہی خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اپنے اس دعویٰ پر دلائل پیش کیا کرتا ہے۔ (۲) دلائل بھی محض عقلی نہیں بلکہ قرآن کریم اور احادیث سے وہ اپنے مزعوم پر دلائل لاتا ہے (۳) مگر قرآن کریم اور حدیث سے جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ (۴) اس لئے کہ یہی قرآن اور حدیث حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہ سلف صالحینؒ کے سامنے بھی تھے مگر انہوں نے ان سے یہ مفہوم نہیں سمجھا جو اہلِ بدعت سمجھے ہیں۔ (۵) قرآن کریم اور حدیث کا صحیح مفہوم صرف وہی ہوگا جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے سمجھا ہے۔ (۶) اہلِ بدعت کا پیش کردہ مفہوم اگر دلائلِ قطعیہ کے خلاف ہے تو کفر ہوگا، اور ظنی دلائل کے خلاف ہے تو بدعت اور گمراہی ہوگا بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص اُس زبان سے ناواقف ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اور اسی طرح جو شخص آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی منقول تفسیر کو نہیں جانتا تو اس کے لئے فنِ تفسیر میں سرے سے دخل دینا ہی حرام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

اقول یحرم الخوض فی التفسیر لمن لا یعرف اللسان الذی نزل القرآن بہ والماثور عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ والتابعین من شرح غریب وسبب نزول وناسخ ومنسوخ۔

مَیں کہتا ہوں کہ جو شخص اس زبان سے ناواقف ہو جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو شخص غریب لفظ اور شانِ نزول اور ناسخ ومنسوخ سے بے خبر ہو، جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے منقول ہے تو ایسے شخص کے لئے تفسیر میں

دخل دینا ہی حرام ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۷۲)

اور اہلِ بدعت کی اپنی بدعت کی تائید میں ہر تفسیر نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ و تابعینؒ سے منقول و ماثور ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے بالکل خلاف ہوتی ہے اور لُطف یہ کہ وہ بھی محض خود تراشیدہ اور خود ساختہ، اور ایسے ہی لوگوں کی خود تراشیدہ تفاسیر نے اُمّتِ مرحومہ کا شیرازہ بکھیر کر انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ سچ ہے ؎

ایں چنیں ارکانِ دولت مُلک را ویراں کنند

اور اگر کوئی تفسیر ماثور اور منقول بھی وہ پیش کرتے ہیں تو اس کی بنیاد بھی جعلی موضوع معلول شاذ اور منکر وضعیف وغیرہ روایات اور آثار پر قائم کی جاتی ہے اور صحیح تفاسیر سے عمدًا اغماض کیا جاتا ہے اور کوئی روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے تو اُس کا معنیٰ غلط لیا جاتا ہے اور یہی کچھ وہ قرآن کریم سے کرتے ہیں کہ اپنے باطل عقائد اور آراء کو اس میں دخل دیتے ہیں۔ چنانچہ امام سیوطیؒ (المتوفی ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

مثل طوائف من اہل البدع اعتقدوا مذاہب باطلۃ وعمدوا الی القرآن فتاوّلوہ علیٰ رأیہم ولیس لہم سلف من الصّحابۃؓ والتابعین لا فی رأیہم ولا فی تفسیرہم۔

جیسے اہلِ بدعت کے مختلف گروہوں نے باطل اعتقادات قائم کر لئے اور قرآن کریم سے اپنی باطل آراء پر استدلال کر کے اپنی مرضی پر اس کو ڈھال لیا حالانکہ حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ میں اُن کا کوئی بھی پیش رو نہیں نہ رائے میں اور نہ تفسیر میں۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

وفی الجملۃ من عدل عن مذاہب الصّحابۃؓ والتابعینؒ وتفسیرہم الی ما یخالف ذٰلک کان مخطئًا فی ذٰلک بل مبتدعا لانہم کانوا اعلم بتفسیرہ ومعانیہ کما انّہم اعلم

حاصل کلام یہ ہے کہ جس نے حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعین کے مذاہب اور ان کی تفسیر سے اعراض کیا، اور اس کے خلاف کو اختیار کیا تو وہ شخص خطاکار بلکہ مبتدع ہوگا کیونکہ حضرات صحابۂ کرام اور تابعینؒ

بالحق الذی بعث اللہ به رسوله۔
(تفسیر اتقان جلد دوم ص۱۷۸ طبع مصر)

قرآن کریم کی تفسیر اور اس کے معانی کو زیادہ جانتے تھے جیسا کہ وہ اُس حق کو زیادہ جانتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا تھا۔

اور یہی علامت ہے غلط مذہب کی کہ اس کی بنیاد غلط درایت اور بے بنیاد روایت پر رکھی جاتی ہے۔ اگر اہلِ بدعت حضرات صرف اسی اُصول کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ان کو جملہ محدثات اور بدعات پر دُھڑا دھڑ دلائل پیش کرنے سے یقیناً رُستگاری حاصل ہو جائے ؎

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو میگویم
تُو خواہ ازیں سخنم پند گیر خواہ ملال

باب ششم

جب کسی چیز کے سُنّت اور بدعت ہونے میں اشتباہ واقع ہو تو کیا کرنا چاہیئے؟

سابق پیش کردہ دلائل سے بحمد اللہ تعالیٰ سنّت اور بدعت کی حقیقت اور اس کا حکم واضح سے واضح تر ہوگیا ہے۔ لیکن اگر بالفرض کسی کوڑ مغز اور کم فہم کو اشتباہ باقی رہے یا عوام النّاس جو اس قسم کے مسائل میں فریقین کے دلائل کا موازنہ کر کے صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں تو ان کے لئے صحیح راہِ عمل صرف یہی ہے کہ وہ ایسے مشکوک اور مشتبہ کام کے پاس ہی نہ جائیں، اور اگر کسی چیز کے بدعت اور سنّت یا مستحب اور مباح ہونے میں شبہ ہو تو اس سے بچنا ہی ان کے لئے صحیح راہِ عمل ہے، اور باتّفاقِ علماء ان کے لئے یہی طریقہ صحیح رہنمائی کے لئے بالکل کافی ہے۔ چنانچہ حضرت وابصۃؓ بن معبدؓ (المتوفی سـ۹۰ـھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

والاثم ما حاك فی نفسك و تردد فی الصدر وان افتاك الناس۔ (رواہ احمد والدارمی مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۴۲)

گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور تیرے دل میں تردّد واقع ہو، اگرچہ لوگ (اور نام کے مفتی) تجھے فتویٰ بھی دے دیں۔

اور حضرت عطیۃ السّعدیؓ (المتوفی سـ۰۰ـھ) فرماتے ہیں کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ بندہ

لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتّٰی یدع مالا بأس به حذرا لما به بأس۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۴۲)

پرہیزگاروں کے رُتبہ کو نہیں پہنچ سکتا تاوقتیکہ وہ چیزیں نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ وہ ذریعہ بنتی ہیں ایسی چیزوں کا جن میں حرج ہے۔

حضرت معاذؓ بن جبل کو جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ارشاد فرمایا:

لا تقضین ولا تفصلن الا بما تعلم وان اشکل علیک امر فقف حتّٰی تبیّنہٗ او تکتب الیّ فیہ۔ (ابن ماجہ ص۶)

کہ تم بغیر علم کے کوئی حکم اور فیصلہ ہرگز صادر نہ کرنا اور اگر تم پر کسی چیز میں اشکال گذرے تو توقّف کرنا حتّٰی کہ تم اس کو اچھی طرح روشن پا لو اور یا میری طرف خط لکھنا۔

حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ (المتوفی ۶۴ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحلال بیّن والحرام بیّن وبینھما مشتبھات لا یعلمھا کثیر من النّاس فمن اتّقی الشبھات استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبھات وقع فی الحرام کالراعی حول الحمٰی یوشک ان یرتع فیہ۔ (بخاری ج ۱ ص۱۳، ابن ماجہ ص۲۹۶)

کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں ان کو بہت سے لوگ نہیں جانتے سو جو شخص ان مشتبہات سے بچا تو اُس نے اپنا دین اور عزّت بچالی اور جو مشتبہات میں جا پڑا تو (گویا) وہ حرام میں جا پڑا جیسے چراگاہ کے اردگرد جانوروں کو چرانے والا قریب ہے کہ چراگاہ میں جا پڑے۔

اِن رِوایات سے آفتابِ نیم روز کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن اُمور میں اشتباہ واقع ہو، ان میں اپنے دین اور عزّت کو صرف اسی صورت میں محفوظ رکھا جا سکتا ہے کہ ایسے کاموں میں انسان دخل ہی نہ دے اور ان پر عمل پیرا ہو کر ہرگز اپنی ابدی زندگی کو برباد نہ کرے اور خلقِ خدا کو گمراہ ہونے سے بچائے، خصوصاً ایسے کام جو کفر اور شرک و بدعت کا ذریعہ بنتے ہوں اور یہ معاملہ صرف یہیں بس نہیں ہو جاتا بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تردّد اور اشتباہ والے کاموں سے بچنے کا صریح حکم ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت حسنؓ بن علیؓ (المتوفی ۵۰ھ) روایت کرتے ہیں،

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

یقول دع ما یریبك الیٰ ما لا یریبك فان الخیر طمانیة وان الشر ریبة۔ (مستدرک ج ۲ ص۱۳ ۔قال الحاکمؒ والذہبیؒ صحیح)

وہ چیز چھوڑ دے جو تجھے تردّد اور اشتباہ میں ڈالے اور ایسی چیز اختیار کر جو تیرے لئے باعثِ تردّد نہ ہو کیونکہ خیر باعثِ اطمینان اور شر باعثِ شک ہے۔

یہ صریح اور صحیح حدیث بھی اس امر کو روشن کر دیتی ہے کہ جس چیز میں تردّد اور اشتباہ ہو، تو ایسی چیز کو چھوڑنا ہی ضروری ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی روشن سنّتیں زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے پاس موجود ہیں جن میں کسی قسم کا ادنیٰ سے ادنیٰ شک اور شبہ بھی نہیں ہے اور وہی روشن سنّتیں طمانیتِ قلب کا کافی سامان مہیا کر دیتی ہیں اور ان کی خلاف ورزی شک اور شبہ کے تاریک گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ احادیث میں اس کی تصریح آتی ہے کہ (کان النبیّ صلی اللہ علیه وسلم یحب التیامن) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (سرمہ لگانے، کپڑا پہننے، وضو کرنے میں حتّٰی کہ ہر کام میں) داہنے پہلو اور جانب کو ترجیح دیتے تھے۔ معہٰذا حضرت عبد اللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ :

قال لا یجعل احدکم للشیطان شیئا من صلاتہ یریٰ ان حق علیه ان لا ینصرف الا عن یمینه لقد رایت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کثیرا ینصرف عن یسارہ۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص۸۷)

تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کے لئے کچھ حصّہ نہ ٹھہرائے بایں طور کہ نماز سے فارغ ہوتے وقت دہنی طرف ہی پھرنے کو اپنے اوپر لازم سمجھ لے اس واسطے کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بسا اوقات بائیں طرف بھی مڑتے دیکھا ہے۔

اس حدیث کی تفسیر اور تشریح میں مشہور محقق علامہ محمد طاہر الحنفیؒ (المتوفی ۹۸۶ھ) فرماتے ہیں :

فیه من اصر علیٰ امر مندوب وجعله عزما ولم یعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشیطان من الاضلال فکیف من اصر علیٰ بدعة او منکر۔ (مجمع البحار ج ۳ ص۲۲۴)

کہ جس کسی نے کسی مندوب اور مستحب چیز پر اصرار کیا اور اس کو عزیمت بنا لیا اور رخصت پر عمل نہ کیا تو گویا اس کو شیطان نے گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا۔ کیا حال ہوگا اس شخص کا جو کسی بدعت اور بُری چیز پر اصرار کرتا ہے۔

اور یہی الفاظ علامہ طیبیؒ (الحنفی المتوفی ۷۴۳ھ) شرح مشکوٰۃ میں اور حضرت ملا علی قاریؒ نے مرقات جلد ۲ ص ۲۵۳ میں تحریر فرمائے ہیں جو اس امر کی واضح ترین دلیل ہے کہ بدعت اور منکر پر اصرار کرنا تو کجا رہا، اگر کوئی شخص امرِ مندوب اور مستحب پر یا رخصت پر بھی اصرار کرے گا تو وہ بھی شیطان کا پیرو کار ہوگا اور اُس کے اس فعل میں شیطان کا حِصّہ ہوگا۔ علامہ برکلی الحنفی (المتوفی ۹۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

ثم اعلم ان فعل البدعة اشد ضررا من ترك السنة بدليل ان الفقهاء قالوا اذا تردد الحكم فى شيئ بين كونه سنة و بدعة فتركه لازم۔ (طریقہ محمدیہ ص)	تم جان لو کہ بدعت کا کام کرنا ترک سنّت سے زیادہ مضر ہے۔ دلیل یہ ہے کہ حضرات فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی حکم سنّت اور بدعت کے درمیان دائر ہو تو اس کا ترک کرنا ہی ضروری ہوگا۔

اور فتاوٰی عالمگیری میں ہے کہ:

وما تردد بين البدعة والسنة يترك۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۷۹ مصری)	جو چیز سنّت اور بدعت کے درمیان دائر ہو وہ چھوڑی جائے گی

اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ:

اذا تردد الحكم بين سنة وبدعة كان ترك السنة راجحا على فعل البدعة (شامی ج ۱ ص ۶)	جب حکم سنّت اور بدعت کے درمیان دائر ہو تو سنّت کا ترک کرنا فعل بدعت پر مقدّم ہوگا۔

قاضی ابراہیم صاحب الحنفیؒ فرماتے ہیں:

"جس کام کے بدعت اور سنّت ہونے میں شبہ ہو اس کو چھوڑ دے کیونکہ بدعت کا چھوڑنا ضروری ہے اور سنّت کا ادا کرنا ضروری نہیں"۔ (نفائس الازہار ترجمہ مجالس الابرار ص ۱۲۹)

اور شیخ عبد الحق محدّث دہلوی لکھتے ہیں:

"و ہر چہ دراں شبہ بود توقف دراں لازم"۔ (مکتوبات حضرت الشیخ رح بر حاشیہ اخبار الاخیار ص ۱۰)۔

بلکہ علامہ ابنِ نجیم الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

و یلزم ان ما تردد بین بدعة و واجب اصطلاحی فانه یترك كالسنة۔ جو چیز بدعت اور واجب اصطلاحی کے درمیان دائر ہو تو لازم ہے کہ اس کو سنّت کی طرح ترک کر دیا جائے۔ (بحر الرائق۔ ج ۲ ص۱۶۵)

یہ عبارات اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ جب کوئی چیز ایسی ہو کہ اس میں سنّت کے پہلو کے ادا کرنے سے بدعت لازم آتی ہو تو سنّت کے پہلو سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کو مطلقاً ترک کرنا ضروری ہو گا۔ اس لئے کہ اس کے ساتھ بدعت کا پہلو بھی تو شامل ہے۔ سنّت تو خیر پھر سنّت ہے اگر کوئی چیز بدعت اور حضرات فقہاء کرام کے اصطلاحی واجب کے درمیان بھی دائر ہو تو اس کو بھی ترک کرنا لازم اور ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے فی الجملہ بدعت کی ترویج اور اشاعت کا اندیشہ ہے۔ اور بدعت اتنی قبیح ترین چیز ہے کہ شریعتِ مطہرہ اس کے وجودِ نامسعود تک کو گوارا نہیں کرتی، چہ جائیکہ اس کی نشر و اشاعت کے ذرائع اور وسائل بہم پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ بدعت کو ختم کرنے کے لئے مستحب، سنّت اور حتیٰ کہ واجب تک کی قربانی بھی گوارا کر لی جائے گی مگر بدعت کو ہرگز ہرگز فروغ نہ دیا جائے گا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ بدعت میں آلودہ ہونا چاہے تو اس کی مرضی۔ ہمارے لئے سنّت کافی ہے اور ہمیں محدثات اور مزخرفات میں الجھنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے، وللہ درّہٗ ؎

وخیر امور الدین ما کان سنّة
و شرّ الامور المحدثات البدائعٗ

قارئین! اگر آپ کو صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ سے لگاؤ اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے عشق اور محبّت ہے تو اس کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ سنّت کی اتباع کریں اور حضرات صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے نقشِ قدم پر چلیں۔ وہی عقائد و اعمال اختیار کریں جو انہوں نے اختیار کئے اور ان تمام عقائد اور اعمال سے احتراز کریں جن سے انہوں نے احتراز کیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کے قول (جو درحقیقت مرفوع حدیث میں ہے) کے مطابق مسجدوں میں

بھی اجتماع ہو اور ایمان سے بھی محرومی ہو۔

قال یأتی علی الناس زمان یجتمعون فی المساجد لیس فیھم مؤمن۔
(مستدرک ج ۴ ص ۴۴۳، قال الحاکمؒ والذہبیؒ صحیح)

حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ مسجدوں میں اکٹھے تو ہوں گے لیکن اُن میں ایک بھی مؤمن نہ ہوگا۔

یہ وہی حضرت ابنِ عمرؓ ہیں جنہوں نے تثویب جیسی بدعت کی وجہ سے ایک مسجد ہی ترک کر دی تھی۔ الغرض اخلاص اور اتباعِ سنّت کے ساتھ معمولی عبادت بھی مفید ہے اور شرک اور بدعت کو دل میں جگہ دینے سے بڑی سے بڑی عبادت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاصِ عمل اور اتباعِ سنّت کی توفیق عطا فرمائے۔ صرف اسی کی بارگاہ سے سب کچھ مل سکتا ہے۔

اُسی سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبرؔ
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

بابِ ہفتم

اس باب میں فرداً فرداً ان تمام بدعات پر بحث ہوگی، جن پر فریقِ مخالف عمل پیرا ہے اور جن کو وہ بزعمِ خود شعارِ حنفیت قرار دیتا ہے

محفلِ میلاد

اس میں شک و شبہ کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و عقیدت اور محبّت عین ایمان ہے۔ اور آپ کی ولادت سے لے کر وفات تک زندگی کے ہر شعبہ کے صحیح حالات و واقعات اور آپ کے اقوال و افعال کو پیش کرنا باعثِ نزولِ رحمتِ خداوندی ہے۔ اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی کے حالات کو معلوم کرے اور ان کو مشعلِ راہ بنائے۔ سال کے ہر مہینہ میں اور مہینہ کے ہر ہفتہ میں اور ہفتہ کے ہر دن میں اور دن کے ہر گھنٹہ اور منٹ میں کوئی وقت ایسا نہیں جس میں آپ کی زندگی کے حالات بیان کرنے اور سُننے ممنوع ہوں۔ یہ بات محل نزاع نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ربیع الاوّل کی بارھویں تاریخ کو مقرر کرکے اس میں میلاد منانا، محفل اور مجلس منعقد کرنا، جلوس نکالنا یا اسی دن کو مخصوص کرکے فقراء اور مساکین کو کھانا کھلانا، وغیرہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور اہلِ خیر القرون سے ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو کسی مسلمان کو اس میں پس و پیش کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے کیونکہ جو کچھ انہوں نے فعلاً یا ترکاً کیا، وہی دین ہے اور اس کی مخالفت بے دینی ہے۔ تئیس سال آپ بعد از نبوّت قوم میں زندہ رہے

اور پھر تیس[۳۰] سال خلافتِ راشدہ کے گذرے ہیں اور پھر ایک سو دس ہجری تک حضرات صحابہ کرامؓ کا دور رہا ہے۔ کم و بیش دو سو بیس برس تک اتباعِ تابعینؒ کا زمانہ تھا، عشق ان میں کامل تھا، محبت اُن میں زیادہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا احترام اور تعظیم ان سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے؟ اگر فریقِ مخالف ہمت کر کے ان سے یہ ثابت کر دے تو چشمِ ما روشن دلِ ماشاد، کسی مسلمان کو اس سے سرِ مو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر فریقِ مخالف خیر القرون سے اس کا ثبوت نہ پیش کر سکے اور تا قیامت نہیں کر سکے گا، تو سوال یہ ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے یہ مبارک کام اور کارِ ثواب اُس وقت کیوں نہ ہوا؟ اور آج یہ کیسے کارِ ثواب اور مبارک ہو گیا ہے؟ بس صرف اسی ایک نقطہ پر نگاہ جما کر دو ٹوک فیصلہ کرنا چاہیئے۔ وہ تمام فوائد و برکات، اور منافع اُس وقت بھی تھے، جن کو آج اہلِ بدعت حضرات بیان کرتے ہیں، اور خان صاحب بریلوی، مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی، مولوی عبد السمیع صاحب، مولوی محمد صالح صاحب، مفتی احمد یار خان صاحب اور مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے اس کے اثبات پر جو دُور از کار، بے فائدہ اور لایعنی دلائل پیش کر کے صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔ اُن کو صرف اور صرف اس مرکزی نقطہ پر نگاہ جمانی چاہیئے تھی کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اور اہلِ خیر القرون نے کہا اور کیا وہی دین ہے اور بس ؎

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ یاد رہے کہ محفلِ میلاد و مجلسِ میلاد اور چیز ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا نفسِ ذکرِ ولادت با سعادت اور شئے ہے۔ اوّل بدعت ہے اور ثانی مندوب و مستحب ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں:

"نفسِ ذکرِ ولادت مندوب ہے اور اس میں کراہت قیود کے سبب سے آئی ہے (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص۱۱۰)۔ نیز لکھتے ہیں: نفسِ ذکرِ ولادت فخرِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مندوب ہے مگر بسبب انضمام ان قیود کے یہ مجلس ممنوع ہو گئی۔" (ج ۱ ص۱۱۱)۔

اگر کسی عالی فہم کو نفسِ ذکرِ ولادت اور عقدِ مجلس اور محفلِ میلاد کا فرق سمجھ نہ آئے تو اس کا ہمارے پاس کیا علاج ہے؟ ؎

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے — اس میں بھلا قصور کیا ہے آفتاب کا

مجلسِ میلاد کی تاریخ پوری چھ صدیاں گزر چکی تھیں کہ اس بدعت کا کہیں مسلمانوں میں رواج نہ تھا۔ یہ نہ تو کسی صحابی کو سُوجھی نہ تابعی کو نہ کسی محدّث کو اور نہ فقیہہ کو، نہ کسی بزرگ کو اور نہ کسی ولی کو۔ یہ بدعت اگر سُوجھی تو ایک مسرف بادشاہ کو اور اس کے ایک رفیق دنیا پرست مولوی کو۔ یہ بدعت سنہ ۶۰۴ھ میں موصل کے شہر میں مظفر الدّین کوکری بن اربل (المتوفی سنہ ۶۳۰ھ) کے حکم سے ایجاد ہوئی جو ایک مسرف اور دین سے بے پروا بادشاہ تھا (دیکھئے ابن خلکان وغیرہ) اور امام احمدؒ بن محمدؒ مصری مالکیؒ (المتوفی سـھ) لکھتے ہیں کہ:

کان ملکاً مسرفا یامر علماء زمانه ان یعملوا باستنباطهم واجتهادهم وان لا یتبعوا لمذهب غیرهم حتی مالت الیه جماعة من العلماء وطائفة من الفضلاء ویحتفل لمولد النبیّ صلی الله علیه وسلّم فی الرّبیع الاوّل وهو اوّل من احدث من الملوك هذا العمل۔ (القول المعتمد فی عمل المولد ص)

وہ ایک مُسرف بادشاہ تھا۔ علماء زمانہ سے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنے استنباط اور اجتہاد پر عمل کریں اور غیر کے مذہب کی پیروی نہ کریں۔ حتّٰی کہ (دنیا پرست) علماء اور فضلاء کی ایک جماعت اس کی طرف مائل ہوگئی اور وہ ربیع الاوّل میں میلاد منعقد کیا کرتا تھا۔ بادشاہوں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ بدعت گھڑی ہے۔

اور یہ مسرف بادشاہ بیت المال اور رعایا کی لاکھوں کی رقم اس بدعت اور جشن پر صرف کر دیتا تھا اور اسطرح اُس نے رعیت کے قُلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کا ایک دینی ڈھونگ رچا رکھا تھا اور بدریغ ملک اور قوم کی رقم کو اس طرح برباد کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ علّامہ ذہبیؒ (المتوفی سنہ ۷۴۸ھ) نقل کرتے ہیں کہ:

کان ینفق کل سنة علی مولد النبیّ صلی الله علیه وسلم نحو ثلاث مائة الف۔

وہ ہر سال میلاد (جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) پر تقریباً تین لاکھ روپیہ خرچ کیا کرتا تھا۔

اور جس دُنیا پرست مولوی نے اس جشن کے دلدادہ بادشاہ کے لئے محفلِ میلاد کے جواز پر مواد اکٹھا کر دیا تھا، اُس کا نام عمر بن دحیہ ابو الخطاب (المتوفی ۶۳۳ھ) تھا، جس کو اس کتاب کے صلے میں صاحبِ اربل اور مسرف بادشاہ نے ایک ہزار پونڈ انعام دیا تھا (دول الاسلام ص۱۰۲) - اب ذرا اس مولوی کی تعریف بھی ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ حضرت کیسے تھے؟ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نقل کرتے ہیں کہ:

كثير الوقيعة في الائمة وفي السلف من العلماء خبيث اللسان احمق شديد الكبر قليل النظر في امور الدين متهاونا - (لسان الميزان ج۴ ص۲۹۶)

وہ ائمہ دین اور سلف کی شان میں بہت ہی گستاخی کیا کرتا تھا۔ گندی زبان کا مالک تھا۔ بڑا احمق اور متکبر تھا۔ دین کے کاموں میں بڑا بے پروا اور سُست تھا۔

نیز حافظ موصوفؒ نقل کرتے ہیں کہ:

قال ابن النجار رأيت الناس مجتمعين على كذبه وضعفه (لسان الميزان ج۴ ص۲۹۵)

علامہ ابن نجارؒ فرماتے ہیں کہ مَیں نے لوگوں کو اس کے جھُوٹ اور ضُعف پر متفق پایا۔

حضرات! آپ نے دیکھا کہ مجلسِ میلاد کو رائج کرنے والا ایک فریب خوردہ اور مسرف بادشاہ تھا۔ جو علماء کو بجائے سلف صالحینؒ کے مذہب کی اتباع کرنے کے اپنے قیاس اور اجتہاد سے کام لینے کا حکم دِیا کرتا تھا۔ اور رعایا کی سادگی اور مذہبی شوق سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اُس نے اپنی ملکی سیاست کو محفوظ کیا اور حظِ نفس کے لئے راستہ ہموار کیا، اور جوازِ میلاد پر کتاب لکھنے والا وہ دُنیا پرست مولوی اُس کو مِل گیا جس کی گندی اور ناپاک زبان سے سلفِ صالحینؒ بھی نہ چھُوٹے اور وُہ احمق اور متکبر ہونے کے ساتھ دین کے معاملات میں بھی بہت بے پروا اور سُست تھا۔ اور اس چالاک بادشاہ اور ہوشیار مولوی کے ساتھ وُہ بے چارے پیر اور صوفی بھی شامل ہو گئے جو دین کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے اور جو سادہ ہونے کی وجہ سے ہر چھلکے اور پوست کو مغز سمجھ لیتے ہیں۔ پھر جب بادشاہ اور ماہر نفسیات مولوی اور سادہ قسم کے صوفیاء اس کام کو دین کا کام بتا کر عوام سے اپیل کریں تو عوام بے چارے اس میں کیوں نہ پھنسیں۔

حضرت عبد اللہؒ بن مبارکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

وهل افسد الدين الا الملوك   واحبار سوء ورهبانها

اب جس کی مرضی ہے کہ وہ خیر القرون کی اتباع کرتا ہے یا نفس پرست بادشاہ اور زر پرست مولوی کی ؟ ہم تو خیر القرون کی اقتدار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسی کی توفیق دے۔ اور اس محفلِ میلاد کی ہر زمانہ کے اہلِ حق اور ہر طبقہ کے علماء نے پُرزور تردید کی ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ حنبلیؒ نے (اپنے فتاویٰ جلد ۱ ص۳۱۲ میں) اور امام نصیر الدین شافعیؒ نے (دیکھئے ارشاد الاخیار ص۲) اور حضرت مجدد الف ثانی الحنفیؒ نے (مکتوبات حصہ ۵ ص۳۲ میں) اور علامہ ابنِ امیر الحاج مالکیؒ نے پوری صراحت اور وضاحت سے اس کی تردید کی ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ:

ومن جملة ما احدثوه من البدع مع اعتقادهم ان ذلك من اكبر العبادات واظهار الشعائر ما يفعلونه فى الشهر الربيع الاول من المولد وقد احتوى ذلك على بدع ومحرمات الى ان قال وهذه المفاسد مترتبة على فعل المولد اذا عمل بالسماع فان خلا منه وعمل طعاما فقط ونوى به المولد ودعا اليه الاخوان وسلم من كل ما تقدم ذكره فهو بدعة بنفس نيته فقط لان ذلك زيادة فى الدين وليس من عمل السلف الماضين واتباع السلف اولى۔
(مدخل ابن الحاج مطبوعہ مصر ج ۱ ص۸۵)

لوگوں کی اُن بدعتوں اور نوایجاد باتوں میں سے جن کو وہ بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور جن کے کرنے کو شعائرِ اسلامیہ کا اظہار کہتے ہیں، ایک مجلسِ میلاد بھی ہے جس کو وہ ماہ ربیع الاوّل میں کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے (آخر میں فرماتے ہیں) اور اس مجلسِ میلاد پر یہ مفاسد اُس صورت میں مرتب ہوتے ہیں جبکہ اس میں سماع ہو سو اگر مجلسِ میلاد سماع سے پاک ہو اور صرف بہ نیتِ مولود کھانا تیار کر لیا ہو اور بھائیوں اور دوستوں کو اس کے لئے بُلایا جائے اور تمام مذکورہ بالا مفاسد سے محفوظ ہو، تب بھی وہ صرف نیت (عقدِ مجلسِ میلاد) کی وجہ سے بدعت ہے اور دین کے اندر ایک جدید امر کا اضافہ کرتا ہے، جو سلف صالحین کے عمل میں نہ تھا حالانکہ اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا اور اُن کی پیروی کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

اور علامہ عبدالرحمٰن مغربیؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ:

ان عمل المولد بدعة لم يقل به ولم يفعله

بہ تحقیق میلاد کا کرنا بدعت ہے۔ نہ تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلفاء والائمۃ۔ (کذا فی الشرعۃ الالٰہیہ)
علیہ وسلم نے اور آپ کے حضرات خلفاء راشدینؓ اور آئمہ مجتہدین نے خود اس کو کیا اور نہ اس کا حکم دیا۔

اور علامہ احمدؒ بن محمد مصری مالکیؒ لکھتے ہیں کہ:

قد اتفق علماء المذاہب الاربعۃ بذم ھذا العمل۔ (القول المعتمد)
چاروں مذہب کے علماء اس عمل میلاد کی مذمت پر متفق ہیں۔

قارئین کرام! آپ اِن ٹھوس حوالوں سے اس مسئلہ کی تہ تک تو پہنچ ہی گئے ہوں گے کہ خیر القرون میں یہ عمل نہ تھا بلکہ چھٹی صدی کے بعد یہ ایجاد ہوا تھا، اور اس کے موجدین کا حال بھی معلوم ہو چکا ہے کہ بادشاہِ وقت اس کا سرپرست تھا اور بحسب، "النّاس علیٰ دینِ ملوکہم" عوام کا اس سے متاثر ہونا ہرگز بعید از قیاس نہ تھا۔ عوام تو کیا بلکہ بعض خواص بھی اس کے عالمگیر پروپیگنڈا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان مسلمانوں کے اس عمل کے جواز کے لئے شرعی دلائل کی تلاش اور جستجو شروع کر دی گئی اور دُور دراز کے قیاسات سے کام لے کر اس گاڑی کو چلانے کی کوشش کی گئی اور امام جلال الدین سیوطی مصریؒ (المتوفی سنہ ۹۱۱ھ) جیسے وسیع النظر عالم کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

لیس فیہ نص ولکن فیہ قیاس۔
اس کے جواز پر نص تو کوئی نہیں البتہ قیاس ہے۔

(حسن المقصد فی عمل المولد)

اور اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر لیا کہ قرآن کریم، حدیث شریف، اور اجماع سے کوئی نص اس میلاد کے جواز پر موجود نہیں ہے، ہاں البتہ قیاس ہے۔ اور قیاس جو پیش کیا وہ بھی فاسد، اور یہ بات بھی نظر انداز کر دی گئی کہ جس چیز کا سبب اور محرّک خیر القرون میں موجود تھا، اس میں قیاس اور اجتہاد کرنے کی گنجائش ہی کہاں سے پیدا ہو گئی؟ اور مولوی عبد السمیع صاحب، (وغیرہ) جب آئے تو انھوں نے اپنے دل کی تسکین اور اپنے حواریوں کی تشفّی کے لئے تہتر ۷۳ ناموں کی فہرست بھی دے دی کہ یہ حضرات عمل مولد کو مستحسن سمجھتے تھے (انوارِ ساطعہ ص ۲۴۸/۲۵۰) مگر اس پر غور نہ کیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا نام بھی ان میں ہے یا نہیں؟ حضرات ائمہ مجتہدین اور مستند محدثینؒ کا ذکر بھی ہے یا نہیں؟ پھر اس پر

بھی غور نہ کیا کہ ان میں اکثریت صوفیاء کرام کی ہے، جن کا عمل بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ حجت نہیں۔ عمل صوفیہ در حل و حرمت سند نیست ۔۔ اور جو بعض محقق عالم ہیں، وہ خود قیاسِ فاسد کی غلطی کا شکار ہیں، اور بعض وہ بھی ہیں جو اس تاریخ میں فقط فقراء کو کھانا کھلاتے تھے اور بعض نفسِ ذکرِ ولادت کے استحباب کے قائل ہیں اور بعض صرف دل میں خوشی کے اظہار کے قائل ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۱۷ھ) سے بھی محفلِ میلاد کے اثبات کا حوالہ دیا ہے کہ وہ اپنے رسالہ "ہفت مسئلہ" ص۸ میں اس کو جائز اور باعثِ برکت کہتے ہیں (محصلہ جاء الحق ص۲۲۷) مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رسالہ ہفت مسائل حضرت حاجی صاحب کے قلم کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ نفسِ مضمون حاجی صاحبؒ کا ہے اور عبارت حضرت تھانویؒ کی ہے۔ (دیکھئے حاشیہ فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص۱۰۱) اور حضرت تھانوی اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اس کے جواز کے قائل تھے، پھر رجوع کر لیا تھا۔ اور حضرت حاجی صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ نفسِ ذکر مندوب اور قیود بدعت ہیں (حاشیہ مذکور ص۱۰۲) پھر وہ مفاسد بھی اُن کے وقت اور اُن کے ذہن میں نہ تھے جو لوگوں میں مروّج تھے۔ (دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص۱۰۱) پھر حاجی صاحبؒ کسی شرعی دلیل کا نام نہیں ہے۔ لہذا حاجی صاحبؒ کا ذکر کرنا سوالاتِ شرعیہ میں بے جا ہے (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص۹۸)

یہ یاد رہے کہ میلاد کا جلوس انگریز کے زمانہ میں ایک خاص مصلحت کے تحت پٹی ضلع لاہور سے دو شخصوں نے ایجاد کیا تھا۔ مولوی عبد المجید صاحب جو فوت ہو چکے ہیں اور جناب حاجی عنایت اللہ صاحب جو تا دمِ تحریر لاہور میں بقیدِ حیات ہیں۔ بلکہ وہ اس جلوس کے تنہا بانی ہونے کے مدعی ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی انوکھی دلیل

وہ لکھتے ہیں کہ حرمین شریفین میں بھی نہایت اہتمام سے یہ مجلسِ پاک منعقد کی جاتی ہے۔ جس مُلک میں بھی جاؤ مسلمانوں میں یہ عمل پاؤ گے۔ اولیاء اللہ و علماء اُمت نے اس کے بڑے بڑے فائدے اور برکات بیان فرمائی ہیں (الی ان قال) لہذا محفلِ میلاد پاک مستحب ہے (جاء الحق ص۲۲۴) اور ص۲۲۷ میں لکھتے ہیں کہ "استحباب کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ

مسلمان اس کو اچھا جانیں"۔ (بلفظہٖ)

الجواب : یہی حرمین الشریفین بھی تھے اور حضرات صحابۂ کرامؓ و تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور ائمۂ مجتہدینؒ جیسے اولیاء اللہ اور علماء اُمّت بھی تھے، اُن کو یہ فائدے اور برکات کیوں نہ سمجھ آسکے؟ اور وہ اس مروّجہ مجلسِ پاک کے منافع سے کیوں محروم رہے، پھر چھ صدیوں تک جس مُلک کے مسلمانوں کو دیکھا، اُن میں یہ عمل نہ پایا گیا۔ نہ معلوم وہ اس کی برکات سے کیوں بہرہ ور نہ ہو سکے؟

بلاشک حرمین الشریفین کی نصوص سے بڑی فضیلت اور رُتبہ ثابت ہے۔ لیکن شرعی دلائل صرف چار ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر حرمین الشریفین میں اچھے کام ہوں تو نورٌ علیٰ نور، ورنہ ہرگز حجّت نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت مُلا علی القاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

فی الحرمین الشریفین من شیوع الظلم و کثرۃ الجہل وقلۃ العلم وظہور المنکرات و فشوع البدع و اکل الحرام والشبہات۔ (مرقات ج ۳ - ص۱۷)	حرمین شریفین میں ظلم شائع ہے، جہالت کثیر ہے علم کم ہے، منکرات کا ظہور ہے، بدعات رائج ہیں۔ حرام کھایا جاتا ہے، دینی شبہات بھی بکثرت ہیں۔

مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ رشک ہے کہ استحباب کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ مسلمان اس کو اچھا جانیں ـــ بدعات کی نشر و اشاعت کے لئے کیا چور دروازہ تلاش کیا گیا ہے، اور یہ بھول گئے کہ استحباب تو اُونچی چیز ہے، اباحت بھی حکم شرعی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر اس کا ثبوت بھی نہیں ہو سکتا، جس کی پوری تفصیل یا دلائل گذر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ علّامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

الندب حکم شرعی لا بد لہ من دلیل (ردالمختار)	استحباب شرعی حکم ہے، اس کے لئے دلیل درکار ہے۔

مفتی صاحب تو یوں ہی گلو خلاصی کرنا چاہتے ہیں مگر کون اس طرح ان کو چھوڑتا ہے ؏

کلکِ ما نیز زبانے و بیانے دارد

میلاد میں قیام کرنا | کسی بزرگ کے لئے جو بنفس نفیس آئے، بعض حالات میں بشرطیکہ افراط اور

تفریط نہ ہو، قیام درست ہے اور اس پر حضرت امام نوویؒ وغیرہ نے قوموا الیٰ سیدکم کی حدیث سے استدلال کیا ہے (شرح مسلم ج ۲ ص ۹۵)

بعض دوسرے حضرات اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حضرت سعدؓ بن معاذ زخمی تھے اور آپ نے اُن کو گدھے سے اُتارنے کے لئے یہ فرمایا تھا۔ چنانچہ مسند احمد کی روایت میں ہے: قوموا الیٰ سیدکم فانزلوہ من الحمار۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے قوموا الیٰ سیدکم فرمایا ہے لسیدکم نہیں فرمایا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل اس موقع پر کیا تھا، اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اس موقع پر کس عمل کو پسند اور کس کو مکروہ سمجھتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ:

لم یکن شخص احب الیھم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانوا اذا رأوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیتہ لذالک۔ (رواہ الترمذی ج ۲ ص ۱۰۰ وقال ہذا حدیث حسن صحیح۔

حضرات صحابہ کرام کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے بڑھ کر اور کوئی محبوب نہ تھا لیکن جب وہ آپ کو دیکھتے تھے تو قیام نہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس قیام کے عمل کو مکروہ سمجھتے تھے۔

ومشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۰۳ ومسند احمد ج ۳ ص ۱۵۱ والادب المفرد ص ۱۳۸)

اس صحیح حدیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے لئے قیام کو پسند نہ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ باوجودیکہ ان کو آپ سے انتہائی محبت تھی، قیام نہ کرتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ جس چیز کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی پسند نہ کرتے ہوں اور کمال محبت کے باوجود حضرات صحابہ کرامؓ بھی اس پر عمل نہ کرتے ہوں (جبکہ بنفس نفیس آپ موجود بھی تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو نظر بھی آتے تھے) تو پھر آج جبکہ آپ کا کسی مجلس میلاد میں آنا کسی شرعی دلیل سے ثابت ہی نہیں (دیکھئے راقم الحروف کی کتاب تبرید النواظر) اور نہ کسی کو نظر آتے ہیں تو پھر کس طرح قیام کو جائز اور مستحب قرار دیا جاتا ہے، بلکہ واجب اور فرض کہا جاتا ہے اور قیام نہ کرنے والے کی تکفیر کی جاتی ہے۔

مولوی عبدالسمیع صاحب محمد بن یحییٰ مفتی حنابلہ سے اپنی تائید میں نقل کرتے ہیں کہ :۔

یجب القیام عند ذکر ولادة صلی اللہ علیہ وسلم۔ (انوار ساطعہ ص۲۵۰) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت کے ذکر کے وقت قیام کرنا واجب ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی غفلت ملاحظہ کیجئے کہ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ مسلمانوں پر محض بہتان ہے کہ وہ قیامِ میلاد کو واجب سمجھتے ہیں۔ نہ کسی عالمِ دین نے لکھا کہ قیام واجب ہے اور نہ تقریروں میں کہا۔ عوام بھی یہ ہی کہتے ہیں کہ قیام اور میلاد کارِ ثواب ہے۔ پھر آپ ان پر واجب سمجھنے کا کس طرح الزام لگاتے ہیں"؟ (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۴۵)

مفتی صاحب انوارِ ساطعہ کا حوالہ بار بار دیکھ لیں کہ یہ بہتان ہے یا ایک نفس الامری حقیقت ہے؟ صرف واجب ہی نہیں بلکہ اس کو فرض بھی کہا ہے اور قیام نہ کرنے والے کو کافر کہا ہے۔ اہلِ بدعت کے مشہور و معتبر مجموعہ فتاویٰ یعنی غایۃ المرام کے ص۵۵، ص۵۶، ص۶۷، ص۷۰ میں صاف لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر محفلِ میلاد میں تشریف لاتے ہیں تعظیم کے واسطے کھڑا ہونا فرض ہے۔ قیام نہ کرنے والا کافر ہے۔ جامع الفتاویٰ ص۲۱۶ ج ۱۵ ملا نظام الدین ملتانی بریلوی میں ہے مجلسِ میلاد میں بوقت صلوٰۃ وسلام قیام کرنا مستحب و مستحسن ہے اور ایک صورت میں واجب بھی ہے۔ الخ

مفتی صاحب تو خیر سے واجب کو روتے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی دگرگوں ہے ع

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

ایصالِ ثواب کے لئے ربیع الاوّل کی تعیین بھی بدعت ہے

حضرت شاہ عبد العزیزؒ صاحبؒ سے کسی نے سوال کیا تھا:

سوال: پختن طعام در ایّامِ ربیع الاوّل برائے خدا و رسانیدن ثواب آں بروح پرفتوح حضرت سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت امام حسین علیہ السلام در ایّام محرم و دیگر آلِ اطہار سید مختار صحیح است یا نہ۔

جواب: ... برائے ایں کار وقت و روز تعیین نمودن و ماہے مقرر کردن بدعت است آرے اگر وقتے بعمل آرند کہ در آں ثواب زیادہ شود مثل ماہِ رمضان کہ عمل بندۂ مؤمن بہ ہفتاد درجہ ثواب زیادہ دارد مضائقہ نیست زیرا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم برآں ترغیب فرمودہ اند بقول

حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؓ وہر چیزکہ برآں ترغیب صاحب شرع وتعیین وقت نیاشد آں فعل عبث است و مخالفِ سنّت سیدالانام و مخالفتِ سنّت حرام است پس ہرگز روا نباشد واگر دلش خواہد مخفی خیرات کند در ہر روزیکہ باشد تا نمود نشود۔" (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص۹۳)۔

ایک عقل مند اور صاحبِ انصاف کو یہ دلائل بس ہیں۔ نہ ماننے والے کے لئے کوئی دلیل سود مند نہیں ہے۔

عُرس کرنا

بزرگانِ دین سے حُسنِ عقیدت اور محبّت الحبّ فی اللہ کے موافق افضل ترین اعمال میں داخل ہے، اُن کے نقشِ قدم پر چلنا اور ان کی صحیح معنی میں پیروی کرنا باعثِ سعادت ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لئے شرعی قواعد کے تحت ایصالِ ثواب کرنا اور ان کے رفعِ درجات کے لئے دعا کرنا، ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اگر کسی بزرگ کی قبر قریب ہو تو اُس پر حاضر ہو کر دعا کرنا اور سنت کے مطابق سلام کہنا، سب درست اور جائز ہے۔ ہاں البتّہ دُور دراز کی مسافت طے کر کے زیارتِ قبور کے لئے جانا، اہلِ سنّت میں مختلف فیہ امر ہے اور منع کرنے والے حضرات حدیث لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد (الحدیث) سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت ابوہریرۃؓ طُور سے واپس آئے، تو اس حدیث کے راوی حضرت بصرہ بن ابی بصرہ الغفاریؓ (المتوفی سنہ ھ) نے اسی حدیث سے طُور کا سفر اختیار کرنے کی ممانعت ثابت کی اور فرمایا۔ اے ابو ہریرہؓ! اگر مَیں آپ سے آپ کے طُور پر جانے سے پہلے ملاقات کر لیتا تو اس حدیث کے تحت مَیں آپ کو ہرگز وہاں نہ جانے دیتا۔ (نسائی ج ۱ ص۱۶) حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حق میرے نزدیک یہ ہے کہ قبر اور اولیاء اللہ میں سے کسی ولی کی عبادت کا محل اور طُور سب کے سب اس نہی میں برابر ہیں (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص۱۹۲) بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص اجمیر میں حضرت خواجہ چشتیؒ کی قبر پر یا حضرت سالار مسعود غازیؒ کی قبر یا ان کی مانند کسی اور قبر پر اس لئے گیا کہ وہاں کوئی حاجت

طلب کرے تو اُس نے ایسا گناہ کیا کہ جو قتل اور زنا سے بھی بد ترین گناہ ہے (تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ۴۵)
لیکن قبروں کی زیارت کے لئے دن مقرر کرنا اور معین دن میں اجتماع کرنا ہرگز شریعت سے ثابت نہیں ہے اور خصوصاً سال کے بعد جو دن مقرر کیا جاتا ہے جس کو عُرس کہتے ہیں، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

لا تجعلوا قبری عیدًا (نسائی، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۶) تم میری قبر کو عید نہ بناؤ۔

شراح حدیث نے اس کے متعدد معانی اور مطالب بیان کئے ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ:-

لا تجتمعوا للزیارۃ اجتماعکم للعید۔ تم زیارت کے لئے ایسے نہ جمع ہو جیسے کہ تم عید کیلئے مجتمع ہوتے ہو۔

اور یہی اجتماع عُرس میں ہوتا ہے جس سے آپ نے منع کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے:-

المراد الحث علی کثرۃ الزیارۃ ای لا تجعلوا کالعید الذی لا یاتی فی السنۃ الا مرۃ۔ (ذکرہ فی المرقات، ہامش مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۶) کہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو کثرت زیارۃ پر آمادہ کیا گیا ہے کہ تم میری قبر کو عید کی طرح نہ بناؤ جو سال میں صرف ایک ہی مرتبہ آتی ہے۔

اور عُرس بھی مقرر طور پر سال میں صرف ایک ہی دفعہ کیا جاتا ہے، اور ایسا کرنا اس حدیث کے خلاف ہے جب آپ کی قبر پر عُرس کرنا اور میلہ لگانا درست نہ ہوا تو کسی اور کی قبر پر کیسے صحیح اور درست ہوگا؟

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

لا تجعلوا زیارۃ قبری عیدا اقول هذا اشارۃ الی سد مدخل التحریف کما فعل الیهود والنصٰری بقبور انبیاءهم وجعلوها عیدا وموسما بمنزلۃ الحج۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۷۷، طبع مصر) میں کہتا ہوں کہ آپ نے جو یہ فرمایا کہ میری قبر کی زیارت کو عید نہ بناؤ، اس میں اشارہ ہے کہ تحریف کا دروازہ بند کر دیا جائے کیونکہ یہود اور نصاریٰ نے اپنے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کو حج کی طرح عید اور موسم بنا دیا تھا۔

تو جیسے حج کے لئے ایام کی تخصیص اور خاص اہتمام کیا جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح یہود اور نصاریٰ

نے قبور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کیا اور ماشاء اللہ تعالیٰ نام کے مسلمانوں نے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کے علاوہ حضرات اولیاء کرامؒ کی قبروں (بلکہ مصنوعی قبروں) سے بھی وہ کچھ کیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ بھی شرما جائیں۔ نیز تحریر فرماتے ہیں کہ:

ومن اعظم البدع ما اخترعوا فی امر القبور واتخذوا ها عیدًا (تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ۶۴)	بڑی بدعتوں میں سے یہ ہے کہ لوگوں نے قبور کے بارے میں بہت کچھ اختراع کیا ہے اور قبروں کو میلہ گاہ بنا لیا ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

سوال: برائے زیارتِ قبور روز معیّن نمودن یا روز عرس ایشاں کہ معین است رفتن درست است یا نہ؟

جواب: "برائے زیارتِ قبور روز معین نمودن بدعت است، و اصل زیارت جائز و تعینِ وقت در سلف نبود و ایں بدعت ازاں قبیل است کہ اصلش جائز است و خصوصیتِ وقت بدعت مانند مصافحہ بعد العصر کہ در ملک توران وغیرہ رائج است و روز عرس برائے یاد دہانیدن وقتِ دُعا برائے میّت اگر باشد مضائقہ ندارد لیکن التزام آں نیز بدعت است از ہماں قبیل کہ گزشت"۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۸۹)

جناب قاضی ثناء اللہ صاحب الحنفیؒ لکھتے ہیں:

لا یجوز ما یفعله الجهال بقبور الاولیاء والشهداء من السّجود والطّواف حولها واتّخاذ السرج والمساجد الیها ومن الاجتماع بعد الحول کالاعیاد ویسمونه عُرسًا۔ (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۶۵)	کہ جاہل لوگ حضرات اولیاءؒ و شہداءؒ کے مزارات کے ساتھ جو معاملات کرتے ہیں وہ سب کے سب ناجائز ہیں یعنی ان کو سجدہ کرنا اور ان کے گرد طواف کرنا اور اُن پر چراغاں کرنا اور اُن کی طرف سجدے کرنا اور ہر سال میلوں کی طرح اُن پر جمع ہونا جس کا نام عُرس ہے۔

اور ارشاد الطالبین ص ۲۲ میں لکھتے ہیں:

"قبور اولیاء بلند کردن و گنبد بر آں ساختن و عرس و امثال آں و چراغاں کردن ہمہ بدعت است بعض ازاں حرام است و بعض مکروہ، پیغمبر خدا بر شمع افروزاں نزد قبر و سجدہ کنندگاں را لعنت گفتہ"۔

اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ :

مقرر ساختن روزِ عرس جائز نیست (مسائل اربعین ص۳۸) — عُرس کا دن مقرر کرنا جائز نہیں ہے ۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ عُرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے اور لوگ جمع ہو کر قرآن خوانی، کلمہ طیبہ، درود پاک وغیرہ پڑھتے ہیں، بہت سی برکات جمع ہو جاتی ہیں (جاء الحق ص۳۰۹) ۔ تو یہ صرف سرے سے قابلِ التفات ہی نہیں ہے ۔ چنانچہ الشیخ علی متقی الحنفیؒ لکھتے ہیں :

الاجتماع لقراءة القرآن على الميت بالتخصيص فى المقبرة او المسجد او البيت بدعة مذمومة (رسالہ ردِّ بدعات) — کہ تخصیص کے ساتھ قبرستان میں یا مسجد میں یا گھر میں میت کے لئے قرأتِ قرآن کے لئے اجتماع کرنا بدعتِ مذمومہ ہے ۔

جب یہ اجتماع ہی بدعتِ مذمومہ ہے تو لوگوں کے قرآن خوانی کے لئے جمع ہونے کا کیا معنی؟ رہا مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا اِن روایات سے استدلال کرنا، جن میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سال کے بعد شہداء کی قبروں پر السلام علیکم الخ کے الفاظ سے دُعا کیا کرتے تھے اور اسی طرح آپ کے بعد حضرات خلفاء راشدین بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، تو ان سے ان کا استدلال خام ہے ۔ اوّلاً اس لیے کہ یہ روایتیں کتبِ حدیث کے اس طبقہ کی ہیں جن میں بجز باسند اور صحیح احادیث کے جن پر اُمت کا تعامل ہے اکثر احادیث کو محدثین ہرگز قبول نہیں کرتے ۔ نہ عقیدہ میں اور نہ عمل میں ۔ (دیکھئے عجالۂ نافعہ ص۷ اور حجۃ اللہ) وثانیاً ان روایتوں میں اجتماع کا کہیں ذکر نہیں اور نہ قرآن خوانی اور مجلسِ وعظ منعقد کرنے کا کہیں ذکر ہے ۔ الغرض کوئی صحیح نقلی یا عقلی دلیل عُرس کے جواز پر ہرگز دلالت نہیں کرتی ۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں : فتاویٰ رشیدیہ جلد اوّل کتاب الحظر والاباحۃ ص۵۹ میں ہے ۔ زیارتِ بزرگان کے لئے سفر کر کے جانا علماء اہلِ سنّت میں مختلف ہے ۔ بعض درست کہتے ہیں، اور بعض ناجائز، دونوں اہلِ سنّت کے علماء ہیں ۔ مسئلہ مختلفہ ہے اس میں تکرار درست نہیں ۔ اور فیصلہ بھی ہم مقلدوں سے محال ہے ۔ رشید احمد عفی عنہ ۔ اب کسی دیوبندی کو حق نہیں کہ سفرِ عرس سے کسی کو منع

کرے، کیونکہ مولوی رشید احمد صاحب تکرار سے منع فرماتے ہیں اور اس کا فیصلہ نہیں فرما سکتے (جاء الحق صفحہ ۳۱۵)

حضرت مولانا گنگوہیؒ کی اس عبارت سے سفرِ عُرس کے جواز پر استدلال کرنا مفتی احمد یار خان صاحب کی محض خوش فہمی ہے۔ مولانا گنگوہیؒ نے خود یہ مسئلہ یوں حل کیا ہے۔

الجواب: قبورِ بزرگان کی زیارت کو سفر کر کے جانا مختلف فیہ ہے۔ بعض علماء درست لکھتے ہیں اور بعض منع کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ مختلفہ ہے، اس میں نزاع تکرار نہیں چاہیئے مگر ہاں عُرس کے دن زیارت کو جانا حرام ہے فقط۔" (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم صفحہ ۲۹)

اب فرمایئے کہ کسی دیوبندی کو سفرِ عُرس سے منع کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

اور پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کی عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں کہ زیارتِ قبور کے لئے دن مقرر کرنا اور عُرس کرنا بدعت ہے اور قاضی صاحبؒ نے بعض اذان حرام و بعض مکروہ لکھا ہے۔ یہ اور اس قسم کی دیگر عبارتیں حضرت مولانا گنگوہیؒ کا مآخذ ہیں۔ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے پیران پیر حضرت شاہ حمزہ صاحب مارہرویؒ (المتوفی ۱۱۶۵ھ) نے یہ وصیت کی تھی کہ فاتحہ برسی بالکل نہ کریں کہ حکم اسی طرح سے ہے (انوار العارفین صفحہ ۴۶۹)۔ لیجئے اب تو اس منع میں بریلویوں کا پیر بھی شریک ہو گیا۔

ذِکر بالجہر

اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک عمدہ ترین عبادت ہے اور دُعا کرنا بھی ایک اعلیٰ ترین نیکی اور قُربت ہے۔ مگر اُسی طریقہ سے جس سے شریعتِ حقّہ نے راہنمائی کی ہے۔ جس موقع پر جہر کے ساتھ ذکر کرنے کا حُکم ہے مثلاً عرفہ کی فجر سے لے کر آخر ایّامِ تشریق تک، اور حج کے دنوں میں تلبیہ وغیرہ) تو وہاں جہر کرنا سنّت ہے۔ اور جہاں جہر کا حکم نہیں دیا وہاں آہستہ ذکر کرنا بہتر ہوگا۔ اور اسی صُورت میں شریعت کی مُراد پوری ہوگی۔ اور یہی حکم ہے دعاء کا۔ اگرچہ حضرات صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) نے اور ان کے علاوہ بعض متقامات میں امام ابن حزمؒ اور اکثر صوفیاء کرامؒ نے اکثر متقامات پر جہر سے ذکر کرنے کو صرف پسند

کیا ہے لیکن نہ کرنے والوں کو نہ تو ملامت کی اور نہ وہابی کہا۔ مگر دلائل پر نگاہ ڈالنے سے یہی بات صحیح[1] معلوم ہوتی ہے کہ ذکر اور دُعا آہستہ طریقہ سے بہتر ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک ہے۔ جب حضرات آئمہ اربعہ کا ایک مسئلہ پر اتفاق ہو جائے تو یہی امید رکھنی چاہیئے کہ حق ان کے ساتھ ہے اور پھر آج اگر صرف ذکر بالجہر کو پسند ہی کیا جاتا اور دوسرے پہلو کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا، تب بھی ایک بات ہوتی۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ آج ذکر بالجہر نہ کرنے والے کو وہابی وغیرہ کہہ کر اُسے ملامت کی جاتی اور محلِ طعن بنایا جاتا ہے، اور آج مسلمان اور اہلِ سنّت ہونے کی یہ علامت قرار دی جا رہی ہے، کہ اگر ذکر بالجہر کرتا ہو تو سُنّی ورنہ وہابی۔ اس لئے اس مسئلہ پر غور کی ضرورت ہے۔ مختصر طریق پر دلائل عرض ہیں۔ غور فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (الآیہ۔ پ۹، اعراف ع۲۴)

اور ذکر کر اپنے رب کا اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور ڈرتے ہوئے اور جہر سے کم آواز میں۔

اور فرمایا کہ:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (پ۸۔ اعراف، رکوع ۷)

پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے اور چپکے، بیشک وہ محبت نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کے ساتھ۔

اس آیت کریمہ میں ذکر اور دُعا کرنے کے لئے دو قیدیں لگائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ذکر اور دُعا نہایت اخلاص، عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہو، اور دوسری یہ کہ آہستہ اور چُپکے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں سے محبّت نہیں کرتا۔ آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے حضرات صحابہ کرامؓ نے ایک موقع پر بلند آواز سے ذکر کیا تو آپ نے ان کو منع کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ:

---

[1] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں والمختار ان الامام والمأموم یخفیان الذکر الا ان احتیج الی التعلیم۔ (فتح الباری ج ۲ ص۲۵۶) کہ مختار بات صرف یہی ہے کہ امام اور مقتدی دونوں ذکر آہستہ کریں۔ ہاں مگر جب تعلیم کی ضرورت محسوس ہو تو الگ بات ہے۔

ایّھا النّاس اربعوا علیٰ انفسکم انکم لیس تدعون اصم ولا غائبا وانکم تدعون سمیعًا قریبا و ھو معکم۔ (بخاری ج ۲ ص ۶۰۵ و مسلم ج ۲ ص ۳۴۶ واللفظ لہ)

اے لوگو! اپنی جان پر نرمی کرو، تم اس ذات کو نہیں پکار رہے جو بہری اور غائب ہو۔ تم تو سمیع اور قریب ذات کو پکارتے ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔

اِس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے روکتے ہوئے آہستہ ذکر کرنے کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں:

ففیہ الندب الی خفض الصوت بالذکر اذا لم تدع حاجۃ الی رفعہ۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۳۴۶)

کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آہستہ ذکر کرنا بہتر ہے جبکہ کوئی داعیہ رفع صوت کا پیش نہ آئے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابنِ حزم ظاہریؒ (المتوفی ۴۵۶ھ) وغیرہ نے نمازوں کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنے کو مستحب کہا ہے لیکن:

وقال ابن بطالؒ المذاھب الاربعۃ علی عدم استحبابہ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۷۰، مثلہ فی ہامش بخاری ج ۱ ص ۱۱۶)

محدّث ابنِ بطالؒ فرماتے ہیں کہ چاروں مذہب اس پر متفق ہیں کہ جہر سے ذکر کرنا مستحب نہیں ہے۔

امام ابنِ حزمؒ وغیرہ کا استدلال اس روایت سے ہے جس میں حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ یہ فرماتے ہیں:

ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبۃ کان علی عھد النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مسلم ج ۱ ص ۲۱۷)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگ بلند آواز سے ذکر کرتے تھے۔

حضرت امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

ونقل ابن بطالؒ والاٰخرون ان اصحاب المذاھب المتبوعۃ وغیرھم متفقون علیٰ عدم استحباب رفع الصّوت بالذّکر والتکبیر

امام ابنِ بطالؒ وغیرہ علماء نے یہ بات نقل کی ہے کہ وہ ائمہ مذاہب جن کی (اکثر) لوگ اتباع کرتے ہیں (یعنی ائمہ اربعہؒ) اور اسی طرح دیگر ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ بلند آواز سے

وحمل الشافعیؒ ھذا الحدیث علیٰ انه جهر وقتا یسیرا حتّٰی یعلمھم صفة الذکر لا انھم جھروا دائماً۔ (شرح مسلم ج ۱ ص۲۱۷)	ذکر کرنا اور تکبیر کہنا مستحب نہیں ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کا مطلب امام شافعیؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ کچھ عرصہ تک لوگوں کو تعلیم دینے کی غرض سے ذکر بالجہر ہوتا رہا، نہ یہ کہ انہوں نے اس پر دوام کیا۔

اور یہی بات قرینِ قیاس وانصاف ہے۔ ورنہ ضرور ذکر بالجہر پر حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل ہوتا اور حضرت ابنِ مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی ہرگز ذکر بالجہر اور بلند آواز سے درود شریف پڑھنے والوں کو یہ فرماتے ہوئے مسجد سے نہ نکال دیتے کہ تم نے صحابہؓ کی موجودگی میں تاریک بدعت ایجاد کی ہے؟ جس طرح جہر سے برائے تعلیم بسم اللہ پڑھنا آپ سے ثابت ہے لیکن اس پر دوام کرنا بدعت ہے جیسا کہ حضرت ابن مغفلؓ سے نقل ہو چکا ہے، اسی طرح ذِکر بالجہر کا مسئلہ ہے۔ علامہ حلبی حنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولابی حنیفةؒ ان رفع الصوت بالذکر بدعة مخالف للامر فی قوله تعالیٰ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ الآیة (کبیری ص۵۶۶)	حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے کہ تم اپنے رب کو عاجزی سے اور چپکے سے پکارو۔

اس عبارت سے بصراحت یہ معلوم ہوا کہ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا امام اعظم صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے مذکور ارشاد کے مخالف بھی ہے اور بدعت بھی ہے۔ فریقِ مخالف کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ ذکر بالجہر نہ کرنے والوں کو وہابی کہتا ہے اور ذکر بالجہر کو اہل سنت کی علامت قرار دیتا ہے لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

حضرت ملّا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ:

وقد نص بعض علمائنا بان رفع الصوت فی المسجد ولو بالذکر حرام (مرقات علی المشکوٰة ج۲ ص۴۷)	ہمارے بعض علماء نے صراحت سے یہ حکم بیان کیا ہے کہ مسجد میں آواز بلند کرنا اگرچہ ذکر کے ساتھ ہو، حرام ہے۔

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرت امام اعظمؒ ذکر بالجہر کو بدعت فرماتے ہیں اور حضرت مُلّا علی قاریؒ اس کا حرام ہونا نقل کرتے ہیں مگر مفتی احمد یار خان صاحب کہتے ہیں کہ "مخالفین اس کو حرام کہتے ہیں، اور

طرح طرح کے حیلوں سے اس کو رد کرنا چاہتے ہیں۔ ایک حیلہ یہ ہے کہ ذکر بالجہر بدعت ہے، اصولِ حنفیہ کے خلاف ہے الخ (جاء الحق ص۳۲۹)۔ انصاف سے فرمائیں کہ یہ حرام اور بدعت کس نے کہا ہے؟ کیا امامِ اعظمؒ اور ملا علی قاریؒ بھی آپ کے مخالفین کی فہرست میں شامل ہیں؟ اور کیا وہ بھی طرح طرح کے حیلوں سے اس کو منع کرنے والوں میں ہیں؟ خوب ہوش میں آکر جواب دینا، بیّنوا توجروا۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

اما الدّعاء فیسر بہ بلا خلاف (شرح مسلم ج۱ ص۳۱۱) — اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ دعا آہستہ کرنی چاہیئے۔

امام سراج الدین الحنفیؒ اور ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

یُستحب فی الدُّعاء الاخفاء ورفع الصوت بالدعاء بدعۃ (فتاویٰ سراجیہ ص۷۲ وموضوعاتِ کبیر ص۱۷)۔ — کہ مستحب یہ ہے کہ دُعا آہستہ کی جائے اور بلند آواز سے دُعا کرنا بدعت ہے۔

یہ تمام عبارات اپنے مفہوم میں بالکل نص صریح اور واضح ہیں اور یہی پہلو بہتر اور روح شریعت کے قریب تر ہے۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا بحوالہ شامی یہ نقل کرنا کہ "متقدّمین اور متاخرین نے اس پر اتفاق کیا کہ مسجدوں میں جماعتوں کا بلند آواز سے ذکر کرنا مستحب ہے، مگر یہ کہ اُن کے جہر سے کسی سونے والے یا نمازی یا قاری کو پریشانی ہو"۔ (جاء الحق ص۳۳۲) تو یہ ہرگز قابلِ التفات نہیں ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ جب قرآن کریم اور حدیث شریف میں آہستہ ذکر کرنے کا حکم ہے تو اس کے خلاف کسی کا عمل کس طرح حجت ہوسکتا ہے؟ وثانیاً حضرات ائمہ اربعہؒ جہر سے ذکر کرنے کو غیر مستحب کہتے ہیں اور حضرت امام ابوحنیفہؒ اس کو بدعت کہتے ہیں۔ نیز تصریح کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مخالف ہے۔ جب حضرات ائمہ اربعہؒ کا ذکر بالجہر کے خلاف اتّفاق ہے تو ذکر بالجہر کے جواز پر اتّفاق کیسے ہوا؟۔ اور کیا حضرات ائمہ اربعہؒ متقدّمین میں نہ تھے؟ وثالثاً علماء متاخرین بھی ذکر بالجہر کے مستحب ہونے پر ہرگز متّفق نہیں ہیں۔ ہر مسلک کے علماء نے اس کی تردید کی ہے۔ حتّٰی کہ حضرات صوفیاء کرام بھی اس پر متّفق نہیں ہیں دیکھئے مکتوبات حضرت مجدّد الف ثانیؒ۔ اسی طرح دیگر علماء اور فقہاء ومحدّثین کی کتابیں بغور ملاحظہ کیجئے۔ محض اتّفاق کے خوشکن لفظ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ باقی مفتی احمد یار خان

صاحب کا رسالہ دلائل الاذکار ص۷۹ مصنفہ شیخ محمد صاحب تھانویؒ کے حوالہ سے یہ نقل کرنا کہ "حضور علیہ السلام نماز کے بعد صحابہ کرامؓ کے ساتھ تسبیح و تہلیل بلند آواز سے پڑھتے تھے" (جاء الحق ص۳۳۱) تو یہ دلیل بھی چنداں وزنی نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ جب تک اصولِ حدیث کے مطابق اس کا صحیح ہونا ثابت نہ ہو جائے اس سے استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ و ثانیاً اگر یہ حدیث صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب بھی وہی ہوگا جو حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا حضرت امام شافعیؒ نے پیش کیا ہے کہ کسی وقت تعلیم کے لئے آپ نے ایسا کیا تھا، بعد کو چھوڑ دیا، دوام اس پر ہرگز نہ تھا۔ اگر دوام ہوتا تو حضرات ائمہ اربعہؒ کبھی ذکر بالجہر کو غیر مستحب نہ کہتے۔ یہ ایک ایسی بیّن حقیقت ہے جس کا ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذکر بالجہر اور آہستہ ذکر کی بما لہ و ما علیہ بحث راقم کی مستقل کتاب حکم الذکر بالجہر اور اخفار الذکر میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں گنجائش نہیں ہے کہ اسکے مبسوط حوالے عرض کیے جا سکیں۔ واللہ الموفق۔

مزاراتِ حضرات اولیاءِ کرامؒ کو پختہ کرنا اور اُن پر گنبد بنانا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ حتی المقدور قبور کی توہین نہ کی جائے یعنی قبور پر بیٹھنا، ان کو روندنا، وہاں پیشاب و پاخانہ کے لئے جانا اور قبور کی شکل و صورت کو بگاڑنا وغیرہ سب امور شریعت میں ممنوع ہیں۔ قبر مسلمان کی عالمِ برزخ میں ایک رہائش گاہ ہے، اس کا احترام کرنا ضروری ہے اور اس کی توہین ہرگز درست نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ قبروں کو پختہ بنانا یا اُن پر گنبد وغیرہ بنانا بھی کیا اس احترام میں داخل ہے؟ تو اس کا جواب ایک مسلمان اور منیب کے لئے بالکل آسان ہے اور وہ صرف یہ ہے کہ قبور پر گنبد وغیرہ بنانے میں احترام نہیں اور نہ بنانے میں ہرگز توہین نہیں ہے کیونکہ اگر قبروں کو پختہ بنانے اور ان پر گنبد وغیرہ تعمیر کرنے میں احترام ہوتا اور اسمیں کوئی بھی شرعی فائدہ اور دینی مصلحت ہوتی تو سردارِ دو جہاں رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہرگز اس سے منع نہ کرتے۔ اگر آج مولوی احمد رضا خان اور مولوی عبد السمیع صاحب اور مولوی محمد عمر اور

مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کو اس میں دینی مصلحتیں اور شرعی فوائد حاصل ہوئے ہیں اور جن کی بنا پر وہ یہ سب کچھ جائز کہتے اور اس کو کارِ ثواب اور کم از کم مستحب سمجھتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کیوں اس سے منع کیا اور ان دینی فوائد اور مصالح سے کیوں اُمت کو محروم رکھا؟ غرضیکہ یہ تمام تر فوائد اور مصالح خود تراشیدہ اور ایجاد بندہ ہونے کی وجہ سے مردود اور باطل ہیں اور ان کا مقام صرف یہ ہے کہ ؏

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ:

قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یبنی علیہ و ان یقعد علیہ۔ (مسلم ج ۱ ص ۳۱۲ و مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۴۸ و ترمذی ج ۱ ص ۱۲۵)

آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے اور اس پر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھنے سے منع کیا ہے۔

جب سردار دو جہاں امام الانبیاء سید الرسل اور خاتم النبیین صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے تو کون ماں کا لال ہے جو آپ کی منع کی ہوئی چیز میں کوئی مصلحت اور فائدہ ثابت کر سکے۔ مُنہ کے ساتھ بات بنانے اور قلمِ خواہش کے ساتھ کچھ لکھ دینے کا نام ثبوت نہیں ہوتا۔ حضرت امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

والبناء علیہ فان کان فی ملك البانی فمکروہ وان کان فی مقبرۃ مسبلۃ فحرام نص علیہ الشافعی والاصحاب قال الشافعی فی الام ورأیت الائمۃ بمکۃ یأمرون بھدم ما یبنی ویؤید الھدم قولہ ولا قبرًا مشرفًا الاسویتہ۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۳۱۲)

قبر پر عمارت بنانا اگر (وہ جگہ) عمارت بنانے والے کی مِلک میں ہے تو مکروہ ہے اور اگر عام مقبرہ میں ہے تو حرام ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور دیگر اصحاب نے صراحت سے اس کو بیان کیا ہے اور امام شافعیؒ نے کتاب الام میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے مکہ مکرمہ میں اماموں کو قبر پر عمارت کو ڈھانے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا ہے، اور ولا قبرًا مشرفًا والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب سے پوچھئے کہ حضرت امام شافعیؒ نے جو مکہ مکرمہ میں حضرات ائمہ کو قبروں پر عمارت ڈھانے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا تھا، یہ کون امام تھے؟ اور کیا یہ نجدیوں اور وہابیوں کے امام تھے جو مکہ مکرمہ جیسی پاک سرزمین پر اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں اور حضرات اولیاء کرامؒ کی قبروں کی حضرت امام شافعیؒ کے زمانہ میں یوں توہین کرتے تھے؟ مفتی احمد یار خان صاحب تو یوں لب کشائی کرتے ہیں: **نوٹ ضروری**: "اِس حدیث کو آڑ بنا کر نجدی وہابیوں نے صحابۂ کرامؓ اور اہلِ بیت کے مزارات کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیا"۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۷۹)

حضرت امام محمدؒ (المتوفی ۱۸۹ھ) فرماتے ہیں کہ:

ولا نری ان یزاد علیٰ ما خرج منه و نکره ان یجصص او یطین الیٰ ان قال ان النبیّ صلی اللہ علیه وسلم نهی عن تربیع القبور و تجصیصها قال محمد به نأخذ وهو قول ابی حنیفة۔ (کتاب الآثار امام محمد ص۹۶-۹۷)

ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلی ہے اس سے زیادہ اس پر ڈالی جائے۔ اور ہم مکروہ سمجھتے ہیں کہ قبر پختہ بنائی جائے یا اس پر لپائی کی جائے (آگے فرمایا) اس لئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر کو مربع بنانے سے اور اس کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے۔ یہی ہمارا مذہب ہے، اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

حضرات کیا کسی مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح حدیث کو ردّ کر دے؟ اور کیا کسی حنفی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حضرت امام ابو حنیفہ کا قول اور ان کا فتویٰ جس کی بنیاد صحیح حدیث پر ہو ترک دے اور پھر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے حنفی کا حنفی بنا رہے۔ یاد رہے کہ یہ قول حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ان کے بلا واسطہ شاگرد حضرت امام محمدؒ نقل کرتے ہیں اور اپنا مذہب بھی یہی بتاتے ہیں۔ مفتی احمد یار خان صاحب کی خیانت یا جہالت ملاحظہ کیجئے، کہ وہ امام شعرانیؒ (المتوفی ۹۷۳ھ) کے حوالہ سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ قبروں پر گچ کرنا اور گنبد بنانا اور قبروں کو پختہ کرنا جائز ہے، اور پھر آگے اس قلعہ کو فتح کرتے ہوئے مفتی احمد یار خان

صاحب یوں ارقام فرماتے ہیں : اب تو رجسٹری ہوگئی کہ خود امام مذہب امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا فرمان مِل گیا کہ قبر پر قُبّہ وغیرہ بنانا جائز ہے" (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۷۷) ۔ سبحان اللہ تعالیٰ! دسویں صدی کے ایک صُوفی کی بے سند نقل اور بے سروپا روایت سے (جو نقلِ مذاہب میں سینکڑوں غلطیاں کر جاتے ہیں) حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں قُبّوں کے جواز پر رجسٹری ہوگئی اور حضرت امام محمدؒ کی نقل سے جو امام صاحبؒ کے بلاواسطہ شاگرد اور نقلِ مذہب میں بڑے محتاط اور معتبر ہیں ۔ ان کے قول اور فتویٰ سے قُبّوں کے عدمِ جواز پر رجسٹری نہ ہوئی ؟ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

صریح حدیث اور حضرت امام صاحبؒ کے قول کے بعد ضرورت تو نہیں، مگر تکمیل فائدہ کیلئے حضرات فقہاء احنافؒ کی چند عبارتیں اور ملاحظہ کر لیجئے تاکہ اصلی حنفیت بالکل بے نقاب ہوجائے۔

علّامہ حلبی الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ :

ویکرہ تجصیص القبر و تطیینہ وبہ قالت الائمۃ الثلاثۃ الی ان قال وعن ابی حنیفۃؒ انہ یکرہ ان یبنی علیہ بناء من بیت او قبۃ او نحو ذٰلک لما مر من الحدیث آنفا۔ (کبیری ص۵۹۹)	قبر کو پختہ بنانا اور اس کی لپائی کرنا مکروہ ہے اور یہی تینوں اماموں کا قول ہے (پھر آگے فرمایا) اور امام ابوحنیفہؒ سے روایت ہے کہ قبر پر مکان یا قُبّہ یا اس کی مانند کوئی اور عمارت بنانا مکروہ ہے ۔ اور یہ مذکور حدیث اس کی دلیل ہے ۔

امام سراج الدین اودی الحنفیؒ (المتوفی فی حدود ۷۰۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

ویکرہ البناء علی القبور (فتاویٰ سراجیہ ص۲۴)	قبور پر عمارت بنانا مکروہ ہے ۔

امام قاضی خان الحنفیؒ (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ :

ولا یجصص القبر لما روی عن النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم انہ نھی عن التجصیص والتقضیض وعن البناء فوق القبر (قاضی خان ج ۱ ص۹۲)	قبر کو پختہ نہ بنایا جائے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے قبر کے پختہ بنانے اور چاندی کے پانی سے جڑاؤ کرنے اور قبر پر عمارت بنانے سے منع کیا ہے ۔

حافظ ابن ہمام الحنفیؒ (المتوفی ۸۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

ان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن تربیع القبور وتجصیصھا (فتح القدیر ج ۲ ص۱۴۷)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کے مربع (چورس) بنانے اور ان کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ویسنم القبر قدر الشبر ولا یربع ولا یجصص ویکرہ ان یبنیٰ علی القبر۔ (عالمگیری مصری ج ۱ ص۱۶۷)

قبر کو اونٹ کے کوہان کی طرح بنانا چاہیئے اور وہ بھی صرف ایک بالشت۔ اور قبر کو مربع نہ بنایا جائے اور نہ اس کو پختہ کیا جائے۔ اور قبر پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔

علّامہ ابن عابدین الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

اما البناء فلم ار من اختار جوازہ۔ (شامی ج ۱ ص۱۰۱)

مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے عمارت بنانے کے جواز کو پسند کیا ہو۔

نوٹ: مطلق مکروہ[۱] حضرت امامِ اعظمؒ اور دیگر سلف صالحین کی اصطلاح میں مکروہ تحریمی پر اطلاق ہوتا ہے چنانچہ علّامہ ابو المکارم الحنفیؒ (المتوفی ۸۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

المکروہ التحریم عند الامام (ابو المکارم ج ۳ ص۱۵۹)

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ سے مراد حرام ہے۔

اور نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں:

حافظ ابن القیمؒ در اعلام الموقعین تصریح کردہ است بآنکہ استعمال کراہت در محاورۂ سلف در تحریم بود۔ (الدلیل الطالب ص۵۰۲)

کہ حافظ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین میں تصریح کی ہے کہ حضرات سلفؒ کے محاورہ میں کراہت کا اطلاق و استعمال تحریم پر ہوتا تھا۔

حضرت ملا علی القاریؒ حدیث من ابتدع بدعۃ ضلالۃ کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

وھی ما انکرہ ائمۃ المسلمین کالبناء علی القبور وتجصیصھا۔ (مرقات ج ۱ ص۲۴۶)

بدعت ضلالت وہ ہے جس کا ائمہ مسلمینؒ نے انکار کیا ہو جیسے قبروں پر عمارت بنانا اور ان کو پختہ کرنا۔

---

[۱] تصریح حاشیہ تلویح ص۲۷ میں امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ دونوں سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ مکروہ سے کراہت تحریمیہ مراد ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مسلمینؒ نے قبر پر عمارت بنانے اور ان کو پختہ کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے اور اس کو بدعتِ ضلالہ کہتے ہوئے انکار کیا ہے۔

قاضی ثناء اللہ صاحب الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۲۵ھ) لکھتے ہیں:

آنچہ بر قبور اولیاء عمارت ہائے رفیع بنا میکنند وچراغاں روشن می کنند واز ین قبیل ہرچہ میکنند حرام است۔ (مالابدّ منہ ص ۹۵)	وہ جو کچھ کہ حضرات اولیاء کرامؒ کی قبروں پر کیا جاتا ہے کہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں اور چراغ روشن کرتے اور اس قسم کی جو چیز بھی کرتے ہیں، حرام ہے۔

ایک منصف مزاج اور حق کے متلاشی کے لیے یہ وزنی اور ٹھوس دلائل بالکل کافی ہیں البتہ معاند اور سرکش کے لیے دلائل کا انبار بھی ناکافی ہے ——— مولوی عبدالسمیع صاحب، اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ نے شیخ عبدالغنی نابلسیؒ، صاحب روح البیان اور امام حصکفیؒ اور طحطاویؒ وغیرہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مشائخ، علماء اور سادات کی قبروں پر عمارت اور گنبد بنانا جائز ہے، اور اس کو کم از کم مستحب اور ہوالمختار کہا ہے تو یہ سراسر باطل اور مردود ہے۔ اس کا مختصر اور پورا جواب صرف اتنا ہی کافی ہے کہ نہ تو یہ حضرات معصوم ہیں اور نہ مجتہد۔ پھر جناب نبی معصوم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور امام مجتہد کے صریح ارشاد کے مقابلہ میں ان کی بات کون سنتا ہے؟ رہا مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا یہ ارشاد کہ حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت محمد بن الحنفیہؒ سے قبروں پر خیمے لگانے کا ثبوت ہے اور اس پر روایتیں نقل کی ہیں تو اولاً اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بے اصل اور بے سند روایتیں ہیں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہیں۔ وثانیاً اگر یہ سنداً صحیح بھی ہوں تب بھی جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح حدیث کے مقابلہ میں ان کی کوئی پوزیشن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ نقل کیا ہے کہ امام زین العابدینؒ کی بیوی نے اپنے خاوند کی قبر پر خیمہ لگایا تھا، اس میں بھی مفتی صاحب نے خیانت کی ہے۔ اگر پوری روایت نقل کر دیتے تو خود بخود معاملہ حل ہو جاتا۔ اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ مکالمہ کے طور پر صدائے غیبی (ہاتف) نے اس فعل کی ناپسندیدگی کا صاف اعلان کر دیا تھا (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۲)۔ باقی حضرت عثمانؓ بن مظعون

کی قبر کے سرہانے بطور علامت کے ایک پتھر رکھنے سے قبر پر عمارت اور قبہ بنانے پر استدلال کرنا، یہ صرف مفتی صاحب اور ان کے ہم مشرب رفقاء کا ہی کام ہے، آخر مفتی جو ہوئے۔

الغرض قبور حضرات اولیاء کرام پر عمارت اور گنبد بنانے پر کوئی صحیح روایت اور عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف دلائل اور براہین کا انبار موجود ہے۔ وفیہا کفایۃ لمن لہ ھدایۃ۔

قبوں کو گرانے کا حکم | حضرت امام شافعی کے حوالہ سے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں حضرات ائمہ کرام کو قبور پر قبوں کو مسمار کرنے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور ولا قبرا مشرفا کی حدیث سے ان کا استدلال تھا۔ اب وہ حدیث سن لیجئے۔ حضرت ابوالہیاج الاسدی (المتوفی سنہ) جو فوجی افسر تھے، وہ فرماتے ہیں کہ:

قال لی علیؓ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالا الا طمستہ ولا قبرا مشرفا الا سویتہ (مسلم ص ۳۱۲ ج ۱، مشکوٰۃ ص ۱۴۸ ج ۱، وترمذی ص ۱۲۵ ج ۱)

مجھے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا تجھے میں اس کام کیلئے نہ بھیجوں جس کے لیے مجھے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھیجا تھا وہ یہ کہ کوئی فوٹو اور مجسمہ مٹائے بغیر نہ چھوڑنا، اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑنا مگر یہ کہ اس کو برابر کر دینا۔

برابر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قبروں کو زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کر دیا جائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان قبروں کے ساتھ برابر کر دیا جائے جو شریعت کے منشا کے مطابق ہیں۔ چنانچہ علاء الدین الماردینی الحنفیؒ (المتوفی ۷۴۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

الا سویتہ ای سویتہ بالقبور المعتادۃ۔ (الجوہر النقی علی البیہقی ج ۴ ص ۳)

برابر کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ان کو ان قبروں کے ساتھ برابر کر دیا جائے جن کا شریعت کی عادت سے ثبوت ہو چکا ہے۔

حضرت امام بیہقیؒ نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر (رفع قبرہ من الارض نحوا من شبر۔ سنن الکبریٰ ج ۳ ص ۴۱۱) زمین سے ایک بالشت کے قریب اونچی تھی۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

ان السنۃ ان القبر لا یرفع علی الارض رفعا

سنت یہ ہے کہ قبر زمین سے زیادہ اونچی نہ ہو ــــ بلکہ

كثيرًا — بل يوفع نحو شبر۔ (شرح مسلم ج ۱ ص۳۱۲) صرف ایک بالشت کے اندازہ کی اُونچی ہو۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُونچی قبروں کو گرانے کا حکم فرمایا تھا اور ابوالسادات (حضرت علیؓ) کو اس کام کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ پھر حضرت علیؓ نے اپنی خلافت میں یہ کام اپنے ایک فوجی افسر سے لیا جس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مذموم عمارتیں شریعت کی رُوح کے سراسر خلاف ہیں، اور ان کے وجود کو شریعت گوارا نہیں کرتی اور یہ ممانعت شرعی حکم کے تحت تھی، نہ جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے لکھا ہے کہ یہ حکم زہد اور تقویٰ کے تحت تھا (جاء الحق ص۲۷۸)۔ اگر بالفرض یہ حکم زہد اور تقویٰ کے تحت تھا تو تمہیں یہ زہد اور تقویٰ کیوں راس نہیں آتا؟

علامہ ابن حجر مکیؒ شافعیؒ (المتوفی ۹۷۴ھ) لکھتے ہیں کہ:۔

تجب المبادرة الى هدمها وهدم القباب التى عليها۔ (كتاب الزواجر ص۱۶۳) ان اُونچی قبروں کو اور ان قبروں پر جو قبّے اور گنبد بنائے گئے ہیں ان کو گرا دینا واجب ہے۔

اور حضرت ملا علی قاری نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ:

ويجب الهدم وان كان مسجدًا (مرقاة ج ۲ ص۳۷۲) گرانا واجب ہے، اگرچہ مسجد ہی کیوں نہ ہو۔

یعنی اگرچہ کسی چالاک اور ہوشیار نے قبروں کے پاس مسجد کا نام دے کر ہی قبّے اور گنبد تعمیر کئے ہوں تو ان کو بھی گرانا واجب ہے کیونکہ مسجد ضرار بھی آخر مسجد کے نام سے تعمیر کی گئی تھی۔ مگر قرآن پڑھنے والے اس کے حشر سے آگاہ ہیں۔ علامہ سید محمود آلوسی الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

ثم اجماعًا ان اعظم المحرمات واسباب الشرك الصلوٰة عندها واتخاذها مساجد اوبناءها عليه وتجب المبادرة الى هدمها وهدم القباب التى على القبور اذ هى اضر من مسجد الضرار لانها اسست على معصية رسول الله صلى الله عليه وسلم وتجب ازالة كل قنديل او سراج على قبر ولا يصح

اس پر اجماع ہے کہ حرام ترین اور اسباب شرک کی چیزوں میں سے قبروں کے پاس نماز پڑھنا ہے یا ان پر مسجدیں بنانا یا عمارتیں تعمیر کرنا ہے، واجب ہے کہ اُونچی قبروں کو اور جو اُن پر قبّے ہیں ان کو گرا دیا جائے کیونکہ یہ مسجد ضرار سے بھی زیادہ نقصان دہ ہیں بایں وجہ کہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نافرمانی میں تعمیر کئے گئے ہیں آپ نے تو اونچی قبروں کو ڈھانے کا حکم دیا ہے اور واجب ہے کہ

وقفه ونذره - (روح المعانی ج ۱۵ ص۲۱۹) قبروں پر جو بھی قندیل یا چراغ ہو اُس کو دُور کر دیا جائے اور اس کا وقف کرنا اور نذر بھی ناجائز ہے۔

حافظ ابن القیم الحنبلیؒ (المتوفی ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

لا یجوز ابقائها و یجب هدمها (زاد المعاد ج۳ ص۲۸) ان کا چھوڑنا جائز نہیں ہے اور ان کا گرانا واجب ہے۔

اور اسی کے قریب الفاظ شیخ الحنابلہ حافظ ابن تیمیہؒ کے ہیں (ملاحظہ ہو تلخیص کتاب الاستغاثہ ص۲۷۸) - آپ نے ملاحظہ کیا کہ کیا حنفیؒ اور کیا شافعیؒ اور کیا حنبلیؒ سب اُونچی قبروں اور اُن پر تعمیر شدہ قبّوں کو گرانے کا حکم دیتے اور اس کو واجب کہتے ہیں۔

نوٹ: اکثر اہلِ بدعت حافظ ابنِ تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ کی رفیع شان میں بہت ہی گستاخی کیا کرتے ہیں مگر حضرت مُلّا علی القاری الحنفیؒ ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں:

کانا من اکابر اهل السنة والجماعة ومن اولیاء هذه الامة - (جمع الوسائل ج۱ ص۲۰۸ طبع مصر) کہ حافظ ابنِ تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ دونوں اہلِ سنت والجماعت کے اکابر میں اور اس اُمت کے اولیاء میں تھے۔

اور حافظ ابن القیمؒ کی تعریف کرتے کرتے امام جلال الدّین سیوطیؒ المتوفی ۹۱۱ھ پھولے نہیں سماتے - (بغیۃ الوعاۃ)

قارئینِ کرام! آپ نے ملاحظہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے تحت حضرت علیؓ نے اُونچی قبروں کو گرایا اور پھر گرا دینے کا حکم صادر فرمایا ہے اور حضرات علماء کرام اور خصوصاً ملّا علی القاری الحنفیؒ اور سید محمود آلوسی الحنفیؒ وغیرہ نے قبروں پر قبّوں اور گنبدوں کے گرانے کو واجب کہا ہے۔ مگر مفتی احمد یار خان صاحب کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو - وہ لکھتے ہیں کہ "اگر ان کی قبریں پختہ بن گئی ہوں تو ان کو گرانا حرام ہے" - (جاء الحق ص۲۶۹ بلفظہٖ) - اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے ایک حرام کام کیا اور کرایا، اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حرام کام کا حکم دیا (العیاذ باللہ تعالیٰ)

اور کیا اسی حرام کا فتویٰ حضرات فقہاء کرام نے دیا ہے - (العیاذ باللہ تعالیٰ) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) نے کیا خوب اور انصاف کی بات ارشاد فرمائی ہے:

سوال : قبور کا پختہ بنانا اور اُن پر عمارات و قُبّہ و روشنی و فرش فروش وغیرہ جو کچھ کہ لوگ کرتے ہیں الخ۔ **الجواب :** ہرگاہ کہ احادیث میں ممانعت ان اُمور کی وارد ہے پھر کسی کے فعل سے وہ جائز نہیں ہو سکتے۔ اور اعتبار قرآن و حدیث و اقوال مجتہدین کا ہے، نہ افعال مخالف شرع کا۔ اگر عرب اور حرمین میں امورِ غیر مشروع خلافِ کتاب و سنّت رائج ہو گئے تو جواز اُن کا نہیں ہو سکتا۔ اور جو وہاں ان بدعات کو کوئی منع نہ کر سکے تو یہ حجّت جواز کی نہیں ہو سکتی، اس پر سکوت کی کوئی وجہ نہیں، کتاب و سنّت سے روکنا چاہیئے۔ فقط واللہ تعالےٰ اعلم، رشید احمد عفی عنہ۔ (فتاویٰ رشیدیہ جلد اوّل ص۱۰)

فریق مخالف کا اعتراض مفتی احمد یار خان صاحب نے اس حدیث کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث کہ قبروں کو مٹا دو اور گرادو، مشرکین کی قبروں کے متعلق ہے اور اس کی دلیل وہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشرکوں کی قبروں کو اکھاڑنے کا حکم دیا، اور لکھتے ہیں کہ شیخ ابنِ حجر مکّی، فتح الباری جلد۲ ص۲۶ میں تحریر فرماتے ہیں (عربی عبارت کا ترجمہ خود مفتی صاحب کی زبانی یہ ہے) کیا جاہلیت کے مشرکین کی قبریں اکھیڑ دی جائیں (باب) فرماتے ہیں یعنی ماسوا انبیاء اور اُن کے متبعین کے، کیونکہ ان کی قبریں ڈھانے میں ان کی اہانت ہے (جاء الحق ص۲۸) دوسرے اس لئے کہ اس میں قبر کے ساتھ فوٹو کا کیوں ذکر ہے، مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ کفّار کی قبریں مراد ہیں کیونکہ ان کی قبروں پر میّت کا فوٹو بھی ہوتا ہے۔ تیسرے اس لئے کہ فرماتے ہیں کہ اُونچی قبر کو زمین کے برابر کر دو اور مسلمان کی قبر کے لئے سنّت ہے کہ زمین سے ایک ہاتھ اُونچی رہے (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۸)

الجواب : یہ سب باتیں مفتی احمد یار خان صاحب کی جہالت اور علم سے بے خبری کا نتیجہ ہیں اوّلاً اسلئے کہ فتح الباری کا مصنّف وہ ابنِ حجر مکّیؒ کو قرار دیتے ہیں، حالانکہ فتح الباری حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کی تصنیف ہے جو ابنِ حجر مکّیؒ سے اقدم بھی ہیں اور اعلم بھی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس چودھویں صدی میں ایسے لوگ مفتی بن گئے ہیں جن کو فتح الباری جیسی کتاب کے مؤلف کا صحیح علم

نہیں ہے۔ حیرت ہے ایسے مفتی پر۔ وثانیًا[۲] مفتی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ نبش قبور الگ چیز ہے جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشرکین کی قبروں کو اکھاڑنے کا حکم دیا تھا۔ اور مفتی صاحب کے قول کے مطابق شیخ ابن حجر مکیؒ نے فتح الباری میں اس کی شرح کی ہے۔ اور تسویہ قبور اور چیز ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وثالثًا[۳] مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ داد ہے کہ قبر کے ساتھ فوٹو کا ذکر ہے اور مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں؟ سبحان اللہ تعالیٰ! گویا مفتی صاحب نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ فوٹو اور قبر ایک ساتھ ہوں، حالانکہ قبروں کو ڈھانے کا حکم الگ ہے اور تصویروں کو مٹانے کا حکم جدا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں اُن کو مٹانا چاہیئے۔ چنانچہ نسائی شریف ج ۱ ص۲۲۱ میں اسی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں ولا صورۃ فی بیت، کسی گھر میں کوئی تصویر نہ چھوڑنا۔ مفتی صاحب ہی فرمائیں کیا آج کل مسلمانوں کے گھروں میں بھی فوٹو اور تصویریں ہوتی ہیں یا نہیں؟ ورابعًا[۴] یہ بھی مفتی صاحب نے خُوب کہی کہ اُونچی قبر کو زمین کے برابر کردو۔ حالانکہ ہم علامہ ماردینیؒ کے حوالہ سے نقل کرچکے ہیں کہ زمین کے ساتھ برابر کرنا مراد نہیں ہے بلکہ معتاد قبروں کے ساتھ برابر کرنا مراد ہے۔ وخامسًا[۵] مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ داد ہے کہ قبر زمین سے ایک ہاتھ اُونچی رہے۔ نہ معلوم یہ کس حدیث کا ترجمہ ہے کہ قبر زمین سے ایک ہاتھ اُونچی ہو۔ یہ بدایونی تحقیق بھی بہت ہی نرالی ہے۔ پہلے سنن الکبریٰ اور عالمگیری کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ قبر صرف ایک شبر (بالشت) کے قریب اونچی ہونی چاہیئے۔ غنیۃ الطالبین ص۶۴۰ رکن الدین ص۲۰۸، فتاویٰ رضویہ ج۴ ص۱۴۲ اور ملفوظات حصہ سوم مکمل ص۳۲۵ میں بھی قبر کی اونچائی ایک بالشت لکھی ہے۔ وسادسًا لیجیئے ہم ایک صحیح روایت عرض کرتے ہیں جس سے مفتی احمد یار خاں اور اسی طرح اُن حضرات کی بخوبی تردید ہوجاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث مشرکوں کی قبروں سے متعلق ہے چنانچہ مشہور و معروف تابعی حضرت ثمامہؒ بن شفیؒ (المتوفی سنہ ھ) روایت کرتے ہیں کہ:

قال کنا مع فضالۃؓ بن عبید بارض الروم برودس فتوفی صاحب لنا فامر فضالۃؓ بقبرہٖ فسوی ثم قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یامر بتسویتہا۔

ہم حضرت فضالہؓ بن عبید (المتوفی سنہ ۵۳ھ) کے ساتھ روم کی سرزمین رودس کے مقام پر تھے کہ ہمارا ایک ساتھی فوت ہوگیا۔ حضرت فضالہؓ نے ان کی قبر کو (عام قبروں کے ساتھ) برابر کرنے کا حکم دیا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ میں نے جناب

(مسلم ج ا ص۳۱۲ و نسائی ج ا ص۲۲۱ و ابوداؤد ج ۲ ص۱۰۵) نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ نے قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہی روایت اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ امام بیہقیؒ نے یوں نقل کی ہے :

عن ثمامة بن شفيؒ قال خرجنا غزاة زمن معاويةؓ الی هذه الدروب وعلينا فضالة بن عبيد فتوفی ابن عم لی يقال له نافع بن عبد قال فقام فضالة فی حفرة فلما دفناه قال خففوا عنه التراب فان رسول الله صلی الله عليه وسلم كان يامرنا بتسوية القبور۔ (سنن الکبری ج ۳ ص۴۱۱)

ثمامہؒ بن شفیؒ کہتے ہیں کہ ہم حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں ان پہاڑی دروں میں جہاد کرنے کی غرض سے نکلے۔ ہم پر حضرت فضالہؓ بن عبید سالار مقرر تھے۔ میرا چچازاد بھائی جس کا نام نافعؒ بن عبد تھا وہ فوت ہو گیا۔ حضرت فضالہؓ ان کی قبر میں کھڑے ہوئے۔ جب ہم ان کو دفن کر چکے تو حضرت فضالہؓ نے فرمایا۔ قبر پر سے مٹی تھوڑی اور ہلکی کرو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہ صحیح روایت اس بات کی روشن اور واضح دلیل ہے کہ تسویۂ قبور کا حکم مشرکوں کی قبروں کے ساتھ خاص نہ تھا ورنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی اور فوج کے سپہ سالار ایک مسلمان کی قبر کے تسویہ کا حکم ہرگز نہ دیتے اور اس پر دلیل یہ نہ پیش کرتے کہ میں نے خود اپنے کانوں سے یہ مسئلہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔ حضرات صحابۂ کرامؓ کا دور تھا اور حضرت امیر معاویہؓ (المتوفی سنہ۶۰ھ) کی حکومت تھی۔ کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ حضرت فضالہؓ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں، تسویۂ قبور کا حکم تو مشرکوں کی قبروں کے متعلق ہے؟

الغرض حضرات صحابۂ کرامؓ سے بلا نکیر یہ امر ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک بھی یہ حکم عام تھا۔ مشرکوں کی قبروں سے اس کی تخصیص کی ہرگز کوئی وجہ ان کے نزدیک نہ تھی۔

باقی عام قبّوں کو اور قبروں پر عمارات کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر قیاس کرنا درست نہیں ہے اس لئے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو :

فقال ناس یدفن عند المنبر وقال اٰخرون یدفن بالبقیع فجاء ابوبکرؓ الصدیق فقال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما دفن نبی قط الا فی مکانہ الذی توفی فیہ فحفرلہ فیہ۔

(موطا امام مالک ص۸۰ وشمائل ترمذی ص۲۸)

بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کو منبر کے پاس دفن کیا جائے اور بعض دوسروں نے کہا کہ آپ کو جنّت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ نبی صرف اسی جگہ میں دفن کیا جاتا جسمیں ان کی وفات ہوتی ہے، سو اسی جگہ آپ کی قبر کھودی گئی۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں ہوئی تھی، لہٰذا اس حدیث کے رُو سے آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا۔ باقی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بالتبع وہاں دفن ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ اگر وہ اُس جگہ سے باہر کہیں دفن ہوتے تو ہرگز ان کی قبروں پر حضرات صحابہ کرامؓ عمارت تعمیر نہ کرتے۔ جیسے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور دیگر ہزاروں کی تعداد میں حضرات صحابہ کرامؓ تھے مگر کسی کی قبر پر نہ تو گنبد بنائے گئے اور نہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ کئی صدیوں کے بعد ترکوں نے اپنے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے پیش نظر متعدد قبروں پر گنبد تعمیر کئے۔ مگر ان کا یہ فعل شرعًا کوئی حجّت نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے صحیح اور صریح روایت گذر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے جو کام آپ نے منع کیا ہو وہ کسی کے کرنے سے جائز نہیں ہو جاتا۔ الغرض یوں نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر مبارک پہلے ہو اور اس پر عمارت بعد کو تعمیر کی گئی ہو۔ بلکہ چونکہ آپ کی وفات ہی اس حجرہ میں ہوتی تھی اس لئے اس سابق حدیث کے پیش نظر آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا۔ پھر حسبِ تحقیق شاہ عبدالحق صاحب محدّث دہلویؒ وغیرہ ایک خاص المناک واقعہ پیش آیا جس کے تحت ۵۵۷ھ میں سلطان نورالدّین شہید محمودؒ بن زنگیؒ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے اردگرد نہایت گہری دیوار میں سیسہ اور رانگ، گلا کر اس کو بھر دیا اور مضبوط دیوار قائم کی۔ (دیکھئے جذب القلوب الی دیار المحبوب ص۸۶) اور پھر ۶۷۸ھ میں سلطان قلاؤن صالحیؒ نے یہ گنبد سبز جو اب تک موجود ہے، بنوایا۔ مفتی احمد یار خان صاحب کو اس کا اقرار ہے (دیکھئے جاء الحق ص۲۷۲)

نوٹ ضروری : قبروں پر قبّوں اور گنبدوں کا گرانا صحیح احادیث اور اقوال حضرات فقہاء کرامؒ سے ثابت ہے۔ مگر یہ بات اچھی طرح ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کام سلطانِ اسلام اور اسلامی حکومت کا ہے۔ انفرادی طور پر افراد کا یہ کام نہیں ہے۔ اس لئے عوام کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔

قبروں پر چراغ روشن کرنا

قبور پر چراغ و قندیل اور موم بتی وغیرہ جلانے کی شریعتِ اسلامی میں کوئی اصل نہیں ہے اور شریعتِ حقّہ اس قبیح حرکت سے نہایت ہی سخت بیزار ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیہا المساجد والسرج (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۵، موارد الظمآن ص ۲۰۰، نسائی ج ۱ ص ۲۲۲، طیالسی ص ۳۵۷، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۷۱)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر اور ان پر چراغ روشن کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔

اور اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ (ملاحظہ ہو، موارد الظمآن ص ۲۰۰ و سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۷۸)۔

اور ظاہر ہے کہ جس کام پر سردارِ دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو، وہ کسی وقت اور کسی حیثیت سے جائز اور مستحب نہیں ہوسکتا، اور نہ اُس کے اندر کوئی فائدہ اور خوبی ہوسکتی ہے، اور نہ ضرورت اور غیر ضرورت کے مصنوعی پیوند اس میں لگ سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب یا کوئی اور بدعت پسند اس میں خانہ ساز فوائد اور منافع بتانا شروع کر دے۔ یہ صرف ان کے مُنہ کی بات ہے، اور جن علماء سے انہوں نے جواز اور استحباب نقل کیا ہے وہ نہ تو معصوم ہیں اور نہ مجتہد۔ پھر نہ معلوم جس کام پر آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو

وہ ان کے کہنے سے کیسے مستحب اور جائز و کارِ ثواب ہو سکتا ہے؟ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ولی اور غیر ولی، عالم اور جاہل کی قبر کا کوئی فرق نہیں کیا۔ جس سے صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہر ایک قبر پر چراغ روشن کرنا باعثِ لعنت ہے۔ پھر یہ کہنا کہ علیٰ کے معنی اُوپر کے ہیں، لہٰذا قبر کے اُوپر چراغ جلانا درست نہیں اور اگر آس پاس ہو تو جائز ہے، یہ بھی نری جہالت ہے۔ علیٰ کے معنی میں یہ دونوں مفہوم داخل ہیں۔ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ کا معنیٰ کیا مفتی احمد یار خان صاحب یہ کریں گے کہ حضرت عُزیر علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اُس بستی میں لوگوں کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھتے ہوئے گزرے تھے؟ حدیث معراج میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

فمررت علیٰ موسیٰ۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ ج۲ ص۵۲۸) میرا گزر حضرت موسیٰ (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) پر ہوا۔

الغرض لفظ علیٰ اردگرد اور آس پاس کو بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔ اور آپ نہ کھڑے ہوں کسی منافق کی قبر پر۔

کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ منافق کی قبر کے اُوپر چڑھ کر تو نہ کھڑے ہوں، مگر دعا کے لئے اردگرد اور آس پاس کھڑے ہو جائیں۔ ایک روایت یوں آتی ہے کہ ایک بی بی کی ایامِ زچگی میں وفات ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے:

فقام علیها للصّلوٰۃ (ابوداؤد ج۲ ص۱۰۱) اس پر کھڑے ہو کر جنازہ کی نماز پڑھائی۔

مفتی صاحب اس کا کیا مطلب لیتے ہیں، یہ ان کی صواب دید پر موقوف ہے۔ غرضیکہ اگر چراغ قبر کے اُوپر جلایا جائے، تب بھی ناجائز ہے، اور اگر آس پاس روشن کیا جائے تب بھی باعثِ لعنت ہے۔ بلکہ دوسری صورت لوگوں میں زیادہ رائج تھی اور اب بھی ہے۔ کیونکہ یہ کسی نے گوارا نہیں کیا کہ کسی بزرگ کی قبر کے تعویذ پر چراغ جلایا جائے۔ لوگ تو بزعمِ خود حضرات اولیاء کرامؒ کی عزت کے لئے چراغاں کرتے ہیں، اور یہ صورت ان کے خیال میں سراسر توہین کی ہے، پھر بھلا وہ اس کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں؟ اس لئے قرین قیاس یہی بات ہے کہ قبر کے اردگرد چراغ جلانا زیادہ مذموم ہے۔

رہا مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ اس صورت میں تو حقیقت اور مجاز کا اجتماع لازم ہوگا اور یہ ممنوع ہے۔ (جاء الحق ص۱۹۵) تو یہ ان کی بے خبری کا نتیجہ ہے کیونکہ اس صورت میں جمع بین الحقیقۃ والمجاز نہیں ہے جو ناجائز ہے، بلکہ یہ عموم مجاز ہے جو جائز ہے۔ اُصولِ فقہ کی کتابیں ملاحظہ کیجئے۔

جلیل القدر صحابی حضرت عمروؓ بن العاص (المتوفی ۴۳ھ) فاتح مصر نے یہ وصیت کی تھی کہ:

فاذا انا مت فلا تصحبني نائحة ولا نار۔ (مسلم ج ۱ ص۷۶)

جب میری وفات ہو جائے تو نہ میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت جائے اور نہ میرے ساتھ آگ ہو۔

حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ (المتوفاۃ ۷۳ھ) نے بھی یہ وصیت کی تھی کہ:

ولا تتبعوني بنار (موطا امام مالک ص۷۸)

میرے ساتھ آگ نہ لے جانا۔

حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

واما اتباع الميت بالنار فمكروه للحديث ثم قيل سبب الكراهة كونه من شعار الجاهلية وقال ابن حبيب المالكي كره تفاءلا بالنار۔ (شرح مسلم ج ۱ ص۷۶)

میت کے ساتھ آگ لے جانا حدیث کی رُو سے مکروہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کراہت شعارِ جاہلیت ہونے کی وجہ سے ہے اور امام ابنِ حبیب مالکیؒ کہتے ہیں کہ آگ بد فالی اور بدشگونی کی وجہ سے مکروہ ہے (کہ کہیں اس کا تعلق آگ سے ہی نہ ہو جائے)۔

غور کیجئے کہ حضرات صحابۂ کرامؓ وفات کے وقت کس طرح وصیت کرتے ہیں کہ وفات کے بعد آگ ہمارے قریب نہ آنے دینا۔ مگر غضب ہے کہ آج قبروں پر خوب ٹکا کر چراغ روشن کئے جاتے ہیں اور یہ منطق پیش کی جاتی ہے کہ اس میں حضرات اولیاء کرامؒ کی عظمت ہے، راستہ پر چلنے والوں کیلئے سہولت ہے۔ قرآن کریم پڑھنے والوں کے لئے آسانی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر حضرات اولیاء کرام کی تعظیم و توقیر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کی خلاف ورزی سے ہوتی ہے اور اگر ان کی محبت لعنت کا کام کرنے سے ہوتی ہے تو ہم ببانگِ دہل کہتے ہیں کہ یہ تعظیم مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کے ساتھیوں کو ہی نصیب ہو۔ ہمارے نزدیک خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے آگے

سرِ تسلیم خم کرنے سے ہی حضرات اولیاءِ کرامؒ اور بزرگانِ دین کی تعظیم ہوتی ہے ؏

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ:

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن اتخاذ القبور مساجد و ايقاد السرج عليها (زاد المعاد ج ۱ ص ۱۴۶)	آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ روشن کرنے سے منع کیا ہے۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ:

وايقاد النار على القبور فمن رسوم الجاهلية۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۷۸)	قبروں پر آگ جلانا جاہلیت کی رسم ہے۔

اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین وہ شخص ہے جو اسلام میں جاہلیت کی رسمیں تلاش کرے۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۷ عن البخاری)

علامہ سید محمود آلوسی حنفیؒ کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کا یہ حوالہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ "پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر چراغ افروزاں نزد قبر و سجدہ کنندگان لعنت گفتہ" (ارشاد الطالبین ص ۲۲)۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب بھی اس کو نقل کرتے ہیں اور نیز لکھتے ہیں کہ شاہ عبد العزیز صاحبؒ بھی قبروں پر چراغ روشن کرنے کو بدعتِ شنیعہ کہتے ہیں (جاء الحق ص ۲۸۸-۲۸۹)۔

اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ لکھتے ہیں:

و اما ارتکاب محرمات از روشن کردن چراغہا و ملبوس ساختن قبور و سرود ہا و نواختن معازف بدعاتِ شنیعہ اند و حضور چنیں مجالس ممنوع۔ (فتاویٰ شاہ رفیع الدین ص ۱۴۲)	یعنی حرام چیزوں کا ارتکاب کرنا مثلاً قبروں پر چراغ جلانا اور ان پر چادریں چڑھانا اور سرود اور گانے بجانے کے آلات استعمال کرنا بدعاتِ شنیعہ میں سے ہے اور ایسی مجالس میں حاضر ہونا ممنوع ہے۔

حضرات آپ نے ملاحظہ کیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت کے علماء حق تک قبروں پر چراغ روشن کرنے کو باعثِ لعنت، حرام، مکروہ، بدعت اور بدعتِ شنیعہ سے تعبیر کرتے ہیں پھر

بھلا اس، مذموم فعل میں بھلائی اور خوبی آئے تو کہاں سے آئے؟ مگر پتہ مرنے کے بعد چلے گا۔ ؎

بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت　　　که باکہ باختہ عشق در شبِ دیجور

مفتی احمد یار خان صاحب کی ججمنٹ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ "حضرت شاہ عبد العزیز صاحب و قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہما بے شک بزرگ ہستیاں ہیں لیکن یہ حضرات مجتہد نہیں تاکہ کراہتِ تحریمی و حرمت فقط ان کے قول سے ثابت ہو، اس کے لئے مستقل دلیلِ شرعی کی ضرورت ہے۔" (بلفظہ جاء الحق ص۲۹۴) مفتی صاحب کی یہ بات قابلِ صد تحسین ہے کہ انہوں نے ایک حق بات تو زبان سے نکالی ہے اور اس کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ دلیلِ شرعی کے مقابلہ میں بزرگ سے بزرگ ہستیاں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہی تو ہمارا اور اہلِ بدعت کا اصولی جھگڑا ہے کہ ہم قرآن کریم اور حدیث شریف اور حضرات صحابہ کرامؓ اور اجماعِ امت جیسی شرعی دلیل کے مقابلہ میں کسی بھی بزرگ ہستی کی بات کو حجت نہیں تسلیم کرتے، اور اہلِ بدعت نے انہی بعض بزرگ ہستیوں کی لغزشوں کو چن چن کر دین بنا رکھا ہے۔ اور شرعی دلیل کی طرف مطلقاً دھیان ہی نہیں کرتے۔ کاش کہ وہ انصاف اور دیانت کے ساتھ اس اصول پر کاربند ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

مگر اس عبارت میں چند وجوہ سے بحث ہے۔ اولاً کیا جن حضرات سے مفتی صاحب اور ان کے ہم نوا بزرگ استدلال و احتجاج کیا کرتے ہیں وہ سب کے سب مجتہد ہیں؟ اگر ہیں تو چشم ما روشن دل ماشاد! اگر نہیں تو اس وقت یہ قاعدہ کہاں جاتا ہے؟ و ثانیاً مفتی صاحب فرمائیں کہ جس کام پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے کیا اس میں بھی کراہتِ تحریمی اور حرمت ہوتی ہے یا نہیں؟ ان دونوں حضرات کا یہ فتویٰ اپنا ذاتی نہیں، یہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیثِ سابق سے ماخوذ ہے۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحبؒ باقاعدہ اپنی عبارت میں اس حدیث کا حوالہ دے رہے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ لفظ محرمات میں اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بلاشک اگر یہ فتویٰ اور قول

ان کا اپنی طرف سے ہوتا تو دلیلِ شرعی کے مقابلہ میں حجت نہ ہوتا۔ مگر یہاں تو ان کا فتویٰ دلیلِ شرعی پر مبنی ہے، پھر یہ کیسے ردّ ہوا؟ وثالثاً مفتی صاحب کی یہ تحقیق اور تقسیم بھی قابلِ داد ہے کہ کراہتِ تحریمی اور حرمت تو بزرگ ہستیوں کے قول سے ثابت نہیں ہوسکتی مگر استحباب اور جواز ان کے قول سے ثابت ہوسکتا ہے؟ کیا استحباب ایک شرعی حکم نہیں ہے؟ پہلے باحوالہ یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ استحباب و ندب بھی ایک شرعی حکم ہے، اور اس پر بھی دلیل درکار ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ کسی مباح کی اباحت بھی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتی۔

نوٹ: اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کسی میت کو رات کے وقت دفن کرنے کی نوبت آئے اور روشنی کی ضرورت پیش آئے تو کتبِ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت موجود ہے۔ یہ چیز محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے۔

قبروں پر چادریں ڈالنا اور پھول وغیرہ چڑھانا

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین اور خیر القرون سے اس کا ہرگز کوئی ثبوت نہیں کہ حضرات اولیاء کرامؒ کی قبروں پر چادریں ڈالی گئی ہوں یا اُن پر پھول وغیرہ چڑھائے گئے ہوں۔ حضرات اولیاء کرامؒ کی قبریں بھی ہوتی تھیں، پھول اور چادریں بھی ہوتی تھیں، اور ڈالنے والے بھی ہوتے تھے، اور اُن میں عشق و محبت کا اعلیٰ جذبہ بھی تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے نہ تو پھول چڑھائے اور نہ چادریں ڈالیں، اور آج یہ کام جائز ہوگئے اور کارِ ثواب بھی، اور اہلِ سُنّت کی علامت بھی قرار پائی اور شعار بھی —— باقی مولوی نعیم الدّین صاحب مراد آبادی اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ اہلِ بدعت نے حضرت ابنِ عباسؓ کی جس روایت سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دو قبروں پر کھجور کی ٹہنیاں گاڑ دی تھیں۔ ایک شخص پیشاب کی چھینٹوں سے اجتناب نہیں کیا کرتا تھا (اور اُس صورت میں ناپاک بدن اور کپڑوں سے جو نماز پڑھی گئی وہ کالعدم رہی تو اصل عذاب ترکِ صلوٰۃ پر ہوا۔ نووی ج ۱ ص ۱۴۱) ۔ اور دوسرا چغلی کیا کرتا تھا۔

اور آپ نے فرمایا کہ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں گی، شاید ان سے سزا میں تخفیف ہو جائے (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص۴۲ محصلہ) - تو اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔

اولاً اس لئے کہ تخفیفِ عذاب کا سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت تھی۔ ٹہنیاں تو صرف اس کی علامت اور نشانی مقرر ہوئی تھی - چنانچہ حضرت جابرؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

انی مررت بقبرین یعذبان فاحببت بشفاعتی ان یرفّه ذٰلك عنهما مادام الغصنان رطبین - (مسلم ج ۲ ص۴۱۸) — کہ میں دو قبروں کے پاس سے گزرا - ان میں دونوں مردوں کو عذاب ہو رہا تھا میں نے اپنی شفاعت کے ذریعہ یہ پسند کیا کہ جبتک یہ ٹہنیاں تر رہیں، ان دونوں سے عذاب کی کمی ہو۔

اگرچہ اپنی جگہ قراۃِ قرآن کریم تسبیحات اور ٹہنیاں (سبز و خشک) بھی تخفیفِ عذاب کا سبب ہیں مگر اس واقعہ میں تخفیف عذاب کا اصل سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت تھی۔ ٹہنیاں تو صرف اسکی علامت قرار دی گئی تھی مفتی احمد یار خان صاحب کی یہ غلطی ہے کہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ "عذابِ قبر کی کمی سبزے کی تسبیح کی برکت سے ہے نہ کہ محض حضور علیہ السلام کی دُعا سے - اگر محض دعا سے کمی ہوتی تو حدیث میں خشک ہونے کی کیوں قید لگائی جاتی - لہٰذا اگر ہم بھی آج پھول وغیرہ رکھیں تو بھی انشاء اللہ میت کو فائدہ ہوگا (جاء الحق ص۲۸۴) مفتی صاحب اگر ٹہنیوں کی تسبیح کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہوئی تو سبز کی قید کیوں لگائی ؟ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے خشک ہو یا تر - وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ -

نوٹ : حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ کی دونوں روایتوں میں واقعہ دراصل ایک ہی ہے البتہ راویوں کی تعبیر کا ضرور فرق ہے، اور علمِ حدیث میں ایسا بعض اوقات ہو ہی جاتا ہے - امام نوویؒ اور علامہ خطابیؒ (المتوفی ۳۸۸ھ) وغیرہ اس واقعہ کے اتحاد ہی کے قائل ہیں - اگر یہ دو واقعے بھی ہوں جیسا کہ حافظ ابنِ حجرؒ (فتح الباری ج ۱ ص۲۷۶ میں) لکھتے ہیں، تب بھی کوئی حرج نہیں - جس روایت میں آپ کی شفاعت کا ذکر ہے وہ اُس روایت کی تفسیر ہے جس میں اس کا ذکر نہیں ہے - تو اصل علت اور سبب شفاعت ہی ہے - والحدیث یفسر بعضه بعضا - لہٰذا مولوی نعیم الدین

صاحب مراد آبادی (المتوفی ۱۳۶۷ھ) نے اپنے رسالہ (فوائد النور ص ۲۲-۲۳) میں جو اس پر زور دیا ہے کہ یہ دو واقعے الگ الگ ہیں، اُن کو چنداں مفید نہیں ہے۔

وثانیاً یہ ٹہنیاں عام درختوں سے نہ کاٹی گئی تھیں بلکہ مسلم جلد ۲ ص ۴۱۸ کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ یہ ان دو درختوں کی ٹہنیاں تھیں جو بطور معجزہ آپ کے پاس چل کر آئے تھے، اور پھر اپنے اپنے مقام پر چلے گئے تھے۔

وثالثاً اس روایت سے اگر ثبوت ہے بھی تو صرف تر ٹہنیوں کا، پھولوں اور چادروں کا ثبوت کہاں سے ہوا؟

ورابعاً اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اصل سبب تخفیفِ عذاب کا ٹہنیوں کا سبز ہونا تھا، اور یہ علت پھول وغیرہ میں پائی جاتی ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ گناہ گاروں اور فاسقوں کی قبروں پر پھول وغیرہ ڈالنے چاہئیں۔ حضرات اولیاءِ کرامؒ کی قبروں پر اس کا ثبوت کیسے ہوا؟ کیونکہ آپ نے گناہ گاروں کی قبروں پر ٹہنیاں رکھی تھیں نہ کہ حضرات اولیاءِ کرامؒ کی قبروں پر (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ج ۱ ص ۸۷۹)

وخامساً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور خیر القرون سے ہرگز اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے کسی ولی اور بزرگ کی قبر پر سبز ٹہنی رکھی ہو اور پھول ڈالے ہوں —— رہی حضرت بریدہؓ بن الخصیب کی وصیت کہ میری قبر پر تر ٹہنی رکھ دینا (بخاری جلد ۱ ص ۱۸۱) جو حضرات وضع الجرید تین کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ انہوں نے انکساری سے اپنے کو گناہگار سمجھ کر یہ وصیت کی ہو۔ اور سوال یہ ہے کہ کیا خیر القرون میں کسی نے کسی کو ولی اور بزرگ سمجھ کر اس کی قبر پر ٹہنیاں رکھی ہیں؟ اور کیا ان سے چادریں ڈالنے کا ثبوت ہے؟ اسی جزو میں اختلاف ہے اور بس ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی اشرف علی صاحب نے اصلاح الرسوم میں لکھا، کہ پھول وغیرہ فاسقوں، فاجروں کی قبروں پر ڈالنا چاہیئے نہ کہ قبور اولیاء پر۔ ان کے مزارات میں عذاب ہے ہی نہیں جس سے پھول وغیرہ سے تخفیف کی جائے۔ مگر خیال رہے کہ جو اعمال گناہ گار کیلئے

دفعِ مصیبت کرتے ہیں وہ صالحین کے لئے بلندی درجات کا فائدہ دیتے ہیں۔ (جاء الحق ص۲۸۴)
مفتی صاحب کو یہ نسخہ تو بہت ہی اکسیر ہاتھ آیا ہے، مگر اس پر مطلقاً غور نہ کیا کہ یہ مسئلہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کو بھی معلوم تھا۔ پھر انہوں نے صالحین کی قبروں پر پھول کیوں نہ ڈالے؟ اور صالحین کو رفعِ درجات کے فائدہ سے کیوں محروم رکھا؟ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟

اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ قیاس بھی مردود اور باطل ہے کہ ایک تر پھول میں زندگی ہے، اس لئے وہ تسبیح و تہلیل کرتا ہے جس سے میّت کو ثواب پہنچتا ہے یا اس کے عذاب میں کمی ہوتی ہے، زائرین کو خوشبو حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کی قبر پر ڈالنا جائز ہے (جاء الحق ص۲۸۳ بلفظہٖ) فی الجملہ ادراک و شعور اور تسبیح و تہلیل تو ہر ایک چیز سے شرعاً ثابت ہے اور قرآن کریم اس پر ناطق ہے پھر خشک و تر کا فرق کیوں؟ علاوہ بریں یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کو بھی معلوم تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مزید براں چادروں میں کونسی تری، سبزی اور زندگی ہے جو اس حدیث سے وہ بھی قبروں پر ڈالنی جائز ہو گئیں؟ باقی کسی غیر معصوم اور غیر مجتہد کی بات حجت نہیں ہے۔ رہا امام شامیؒ وغیرہ کا یہ قول کہ قبور پر ستور درست ہیں کیونکہ اس میں صاحبِ قبر کی تعظیم ہے وغیرہ وغیرہ، تو قابلِ التفات نہیں ہے اس لئے کہ یہ غیر مجتہد کا قول ہونے کے علاوہ بلا دلیل بھی ہے۔ اور قبر اور تعظیمِ قبر کوئی نیا واقع نہیں کہ ہم اس میں متاخرین کے قیاس کو بھی تسلیم کرلیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے زمانہ میں قبریں بھی ہوتی تھیں مگر چادروں کا کوئی دستور نہ تھا (اور اسی پر ان کا عمل اور اتفاق رہا ہے یہ الگ بات ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے اپنی جہالت کا یوں ثبوت دیا ہے، ان کے قبور پر سبزہ یا پھول ڈالنا بالاتفاق جائز ہے۔ جاء الحق ص۳۰۴ ـ لاحول ولا قوۃ الا باللہ)۔ لہٰذا ہمیں مصنوعی تعظیم اور احترام کی ضرورت نہیں ہے۔ جو انہوں نے کیا سو ہمیں بھی کرنا چاہیئے۔

رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ قیاس کہ "چادر کی اصل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانۂ پاک

میں بھی کعبہ معظمہ پر غلاف تھا کہ اس کو منع نہ فرمایا۔ صدیوں سے حضور علیہ السلام کے روضۂ پاک پر غلافِ سبز ریشمی چڑھا ہوا ہے جو کہ نہایت قیمتی ہے۔ آج تک کسی نے اس کو منع نہ کیا۔ مقامِ ابراہیم یعنی وہ پتھر جس پہ کھڑے ہو کر حضرت خلیلؑ نے کعبہ معظمہ بنایا، اس پر بھی غلاف چڑھا ہوا ہے۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۸۵) ۔ تو یہ قیاس مع الفارق ہے جو مسموع نہیں ہے۔ اس لئے کہ کعبہ کا غلاف تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی موجودگی میں چڑھتا تھا، اور اس میں آپ نے تغیر نہیں کیا۔ لہٰذا وہ عین سنّت ہے (دیکھئے بخاری جلد ۲ ص۶۱۳ وغیرہ) ۔ اسی طرح مقامِ ابراہیمؑ کا غلاف بھی اگر ثابت ہو، تو بظاہر خیر القرون کا ہو گا، ان پر قبور کے غلاف کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ راقم اثیم دو مرتبہ حج کے شرف سے مشرف ہوا ہے لیکن مقامِ ابراہیمؑ پر کوئی غلاف نہیں دیکھا۔ اس وقت یہ مبارک پتھر ایک دبیز شیشے کے مینار میں رکھا ہوا ہے۔ باقی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کا غلاف، تو اگر یہ کسی معتبر دلیل سے ثابت ہو تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غسل، دفن اور قبر وغیرہ کے متعلق چند اور خصوصیات بھی تھیں ممکن ہے یہ بھی اُن ہی میں سے ہو۔ لہٰذا اس پر عام قبروں کو قیاس کرنا باطل ہے۔ اور پہلے حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ سے اور بقول مفتی احمد یار خان صاحب حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ قبر کو ملبوس کرنا یعنی اس پر چادریں وغیرہ ڈالنا بدعتِ شنیعہ ہے۔ لہٰذا عام حکم یہی ہے۔

مفتی صاحب کا مفتیانہ استدلال مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ اولیاء اللہ اور ان کے مزارات شعائر اللہ ہیں اور شعائر اللہ یعنی اللہ کے دین کی نشانیوں کی تعظیم کرنے کا قرآنی حکم ہے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۔ اس تعظیم میں کوئی قید نہیں۔ ہر مُلک ہر رسمے، جس مُلک اور جس زمانہ میں جو بھی جائز تعظیم مروّج ہے وہ کرنا جائز ہے۔ اُن کی قبروں پر پھول ڈالنا، چادریں چڑھانا، چراغاں کرنا، سب میں ان کی تعظیم ہے لہٰذا جائز ہے (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۸۳)

داد دیجئے مفتی صاحب کی اس تحقیق کی کہ حضرات اولیاء اللہ کے مزارات بھی شعائر اللہ ہیں

داخل ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے معظّم شعائر اللہ تو چار بتائے ہیں۔ قرآن، کعبہ، نبی اور نماز (حجۃ اللہ ج ۱ صفحہ)۔ وہاں قبور کا ذکر نہیں ہے، اور کسی امام سے بھی قبور کا شعائر اللہ ہونا منقول نہیں۔ مگر مفتی صاحب کی تحقیق سے مزارات بھی شعائر اللہ ٹھہرے۔ علماء عقائد نے صراحت سے لکھا ہے کہ جس کے خاتمہ بالخیر ہونے کی خبر اللہ تعالیٰ نے اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہ دی ہو، ہم صرف اس کے متعلق حسنِ ظن ہی رکھ سکتے ہیں، قطعیت سے کچھ نہیں کہہ سکتے، تو یقین کے ساتھ کسی کو ولی کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اور پھر ان کی قبر کو شعائر اللہ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ اور پھر مفتی صاحب کے نزدیک ان شعائرِ اللہ کی تعظیم یوں ہے کہ اُن کی قبروں پر پھول ڈالنا، چادریں چڑھانا اور چراغاں کرنا۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ نے کسی نیک کی قبر پر شاخیں نہیں رکھیں۔ حضرت بریدہؓ کا معاملہ ہی الگ ہے، بلکہ گناہ گار کی قبر پر رکھی تھیں۔ یہ عجیب شعائر اللہ اور نرالے ولی ہوئے کہ ہم پہلے ان کو گناہ گار تصوّر کریں اور پھر اُن کی قبروں پر پھول وغیرہ چڑھائیں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔ اور کیا شعائر اللہ کی تعظیم چراغاں جیسے کام سے ہوگی، جس پر سردارِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! عجیب محکمۂ افتاء مفتی احمد یار خان صاحب کے ہاتھ آیا ہے اور پھر یہ سب کچھ ان کے نزدیک قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے ثابت ہے معاذ اللہ تعالیٰ ثم معاذ اللہ تعالیٰ۔ نہ تعظیم کا یہ پہلو اس آیت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو معلوم ہو سکا اور نہ حضرات صحابۂ کرامؓ کو۔ اگر معلوم ہوتا تو قبر پر چراغاں کرنے پر آپ لعنت نہ کرتے اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ اس کے خلاف وصیّت نہ کرتے۔ مگر کیا کیا جائے، اہلِ بدعت کا باوا آدم ہی نرالا ہے ان کے نزدیک ہر ممنوع چیز مستحب اور کارِ ثواب ہے۔

نیا انکشاف مفتی احمد یار خاں صاحب لکھتے ہیں کہ "حضور علیہ السّلام کے زمانہ میں خود زندہ لوگوں کو پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی۔ ایک صحابیؓ نے پختہ مکان بنایا تو حضور علیہ السّلام ناراض ہوئے یہاں تک کہ اُن کے سلام کا جواب نہ دیا۔ جب اُس کو گرا دیا تب جوابِ سلام دیا۔" (دیکھو مشکوٰۃ، کتاب الرقاق فصل ثانی)۔ جاء الحق بلفظہٖ ص ۲۷۵

اس کا ثبوت تو مفتی احمد یار خان صاحب کے ذمّہ ہے کہ وہ کونسی حدیث ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے زمانہ میں پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی؟ ذرا اُس حدیث کو نقل تو کیجئے اور اس کی سند اور اس کی تصحیح کا بھی ضرور خیال کیجئے۔ باقی جس روایت کا مفتی صاحب نے حوالہ دیا ہے کیا اچھا ہوتا کہ اس کو بلفظہٖ نقل کر دیتے تاکہ عامۃ المسلمین کو معلوم ہو جاتا کہ حدیث کیا کہتی ہے اور مفتی صاحب کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابی کے لئے جوابِ سلام اس لئے ترک نہ کیا تھا کہ اُس نے مکان پختہ بنایا تھا، بلکہ اس لئے آپ نے اس کو سلام کا جواب نہ دیا تھا کہ اُس نے گنبد اور قبّہ بنایا تھا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے مزاج اور آپ کی طبیعت کو یہ اتنا ناگوار گزرا کہ آپ نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ حضرت انس رضؓ روایت کرتے ہیں کہ:

اِنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج یومًا ونحن معہ فرأی قُبَّۃً مشرفۃً فقال ما ھذا۔ (الحدیث) ابوداؤد ج ۲ ص۳۵۵۔ مشکوٰۃ ج ۲، ص۴۴۱۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک دن باہر نکلے، اور ہم بھی ساتھ تھے۔ آپ نے ایک اُونچا گنبد اور قُبّہ دیکھا، فرمایا یہ کیا ہے الخ

اسی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ جب اُس شخص نے وہ قُبّہ اور گنبد گرا دیا تو پھر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس سے راضی ہوئے۔ غور کیجئے کہ یہ روایت تو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے زندوں کیلئے بھی قُبّہ کی شکل کو پسند نہیں کیا، چہ جائیکہ مردوں کے لئے اس کو پسند کرتے۔ خصوصًا جبکہ آپ نے قبروں پر مطلق عمارت ہی کو پسند نہیں کیا۔ مگر آج نہ صرف قبروں پر عمارت کا جواز پیش کیا جاتا ہے بلکہ گنبد اور قُبّہ جیسی شکل پر زور دیا جاتا ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سرے سے پسند ہی نہیں فرمایا۔

پختہ قبریں بنانے کا ایک اور فائدہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے وطن میں دیکھا کہ دو قبرستان تھے۔ ایک میں کچھ قبریں پختہ تھیں اور دوسرا پختہ قبروں سے خالی تھا۔ فقیروں نے خفیہ طور پر وہ قبرستان فروخت کر دیا۔ مقدمہ چلا تو جس قبرستان میں پختہ قبریں نہ تھیں حکام نے اس کو سفیدہ مانا اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے وہ نکل گیا۔ جس میں پختہ قبریں تھیں وہ حصہ مسلمانوں کے

پاس رہا (محصلہ) پھر آگے لکھتے ہیں کہ "اس سے مجھے پتہ لگا کہ اب ہندوستان میں کچھ قبریں پختہ ضرور بنوانی چاہئیں کیونکہ یہ بقاء وقف کا ذریعہ ہیں جیسے مسجد کے لئے مینارے۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۷۶)۔

کیا خوب؟ سوال یہ ہے کہ وقف کو محفوظ رکھنے کے اس طریقہ کا پتہ حضرات صحابہ کرامؓ کو کیوں نہ لگا بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بقاء وقف کا یہ طریقہ کیوں معلوم نہ ہوا؟ اور آپؐ نے کیوں قبریں پختہ بنانے سے منع کیا؟ اور پھر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ اور دیگر ائمہ اسلام کو یہ طریقہ کیوں نہ سوجھا۔ اور اُنہوں نے کیوں پختہ قبروں اور ان پر عمارتوں کو ڈھانے کی مہم شروع رکھی؟ مفتی صاحب کو تو اس سے پتہ لگا مگر ان کو نہ لگا کیوں؟ یہ نہ پوچھئے۔ باقی جس قبرستان میں پختہ قبریں نہ تھیں، اس کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانا اس پر مبنی نہیں کہ وہاں قبریں پختہ نہ تھیں بلکہ اس میں ایک تو مسلمانوں کی غفلت اور بے پروائی شامل ہے۔ اور دوسری یہ بات ہے کہ قبروں پر فقیروں اور مجاوروں کا وجودِ نامسعود (جو سراسر اسلام کے خلاف ہے) اس کی علت ہے۔ اصل سبب اور علت کو سوچنے کی کوشش نہیں کی، اور غیر علت کو علت اور سبب بنانے کا مفتی احمد یار خان صاحب کو پتہ لگ گیا۔ سُبحان اللہ تعالیٰ۔

قبروں پر مجاور بننا

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں "مجاور بننا تو جائز ہے۔ مجاور اسی کو تو کہتے ہیں جو کہ قبر کا انتظام رکھے۔ کھولنے، بند کرنے کی چابی اپنے پاس رکھے وغیرہ وغیرہ، یہ صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ مسلمانوں کی والدہ حضور علیہ السلام کی قبرِ انور کی منتظمہ اور چابی والی تھیں جب صحابہ کرامؓ کو زیارت کرنی ہوتی تو اُن سے ہی کھلوا کر زیارت کرتے (دیکھو مشکوٰۃ باب الدفن، بلفظہٖ جاء الحق ص۲۷۹)

لیجئے ہم نے مشکوٰۃ شریف بھی دیکھ لی۔ اور مشکوٰۃ میں جہاں سے یہ روایت نقل کی ہے وہ اصل کتاب بھی دیکھ لی مگر مفتی صاحب کے اس غلط اور بے بنیاد دعویٰ کی دلیل وہاں نہ مل سکی۔ روایت ملاحظہ کریں۔

عن القاسم بن محمد قال دخلت علیٰ — حضرت قاسمؒ بن محمد (بن ابی بکرؓ) فرماتے ہیں کہ میں حضرت

عائشة رضؓ فقلت یا اماہ اکشفی لی عن قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و صاحبیہ فکشفت لی عن ثلاثۃ قبور لا مشرفۃ ولا لاطئۃ مطبوخۃ ببطحاء العرصۃ الحمراء۔ (رواہ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۱، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۴۱)

عائشہؓ کے پاس گیا اور میں نے کہا۔ اے میری اماں جان مجھے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے دو ساتھیوں کی قبریں کھول کر دکھائیں تو انہوں نے تینں قبریں کھول کر مجھے بتائیں۔ نہ تو وہ قبریں اونچی تھیں اور نہ بالکل زمین کے ساتھ پیوستہ عرصہ مقام کے سرخ رنگ کے سنگریزے ان پر بچھائے ہوئے تھے۔

حضرت قاسمؒ بن محمدؓ تابعی اور حضرت عائشہؓ کے حقیقی بھتیجے ہیں اور بالکل نو عمر۔ انہوں نے اپنی پھوپھی صاحبہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ (اپنے دادا کی) اور حضرت عمرؓ کی قبر دیکھنے کے شوق کا اظہار کیا اور پھوپھی صاحبہ نے ان کو وہ تینوں قبریں دکھا دیں۔ اس میں نہ تو چابی کا کہیں ذکر ہے اور نہ اس کا ذکر ہے کہ مستقل طور پر کھولنے اور بند کرنے کا انتظام حضرت عائشہؓ کے سپرد تھا، اور نہ اس کا ذکر ہے کہ جب حضرات صحابہ کرامؓ کو زیارت کرنی ہوتی تو اُن سے کھلوا کر زیارت کرتے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کو ان قبروں کی شناخت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انہوں نے تو اپنے ہاتھوں سے ان بزرگوں کو دفن کیا تھا۔ ہاں البتہ حضرات تابعین کو علی التعیین آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات شیخینؓ کی قبریں معلوم کرنے کا شوق تھا، اور ہر مسلمان کو ہونا چاہیئے۔ اسی جذبہ کے تحت حضرت قاسم بن محمدؓ نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ کے ذریعہ یہ شوق پورا کیا، نہ یہ کہ حضرت عائشہؓ وہاں کی مجاور تھیں (العیاذ باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

نماز جنازہ کے بعد دُعا

کسی مسلمان کی وفات کے بعد اُس کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب اس کو جو بہترین تحفہ بھیج سکتے ہیں اور اس کے ساتھ جو حسنِ سلوک کر سکتے ہیں، وہ اس کے حق میں دُعا کرنا ہے۔ انفرادی طور پر جس وقت بھی کوئی چاہے اُس کی وفات کے بعد تا زیست اس کے لئے دعا کرے۔ اس میں کوئی قباحت

اور خرابی نہیں ہے اور نصوصِ شرعیہ سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ لیکن بصورتِ اجتماع میّت کے لئے دُعا کرنے کا ثبوت صرف نمازِ جنازہ کی صورت میں اور قبر پر تلقینِ شرعی کی شکل میں ہے۔ اس کے علاوہ جہاں شریعت نے اجتماعی صورت میں دعا کا طریقہ نہیں بتلایا، وہ درست نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اتباعِ تابعینؒ نے ایک دو نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں جنازے پڑھے اور پڑھائے مگر کسی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے نمازِ جنازہ سے فارغ ہونے کے فوراً بعد اجتماعی رنگ میں دعا مانگی ہو۔ باقی میّت کے لئے مطلق دعا سے، مِل کر اجتماعی شکل میں یا نمازِ جنازہ کے متّصل بعد دُعا ثابت کرنا، افسوس ناک مغالطہ یا قلّتِ تدبّر کا حیرت ناک مظاہرہ ہے۔ اس کی تفصیل گذر چکی ہے کہ احکامِ عامہ سے اُمورِ خاصہ کا اثبات درست نہیں ہے بلکہ یہ ایک عیّارانہ مغالطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احناف کثر اللہ تعالیٰ سوادہم نے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنے سے منع کیا ہے اور اس کو مکروہ کہا ہے۔ چنانچہ امام ابوبکرؒ بن حامد الحنفیؒ (معاصر ابوالحفص الکبیرؒ المتوفّی ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

انّ الدعا بعد صلوٰۃ الجنازۃ مکروہ (محیط باب الجنائز) نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مکروہ ہے۔

امام ابوبکرؒ بن حامدؒ کا حوالہ ہم نے قُنیہ سے نقل نہیں کیا تاکہ مفتی احمد یار خان صاحب اپنے اعلیٰ حضرت کی تقلید کرتے ہوئے یہ نہ کہہ دیں کہ قُنیہ غیر معتبر کتاب ہے، قنیہ والا بدمذہب اور معتزلی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ (دیکھئے جاء الحق ص۲۶۸ محصلہ)۔ ملحوظ رہے کہ ہم نے یہ حوالہ محیط سے نقل کیا ہے جو فقہ حنفی کی معتبر اور مشہور کتاب ہے۔ محیط مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور (انڈیا) کے کتب خانہ میں موجود ہے (تذکرۃ الخلیل ص۲۹۱) اور محیط کا یہ حوالہ امام ابوبکرؒ بن حامدؒ کا نام لئے بغیر دلیل الخیرات ۴۵ (مصنّفہ حضرت مولانا المفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ) میں بھی مذکور ہے اور دلیل الخیرات ص۱۰۹ میں حضرت مولانا خلیل احمدؒ صاحب (المتوفّی ۱۳۴۶ھ) نے اپنے تصدیقی بیان میں بحوالہ محیط امام ابوبکرؒ بن حامدؒ کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے جنہوں نے مدینہ منوّرہ سے محیط برہانی کی آٹھ جلدیں خرید کر مدرسہ کے کتب خانہ کو وقف کر دی تھیں۔ علاوہ بریں قُنیہ اتنی غیر معتبر بھی نہیں ہے جتنی کہ اعلیٰ حضرت بریلوی نے سمجھ

رکھی ہے۔ قنیہ کا صرف وہ حوالہ غیر معتبر ہوگا جس کی تائید دوسرے حضرات فقہاء سے نہ ہوتی ہو (دیکھئے فوائد بہیہ ص۲۱۳ ہفت روزہ رسالہ رضوان لاہور بابت ماہ ۲۱ مئی ۱۹۵۲ء ص۸ کالم ۳ میں ہے قنیہ وغیرہ معتبر کتابوں میں لکھا ہے۔ الخ

امام شمس الائمہ حلوانی الحنفیؒ (المتوفی ۴۵۶ھ) اور بخارا کے مفتی قاضی شیخ الاسلام علامہ سغدی الحنفیؒ (المتوفی ۴۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ:

لا یقوم الرّجل بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ (قنیہ ص۵۶ ج۱)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے کوئی آدمی نہ ٹھہرے۔

امام طاہر بن احمد البخاری الحنفی (المتوفی ۵۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

لا یقوم بالدعاء فی قراءۃ القرآن لاجل المیّت بعد صلوٰۃ الجنازۃ وقبلھا (خلاصۃ الفتاوٰی ج۱ ص۲۲۵) نماز جنازہ کے بعد اور اسی طرح اس سے قبل میت کیلئے قرآن پڑھ کر دعا نہ کی جائے۔

علامہ سراج الدّین اوشی الحنفیؒ (المتوفّٰی فی حدود ۵۷۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

اذا فرغ من الصلوٰۃ لا یقوم بالدّعاء (فتاوی سراجیہ ص۲۳) جب نماز جنازہ سے فارغ ہو جائے تو دعا کیلئے نہ ٹھہرے۔

امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردری الحنفیؒ (المتوفّٰی ۸۲۷ھ) فرماتے ہیں کہ:

لا یقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ دعا مرۃ۔ (فتاوی بزازیہ ج ۱ ص۲۸۳)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے نہ ٹھہرے کیونکہ اس نے ایک مرتبہ دعا کر لی ہے (یعنی نماز جنازہ کے اندر)۔

امام شمس الدّین محمد خراسانی کوہستانی الحنفیؒ (المتوفّٰی ۹۲۶ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا یقوم داعیا لہ (جامع الرموز ج ۱ ص۱۲۵)۔ اور میت کے حق میں دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔

اور علامہ فہامہ ابو حنیفہ ثانی ابن نجیم الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یدعوا بعد التسلیم (بحر الرائق ج۲ ص۱۸۳) سلام پھیر لینے کے بعد دعا نہ کرے۔

اور مفتی محمد نصیر الدّین الحنفیؒ (المتوفّٰی ــــ) لکھتے ہیں کہ:

وبعد ایستادہ نماند برائے دعا (فتاوی برہنہ ص۳۶) نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔

اور حضرت ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یدعوا للمیّت بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ یشبہ نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا نہ کرے کیونکہ یہ نماز

الزیادۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ (مرقات ج ۲ ص۲۱۹)　　جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے۔

اور فقہ کی مشہور کتاب مجموعۂ خانی میں ہے :

دعا نخواند وفتویٰ بریں قول است (مجموعۂ خانی قلمی ص۳۴۹)　　یعنی دعا نہ کرے اور فتویٰ اس قول پر ہے۔

اور مفتی سعد اللہ صاحب الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ :

خالی از کراہت نیست زیرا کہ اکثر فقہا بوجہ زیادہ بودن بر امر مسنون منع میکنند (فتاویٰ سعدیہ ص۱۳)　　یعنی یہ کراہت سے خالی نہیں ہے کیونکہ اکثر حضرات فقہاء کرام اس کو امر مسنون پر زائد ہونے کی وجہ سے منع کرتے ہیں۔

مولانا عبد الحی صاحب لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ :

"بعد نماز جنازہ کے دعا کرنا مکروہ ہے"۔ (نفع المفتی والسائل ص۱۶)

اور علامہ برجندی الحنفیؒ نے بھی دعا بعد نمازِ جنازہ کو مکروہ کہا ہے۔ (برجندی حاشیۂ شرح وقایہ)

اِس کے علاوہ بھی متعدّد حضرات فقہاء کرامؒ نے نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنے کو منع کہا ہے مثلاً دیکھئے مُدخل ج ۳ ص۲۲ لابن امیر الحاجؒ، مظاہرِ حق ج ۲ ص۵۷ لنواب قطب الدّین خان صاحبؒ وغیرہ۔

حضرات فقہاء احنافؒ کی یہ عبارتیں بھی ملاحظہ کیجئے اور مولوی محمد عمر صاحب کا یہ فیصلہ بھی دیکھ لیجئے کہ :

"احناف نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگتے ہیں، وہابی بُرا جانتے ہیں، دیوبندی بھی منکر ہیں۔ اب تم فیصلہ کرو کہ دُعا کا انکار کرتے ہو، تم کون ہو؟" (بلفظہٖ مقیاس الحنفیت ص۵۲۹)

یہ فیصلہ مولوی محمد عمر صاحب کو خود کرنا چاہیئے کہ وہ کون ہیں؟ حنفی یا غیر حنفی؟ ذرا مولوی صاحب ہمّت کر کے دو چار حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارتیں تو نقل کر دیں جن سے ان کا مسلک ثابت ہوتا ہے۔ دیدہ باید۔

رہا امام فضلیؒ کے لا بأس بہ سے استدلال کرنا تو بے کار ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ جمہور حضرات فقہاء احناف کے مقابلہ میں ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہو سکتی۔ وثانیاً علامہ شامی (ج۱ ص۸۲) وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ لا بأس بہ میں کراہت تنزیہی پائی جا سکتی ہے، اور لا بأس بہ غیر مستحب پر بھی اطلاق ہوتا ہے (ج ۱ ص۸۸)۔ لہٰذا یہ بھی ان کو سود مند نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

(المتوفی ۱۳۷۲ھ) لکھتے ہیں کہ اور چونکہ لفظ لا بأس اکثر خلافِ اولیٰ میں مستعمل ہوتا ہے، اس لئے ایک صاف اور واضح تطبیق تو امام محمدؒ بن الفضلؒ اور امام ابو بکرؒ بن حامدؒ کے کلام میں یہ ہو سکتی ہے کہ اوّل الذکر مکروہِ تنزیہی اور مؤخر الذکر مکروہ تحریمی فرماتے ہیں۔ اور ظاہر بھی ہے کیونکہ اکثر کتبِ فقہ و فتاویٰ میں اوّل اصل مذہب... یہی بیان کیا ہے کہ دعا نہ کرے یا دعا مکروہ ہے۔ اور کراہتِ مطلقہ سے اکثری طور پر تحریمی ہی مراد ہوتی ہے اور امام محمدؒ بن الفضلؒ سے اس کے خلاف جو قول نقل کیا اس کو لا بأس سے تعبیر کیا جو اصل معنی کے لحاظ سے کراہتِ تنزیہی یا کم از کم خلافِ اولیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔ (دلیل الخیرات فی ترک المنکرات ص۴۹)

مولوی محمد عمر صاحب کا ایک اور کمال ملاحظہ ہو وہ ایک عبارت کے مطلب کو نہ سمجھتے ہوئے یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "جو دُعات رد کے وہ تمام زمانے سے زیادہ احمق ہے"۔ (مقیاس ص۵۳۷)

مولوی محمد عمر صاحب یہ فرمائیں کہ جن حضرات فقہاء احنافؒ کے حوالے ہم نے ذکر کئے ہیں وہ تو تمام اس دُعا سے منع کرتے ہیں، کیا وہ بھی تمام زمانے سے زیادہ احمق ہیں؟ سوچ کر اور ہوش میں آکر جواب دینا۔ قارئین کرام! غور فرمایئے کہ اکابرین علماء احنافؒ جنازہ کے بعد کی دُعا کو مکروہ بھی کہتے ہیں اور اس سے محض اس لئے منع کرتے ہیں کہ یہ امرِ مسنون پر زیادتی ہے۔ اگر خیر القرون میں یہ دُعا ہوتی تو یہ اکابر ہرگز اس کو خلافِ مسنون اور مکروہ کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ آج مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کی بدعت نواز پارٹی اس خلافِ مسنون اور مکروہ کام کو جائز اور مستحب سمجھتے ہیں، اور اس کے اثبات کے درپے ہیں، اور لُطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے کو حنفی کہتے ہوئے حضرات فقہاء احنافؒ کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ:

"و مکروہ را مستحسن دانستن از اعظم جنایات است چہ حرام را مباح دانستن منجر بکفر است و مکروہ را حسن پنداشتن یک مرتبہ ازاں پایاں است شناعت این فعل را نیک ملاحظہ باید نمود"۔ (مکتوبات حصہ پنجم ص۴۷)

مکروہ کو اچھا سمجھنا بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ حرام کو مباح سمجھنا کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے اور مکروہ کو اچھا جاننا اُس سے ایک مرتبہ فروتر ہے۔ اس فعل کی قباحت کو اچھی طرح ملاحظہ کرنا چاہیئے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عبارات پر فریقِ مخالف کی طرف سے جو اعتراضات (یا بزعمِ خود جو جوابات) پیش کئے گئے ہیں، ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

اعتراض : مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "اس اعتراض کے (کہ حضرات فقہاءِ کرامؒ کی عبارات میں دُعا بعد الجنازہ کی ممانعت آئی ہے) دو جواب ہیں - ایک اجمالی دوسرا تفصیلی - اجمالی جواب تو یہ ہے کہ اس دُعا سے ممانعت کی تین وجہیں ہیں - اوّلاً یہ کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہو - دوم یہ کہ دعائیں زیادہ لمبی نہ ہوں جس سے کہ دفن میں بہت زیادہ تاخیر ہو، اسی لئے نمازِ جمعہ کے انتظار میں دفن میں تاخیر کرنا منع ہے - تیسرے یہ کہ اسی طرح صف بستہ بہ ہیئتِ نماز کی جاوے کہ دیکھنے والا سمجھے کہ نماز ہو رہی ہے کہ یہ زیادتی کے مشابہ ہے - لہٰذا اگر بعد سلام بیٹھ کر یا صفیں توڑ کر، تھوڑی دیر دعا کی جاوے تو بلا کراہت جائز ہے - یہ وجوہ اس لئے نکالے گئے ہیں کہ فقہاء کی عبارتیں آپس میں متعارض نہ ہوں اور یہ اقوال احادیثِ مذکورہ اور صحابہ کرامؓ کے قول و عمل کے خلاف نہ ہوں۔ تفصیلی جواب یہ ہے کہ عبارات میں سے جامع الرموز، ذخیرہ، محیط، کشف الغطاء کی عبارتوں میں تو دُعا سے ممانعت ہے ہی نہیں - بلکہ کھڑے ہو کر دُعا کرنے سے منع فرمایا ہے، وہ ہم بھی منع کرتے ہیں مرقات اور جامع الرموز میں یہ بھی ہے لانہ یشبہ الزیادۃ، یہ زیادتی کے مشابہ ہے - یعنی اس دعا سے دھوکا ہوتا ہے کہ نمازِ جنازہ زیادہ ہو گئی الخ (جاء الحق ص ۲۶۸)"

جواب : یہ جملہ اعتراضات یا بزعمِ خود جوابات مفتی احمد یار خان صاحب کی جہالت اور بےخبری کا نتیجہ ہیں اور کئی وجوہ سے یہ قابلِ التفات ہی نہیں ہیں :

اوّلاً اس لئے کہ اگرچہ حضرات فقہاء احنافؒ اور شوافعؒ کا اس میں اختلاف ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے قبل دعا کرنا درست ہے یا نہیں، حضرات احنافؒ اس کے منکر اور حضرات شوافعؒ اس کے قائل ہیں - مگر حضرات فقہاءِ کرامؒ کی وہ عبارتیں جو ہم نے پیش کی ہیں (بلکہ وہ عبارتیں بھی جو مفتی احمد یار خان صاحب نے پیش کی ہیں بجز ایک عبارت کے) اُن کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام سے پہلے کے متعلق حضرات فقہاءِ کرامؒ یہ فرما رہے ہیں - وہ تو اس امر کی صراحت کرتے

ہیں کہ نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد دُعا نہ مانگی جائے۔ بعد صلوٰۃ الجنازۃ - اذا فرغ من الصلوٰۃ کی قید لگاتے ہیں۔ اس سے بھلا سلام سے قبل کی دُعا کیسے مُراد ہو سکتی ہے؟ اور بحرالرائق کی یہ عبارت تھی لا یدعوا بعد التسلیم، سلام پھیرنے کے بعد دُعا نہ کی جائے۔ الغرض حضرات فقہاء احنافؒ کی ان عبارات کا مطلب یہ بیان کرنا کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے کے متعلق ہیں ان کی خالص تحریف ہے محض کچھ نہ کچھ لکھ دینے کا نام جواب نہیں ہوتا۔

و ثانیاً کسی مستند اور معتبر فقیہ سے یہ ثابت نہیں کہ ممانعت لمبی لمبی دعائیں پڑھنے سے ہے، اور مختصر قسم کی دُعا جائز ہے۔ یہ مفتی صاحب کی خود تراشیدہ منطق ہے۔ حضرات فقہاء کرامؒ تو لا یدعوا وغیرہ جملہ سے بالکل اس کی نفی کرتے ہیں۔ جملہ فعلیہ نکرہ کے معنی میں ہوتا ہے اور نکرہ جب سیاق نفی میں آئے تو اس سے عموم ہی مراد ہوتی ہے، اِلّا یہ کہ کوئی مخصص دلیل ہو اور یہاں کوئی مخصص دلیل موجود نہیں ہے۔ محض اختراعات سے تخصیص ہرگز نہیں ہو سکتی۔

و ثالثاً مفتی صاحب اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ لا یقوم بالدعاء کا یہ معنی ہے کہ صف بستہ کھڑے ہو کر دُعا نہ کی جائے تاکہ دیکھنے والوں کو نماز کا شبہ نہ ہو، بلکہ صفوں کو توڑ کر اور بیٹھ کر دُعا کی جائے جو جائز ہے۔ مگر اس پر غور نہیں کیا کہ یہاں صرف یقوم ہی نہیں بلکہ یقوم بالدّعاء ہے۔ معنی یہ ہے کہ نماز جنازہ کے بعد وہ دُعا کو قائم نہ کرے اور دُعا کے لئے نہ ٹھہرے یا بالفاظ دیگر دعا نہ مانگے۔ مفتی صاحب لغت کی کتابوں میں قام بامرٍ کذا کے معنی دیکھ لیں کہ کیا ہوتے ہیں انکو سمجھ آجائے گی۔ خود انکے اعلیٰ حضرت نے بذل الجوائز صنا میں قیام کا معنی ٹھہرنا بھی کیا ہے۔ تعجب ہے کہ بعض دیوبندی حضرات کو بھی یہاں مغالطہ ہوا ہے اور بعض نے اس سلسلہ میں راقم سے خط و کتابت بھی کی ہے انکی تسلی کے لیے ہم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کا حوالہ درج کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ" بعض فقہاء نے فرمایا کہ کھڑا رہ کر دُعا نہ کرے چونکہ نماز جنازہ کے بعد اسی حالت پر کھڑا رہنا اور دُعا کرنا خاص طور سے اجتماع و اہتمام کو ثابت کرتا ہے اس لئے اس طرح تعبیر فرما دیا مطلب وہ ہی ہے کہ اجتماع و اہتمام سے دُعا نہ کرے یعنی اگر کوئی ایک شخص نماز جنازے کے بعد اتفاقی طور پر اپنی جگہ کھڑا رہا اور اُس نے کوئی دعا اپنے دل میں میّت کیلئے مانگ

لی - تو اگرچہ اُس نے کھڑے رہ کر یہ دُعا کی ہے مگر مکروہ نہیں ہوگی کیونکہ کراہت کی اصلی علّت (اجتماع و اہتمام) موجود نہیں - اور نفسِ قیام علّتِ کراہت نہیں - انتہٰی بلفظہٖ (دلیل الخیرات ص۵۱ و ص۵۲) اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ کراہت کی علّت اجتماع و اہتمام ہے - اس لئے اگر صفیں توڑ کر یا بیٹھ کر اجتماعی صورت میں دُعا کی جائے تب بھی مکروہ اور ممنوع ہے -

ورابعًا اگر بالفرض لا یقوم بالدّعاء کا یہ مطلب لے لیا جائے کہ کھڑے ہو کر دُعا نہ کی جائے تو بحر الرائق کی اس عبارت کا کیا مطلب ہوگا کہ لا یدعوا بعد التّسلیم (کہ سلام کے بعد دُعا نہ کرے) اس میں تو لا یقوم کا ذکر ہی نہیں - اور مجموعہ خانی کے یہ لفظ تھے " و دعا نخواند و فتوٰی بریں قول است "۔ ان میں تو مطلقاً دُعا کی نفی کی گئی ہے عام اس سے کہ کھڑے ہو کر کی جائے یا بیٹھ کر صف بستہ ہو یا صف توڑ کر - الغرض مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ ارشاد کہ دُعا سے ممانعت ہے ہی نہیں بلکہ کھڑے ہو کر دُعا سے منع فرمایا، سراسر باطل اور مردود ہے -

وخامسًا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ہم نے یہ وجوہ اس لئے نکالے ہیں کہ فقہاء کرامؒ کی عبارتیں آپس میں متعارض نہ ہوں اور یہ احادیث مذکورہ اور صحابہ کرامؓ کے قول و عمل کے مخالف نہ ہوں، ایک خیالی اور ہوائی قلعہ ہے جس میں مفتی صاحب پناہ گزیں ہیں - حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارتیں آپس میں جب متعارض ہی نہیں تو پھر بلا وجہ یہ وجوہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے ؟ اور جب کسی صحیح حدیث سے اور کسی صحابی کے قول و عمل سے جنازہ کے بعد دُعا کا ثبوت ہی نہیں تو ان کی مخالفت کا کیا مطلب؟ یہاں تو مخالفت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا -

وسادسًا مفتی صاحب یہاں تو لکھتے ہیں کہ کھڑے ہو کر دُعا کرنے سے ہم بھی منع کرتے ہیں مگر ص۲۶۳ میں حضرت ابن اوفیٰ رضؓ کی روایت یوں نقل کرتے ہیں کہ :

" کھڑے ہو کر دعا کی اور فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السّلام کو ایسے ہی کرتے ہوئے دیکھا "

جب حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے کھڑے ہو کر دُعا کی ہے تو مفتی صاحب کو اس سے منع کرنے کا حق کس نے دیا ہے ؟ یہ یاد رہے کہ مفتی صاحب اصل بات ہی نہیں سمجھے حضرت عبد اللہ بن

ابی اوفیؓ کی روایت سے، باوجود ضعیف ہونے کے کیونکہ اس کی سند میں ابراہیم ہجری نہایت ضعیف اور کمزور راوی ہے، جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے قبل انہوں نے دعا مانگی، جس پر حضرات شوافعؒ کا عمل ہے۔ امام بیہقیؒ نے باب قائم کرکے یہ ثابت کیا ہے (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۲) اور ان کی یہ روایت مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۶ میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں جو بحث ہے وہ یہ ہے، کہ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد قبل از دفن دعا مکروہ نہیں ہے اور مفتی صاحب اس کے اثبات سے قاصر ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی بدحواسی مفتی صاحب نے جاء الحق ص ۲۶۷ میں جامع الرموز کا تین مرتبہ حوالہ دیا ہے۔ ان کے قائم کردہ نمبروں کے لحاظ سے ع۱ و ع۶ و ع۷، حالانکہ ع۱ کی عبارت تو جامع الرموز ج ۱ ص ۱۲۵ کی ہے اور ع۶ و ع۷ کی عبارت ہی جامع الرموز کی نہیں ہے۔ خدا جانے انہوں نے کس رسالہ یا اخبار سے بدحواسی میں یہ نقل کر دیا ہے۔ کیا خوب تحقیق ہے۔ ٹائیٹل پر انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی اس کتاب میں ـــ "عام مختلف فیہ مسائل کا نہایت محققانہ مدلل فیصلہ کر دیا گیا ہے" ـــ سبحان اللہ تعالیٰ، یہ ہیں مفتی صاحب کی تحقیق انیق کے چند نمونے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کے دعا بعد الجنازہ کے اثبات کے دلائل اور ان کے جوابات

مفتی صاحب لکھتے ہیں: مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الجنازہ فصل ثانی میں ہے اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا لہ الدعاء (جب تم میت پر نماز پڑھ لو تو اس کے لئے خالص دعا مانگو) فَ سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے بعد فوراً دعا کی جاوے بلا تاخیر۔ جو لوگ اس کے معنی کرتے ہیں کہ نماز میں اس کے لئے دعا مانگو وہ فَ کے معنی سے غفلت کرتے ہیں۔ صلیتم شرط ہے ماضی اور فاخلصوا ہے جزاء، شرط اور جزا میں تغایر چاہیئے نہ یہ کہ اس میں داخل ہو۔ پھر صلیتم ہے ماضی اور فاخلصوا ہے امر۔ جس سے معلوم ہوا کہ دعا کا حکم نماز پڑھ چکنے کے بعد ہے جیسے فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا میں کھا کر جانے کا حکم ہے نہ کہ کھانے کے درمیان، اور اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ میں نماز کے لئے اٹھنا مراد ہے نہ کہ نماز کا قیام جیسا کہ اِلٰی سے معلوم ہوا، لہٰذا یہاں بھی وضو ارادہ نماز کے بعد ہی ہوا، اور فَ سے تاخیر ہی معلوم ہوئی حقیقی معنی

کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں۔ (جاء الحق ص۲۶۲)

جواب : مفتی صاحب نے حدیث کا جو یہ معنی کیا ہے کہ جب تم میت پر نماز پڑھ لو تو اس کے لئے خالص دعا مانگو، خرابی ہی سب اس میں ہے ع سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جا است۔

اولاً اس لئے کہ یہ معنی اس حدیث کے روح کے خلاف ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ میت پر جب تم نمازِ جنازہ پڑھو تو اس میں نہایت اخلاص سے دعا کرو۔ یہ مطلب تو نہیں کہ نمازِ جنازہ تو بغیر اخلاص کے پڑھ لو اور اس کے بعد اخلاص سے دعا کرو۔ علاوہ ازیں المدونۃ الکبریٰ ص۱۷۴ ج۱ میں ہے: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: قال فی الصلوٰۃ علی المیّت اخلصوہ بالدعاء۔ اس میں صراحت ہے کہ اخلاص فی الدعا نماز کے اندر مطلوب ہے۔ ثانیاً: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ اخلاص نمازِ جنازہ کے اندر ہی ہونا چاہیئے۔ آپ ایسے پُرخلوص دل اور رقّت آمیز الفاظ سے جنازہ کی نماز پڑھایا کرتے تھے کہ زندہ صحابی یہ آرزو کیا کرتے تھے کہ کاش یہ جنازہ ہمارا ہوتا۔ دیکھئے حضرت عوف رضی اللہ عنہ بن مالک (وغیرہ) کی روایت مسلم ص۳۱۱ ج۱ اور مشکوٰۃ ص۱۴۵ ج۱ وغیرہ میں ہے اور سنن الکبریٰ ص۳۹ ج۴ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے نمازِ جنازہ کا طریقہ بتایا جس میں یہ بھی فرمایا کہ درود شریف پڑھنے کے بعد اخلاص کے ساتھ میت کے لیئے دعا کرے۔ (ثمّ یسلم سرًّا فی نفسہٖ) پھر آہستہ دل میں سلام کہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ یہ اخلاص فی الدّعا سلام پھیرنے سے پہلے ہے۔

ثالثاً اگر اس روایت کا یہی معنی ہوتا جو مفتی صاحب نے کیا ہے تو جنازہ کے بعد کی دعا کو حضرات فقہاء کرام اور خصوصاً فقہاء احناف خلافِ مسنون اور مکروہ کیوں کہتے ہیں؟ کیا حضرات فقہاء کرام سے یہ جسارت ہو سکتی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے فعل اور قول کو بھی خلافِ سنّت اور مکروہ کہہ دیں؟

و رابعاً باوجودیکہ یہ حدیث حضرات فقہاء کرام کے پیش نظر ہے، مگر وہ پھر بھی جنازہ کے بعد دعا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر اس حدیث کا وہی مطلب ہوتا جو مفتی صاحب اور ان کی بدعت پسند پارٹی نے گھڑا ہے تو حضرات فقہاء کرام کیوں "لا یدعوا" اور "دعا نخواند" سے اس کو منع کرتے۔ وہی حضرت ملا علی القاریؒ (وغیرہ) جب اس حدیث کی شرح کرتے ہیں تو ان کو مفتی صاحب کا یہ معنی سمجھ نہیں آتا،

اور جب اُس کے صرف ایک صفحہ بعد حضرت مالکؓ بن ہبیرہ کی حدیث کی شرح کرتے ہیں تو صاف لکھتے ہیں کہ "جنازہ کی نماز کے بعد میّت کے لئے دُعا نہ مانگے کیونکہ یہ نمازِ جنازہ کے اندر زیادت کے مشابہ ہے" (مرقات ج ۲ ص۲۱۹) الغرض کوئی اندرونی اور بیرونی قرینہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت اس حدیث کا وہ مطلب صحیح ہو جو مفتی صاحب نے کیا ہے۔

رہا مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ شرط اور جزا میں تغایر ہونا چاہیئے تو یہ مسلّم ہے مگر یہ تغایر کبھی ذات اور ذات کا ہوتا ہے جیسے فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا میں کھانا الگ ایک حقیقت ہے اور انتشار الگ اور کبھی یہ تغایر جزو وکُل کا ہوتا ہے جیسے وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مطلق قرآن کا پڑھنا کُل ہے اور صرف اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کا پڑھنا جزو ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الخ قرآن کریم کے بالکل مغایر ہے۔ اسی طرح کبھی یہ تغایر اطلاق وتقیید کا ہوتا ہے جیسے إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ میں جملہ شرطیہ کے اندر جو سوال ہے وہ مطلق ہے۔ اور جملہ جزائیہ میں جو سوال ہے وہ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ کے ساتھ مقیّد ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جملہ شرطیہ میں جو سوال ہے وہ اُس سوال کے بالکل متغایر ہے جو جملہ جزائیہ میں ہے جیسا کہ کسی بھی اہلِ علم پر یہ مخفی نہیں ہے، اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ مطلق نمازِ جنازہ (جس میں ثناء اور درود شریف وغیرہ کا پڑھنا اور باوضو ہو کر قبلہ رُخ ہو کر قیام کرنا وغیرہ سبھی کچھ ہے) کُل ہے اور میّت کے لئے دعا جزو ہے اور شرط وجزا کے لئے اتنا تغایر کافی ہے۔ اور اگر مفتی صاحب إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ (الآية) اور إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ (الآية) اور إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ (الآية) وغیرہ میں ارادہ وغیرہ مقدر تسلیم کرتے ہیں تو وہ فرمائیں کہ اذا صلّیتم علی المیّت (الحدیث) میں اس ارادہ کے نکالنے سے کیا چیز مانع ہے؟ وجہ فرق بیّن ہونی چاہیئے۔ الغرض یہ مفتی صاحب کی صواب دید پر موقوف ہے کہ اگر وہ ان آیات میں کوئی مقدر نکالتے ہیں تو حدیث میں بھی تسلیم کرلیں یا جزو وکُل وغیرہ کا تغایر مانتے ہیں تو وہ مان لیں۔ یہ اُن کی مرضی ہے۔ باقی حرف إِلَى نماز کے قیام کے لئے بھی آیا ہے سینکڑوں حدیثیں اس پر پیش کی جاسکتی ہیں مگر بخوفِ طوالت ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ فَ سے تاخیر ہی معلوم ہوتی،

حقیقی معنی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں، تو اُن کا یہ کہنا اُصول سے بے خبری پر مبنی ہے۔

اوّلاً اس لئے کہ جیسے تاخیر و تعقیب زمانی ہوتی ہے ایسے ہی مرتبی بھی ہوتی ہے، اور جزا کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ زمانہ کے لحاظ سے شرط سے متاخر ہو، بلکہ بسا اوقات جزا۔ شرط کیلئے علّت ہوتی ہے اور علّت کا معلول پر مقدّم ہونا ایک بیّن امر ہے۔ علماءِ اصول نے اس کی تصریح کی ہے کہ :

اذا الجزاء قد تکون علّۃ للشّرط کان وجد النّھار فالشّمس طالعۃ۔ کبھی جزاء شرط کے لئے علّت ہوتی ہے جیسے کہ یہ مثال (اِنْ وجد النّھار فالشّمس طالعۃ) کہ اگر دن موجود ہے تو اس لئے کہ سُورج نکل چکا ہے۔ (شرح تلویح ص۲۴۱)

ثانیاً اس لئے کہ میّت کے لئے نمازِ جنازہ میں جو دُعا کی جاتی ہے تو وہ ثناء اور دُرود شریف کے بعد کی جاتی ہے اور اس میں جملہ جزائیہ کی جملہ شرطیہ سے زمانی تاخیر بھی متحقّق ہے۔ اور علماء نے تصریح کی ہے :۔

التراخی بزمان و ان قلّ (حاشیہ تلویح ص۲۴۱) کہ تراخی بہت قلیل زمانہ سے بھی متحقق ہو جاتی ہے۔

ثالثاً اس میں حقیقی معنی کسی نے ترک ہی نہیں کیا تاکہ ان پر یہ الزام صحیح ہو کہ بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں۔ علاوہ بریں اگر مفتی صاحب وغیرہ کے پاس ارادہ وغیرہ نکالنے کے لئے کوئی قرینہ اور منطق موجود ہے تو شاید کسی اور کے پاس بھی کوئی ایسا ہی حربہ موجود ہو کیونکہ ؎

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سُنو

رابعاً کیا مفتی صاحب لوگوں کو یہ فتویٰ دیا کرتے ہیں کہ وہ قرآن مجید پڑھ لینے کے بعد اَعُوْذُ باللہ الخ پڑھا کریں۔ اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ (الآیۃ) میں بھی فَ ہے جس سے بقول مفتی صاحب تاخیر ہی معلوم ہوئی۔ پھر حقیقی معنی کیوں چھوڑا جائے؟ اسی طرح اور بہت سی آیات میں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ غرضیکہ کوئی صحیح عقلی اور نقلی دلیل ایسی موجود نہیں ہے جس سے اذا صلّیتم علی المیّت (الحدیث) سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا ہونی چاہیئے اور اس سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔

فریق مخالف کا استدلال اور اس کا حشر | مفتی احمد یار خان صاحب منتخب کنز العمال کے

حوالہ سے اور مولوی محمد عمر صاحب بیہقی اور فتح ربانی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفیؓ نے اپنی لڑکی کا جنازہ پڑھا اور چوتھی تکبیر کے بعد دعا کی، اور فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے (جاء الحق ص۲۶۳ اور مقیاس حنفیت ط۵۲۶ محصلہ)

الجواب : اس روایت سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ اس کی سند میں ابراہیم ہجری واقع ہے (دیکھئے جاء الحق وغیرہ) اور حضرات محدثین کرامؒ اس کی روایت کو نہایت ہی ضعیف سمجھتے ہیں۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں۔ اس کی حدیث محض ہیچ ہے۔ امام ابوزرعہؒ کہتے ہیں، وہ ضعیف ہے۔ امام ابوحاتمؒ اس کو ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور امام نسائیؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں حدیث میں ضعیف ہے۔ امام ابواحمد الحاکمؒ کہتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک وہ حدیث میں ضعیف ہے۔ علامہ ابن عدیؒ کہتے ہیں، اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن سعدؒ، امام سعدیؒ اور امام حربیؒ وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب ج ۱ ص۱۶۵) لہٰذا یہ روایت سرے سے قابلِ التفات ہی نہیں ہے۔

وثانیاً یہ دعا نمازِ جنازہ کے ختم ہونے کے بعد کی دعا نہیں ہے، جیسا کہ مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے لکھا ہے کہ ـــــ پھر نمازِ جنازہ ختم کرنے کے بعد آپ وہیں کھڑے رہے، اندازہ دو تکبیروں کے مابین کا دعا فرماتے رہے (مقیاس ص۵۲۶) بلکہ یہ دعا چوتھی تکبیر اور سلام پھیرنے کے درمیان کی دعا ہے جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا بھی کیا تھا اور حضرات شوافعؒ کا اس پر عمل ہے۔ اور حضرات احنافؒ چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام سے قبل دعا کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ :

وفی روایة کبر اربعا فمکث ساعة حتّٰی ظننت انه سیکبر خمسا ثم سلم عن یمینه وعن شماله الخ	ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفی نے چار تکبیریں کہیں اور ایک ساعت ٹھہرے رہے، حتّٰی کہ ہم نے یہ خیال کیا کہ وہ پانچویں تکبیر بھی کہیں گے،
(ریاض الصالحین ص۳۶۹ وکتاب الاذکار ص۱۲۵)	مگر پھر انہوں نے دائیں اور بائیں سلام پھیر دیا۔

حضرت امام بیہقیؒ اس روایت پر یوں باب قائم کرتے ہیں کہ:

باب ماروی فی الاستغفار للمیّت والدعاء له ما بین التکبیرۃ الرّابعۃ والسّلام (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۲) — وہ باب جس میں اس کا ذکر ہوگا کہ میت کے لئے چوتھی تکبیر اور سلام کے درمیان دعا اور استغفار کرنا چاہیئے۔

اس روایت سے نمازِ جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے بعد کی دُعا ثابت کرنا جہالت یا خیانت ہے۔ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ بیہقی میں ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک جنازے پر نماز کے بعد دُعا مانگی (جاء الحق ص ۲۶۳)۔ مگر یہ بھی مفتی صاحب کی کوتاہ فہمی کا ایک کرشمہ ہے ورنہ بیہقیؒ کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک جنازہ پڑھایا اور چند حضرات نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

فقالوا یا امیر المؤمنین لم نشهد الصّلوٰۃ علیه فصلی بهم فکان امامهم قرظۃؓ بن کعب۔ (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۵) — انہوں نے کہا، اے امیر المؤمنینؓ! ہم اس کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکے تو اُنہوں نے ان کے ساتھ نماز ادا کی۔ ان کے امام قرظہؓ بن کعب تھے۔

اور دوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ:

فجاء قرظۃؓ بن کعب و اصحابه بعد الدفن فامرهم ان یصلوا علیه (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۵) — قرظہؓ بن کعب اور اُن کے ساتھی دفن کے بعد آئے اور اُنہوں نے ان کو صلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا۔

اس روایت سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ دوبارہ جنازہ پڑھنا یا دفن کے بعد جنازہ پڑھنا ہے۔ اس مقام پر اس کا جھگڑا نہیں ہے۔ اس روایت سے دُعا بعد الجنازہ کا اثبات بالکل بے بنیاد امر ہے اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کا (غائبانہ) جنازہ پڑھا اور پھر دُعا کی (محصلہ جاء الحق ص ۲۶۲) بالکل بے اصل اور بے حقیقت بات ہے۔ حضرت اصحمہ نجاشیؓ کے بغیر غائبانہ جنازہ پڑھنا سرے سے ثابت ہی نہیں۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو کسی صحیح اور متّصل سند کے ساتھ پیش کر دے۔ دیدہ باید۔ جب اصل نماز جنازہ ہی ثابت نہیں تو دُعا بعد الجنازہ کا کیا مطلب؟ اسی طرح مبسوط کے حوالہ سے حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن سلامؓ سے یہ ثابت کرنا کہ ان حضرات نے دعا بعد نماز جنازہ

کی قلّتِ فہم یا عدمِ تدبّر کا حیرت ناک مظاہرہ ہے (دیکھئے مبسوط ص ۶۷ ج ۲ وغیرہ)۔ رہا یہ قصّہ کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن سلام ایک جنازہ پر نماز کے بعد پہنچے اور فرمایا کہ:

ان سبقتمونی بالصّلوٰۃ علیہ فلا تسبقونی بالدّعاءِ۔ (مبسوط جلد ۲ ص ۶۷)

(ترجمہ مفتی احمد یار خان صاحب کا ہے) اگر تم نے مجھ سے پہلے نماز پڑھ لی تو دعا میں مجھ سے آگے نہ بڑھو۔ یعنی آؤ میرے ساتھ مِل کر دُعا کر لو۔

تو اس سے استدلال بھی باطل ہے اس لئے کہ اس میں کوئی جملہ ایسا نہیں، جس کا یہ ترجمہ ہو کہ آؤ میرے ساتھ مل کر دُعا کر لو۔ یہ مفتی صاحب کی ذاتی اور خانہ زاد اختراع ہے جو ہرگز قابلِ التفات نہیں ہے۔ یہ دُعا کب ہوئی ؟ دفن سے قبل یا بعد ؟ قبرستان میں یا مسجد یا گھر میں ؟ اس روایت میں اس کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ پھر اس کی بھی کوئی تعیین نہیں ہے کہ اس میں سبقتِ زمانی ہے یا کیفی اور کمی ؟ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ میں نمازِ جنازہ میں شریک نہیں ہو سکا مگر میں کثرت سے ایسی پُر از اخلاص دُعا کرونگا کہ اس کی تلافی ہو جائے گی اور اس میں تم مجھ سے ہرگز سبقت نہیں لے جا سکتے۔

نوٹ: دفن کے بعد قبر کے سرہانے اور اس کی پائنتی میں سورۃ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصّہ پڑھنا جائز ہے، اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح تسبیح و تہلیل اور تثبت وغیرہ کی دُعا احادیث سے ثابت ہے۔ یہ چیز محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے۔ اسی طرح مطلق دعا بھی منع نہیں، جب کسی کا جی چاہے کرے۔ ہاں البتہ نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دُعا درست نہیں ہے، جیسا کہ باحوالہ عرض کیا گیا ہے۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب کشف الغطا کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ "قائم نشود بعد از نماز برائے دُعا" (جاء الحق ص ۲۶۷)۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا اس پر بزعمِ خود عقلی دلائل پیش کرنا، تو بیکار ہے اولاً[۱] اس لئے کہ دین کا ہر معاملہ عقل سے ثابت نہیں ہوتا۔ ابوداؤد ج ۱ ص ۲۲ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مسح والی روایت ملاحظہ کیجئے۔ وثانیاً[۲] عقل سے بھی ہر عقل مراد نہیں ہوتی۔ ہماری عقل کیا اور ہم کیا ؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ وثالثاً[۳] الدّعاء مخ العبادۃ وغیرہ روایات سے دُعا بعد الجنازہ ثابت کرنا، اپنی رائے کو شریعت میں دخل دینا ہے۔ گذر چکا ہے کہ امورِ عامہ سے احکامِ خاصہ

کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ ودابعًا اگر واقعی ان روایات سے یہ دُعا ثابت ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ وغیرہم سے اس کا ثبوت ہوتا، اور حضرات فقہاء احنافؒ اس کو مکروہ نہ کہتے۔

جنازہ کے ساتھ ساتھ ذکر کرنا اور قرآن کریم وغیرہ پڑھنا | حدیث شریف اور فقہ حنفی کے پیش نظر اس کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی کہ جنازہ کے ساتھ اجتماعی طور پر ذکر کیا جائے اور خاص طور پر جہر کے ساتھ۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ بحوالہ طبرانی حضرت زید بن ارقمؓ (المتوفی ۶۶ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

ان اللّٰہ یحب الصمت عند ثلاث عند تلاوۃ القران وعند الزحف، وعند الجنازۃ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۹)

اللہ تعالیٰ تین موقعوں پر خاموشی کو پسند کرتا ہے قرآن کریم کی تلاوت کے وقت، میدانِ جنگ میں اور جنازہ کے ساتھ۔

حضرت امام محمدؒ اور علامہ ابن نجیمؒ، حضرت قیسؓ بن عُبادؒ (المتوفی سنہ ھ) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ:

قال کان اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یکرھون الصوت عند ثلاث الجنائز[1]، والقتال[2] والذکر[3]۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہ کرامؓ تین مواقع پر آواز بلند کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ جنازہ[1] کے ساتھ، لڑائی[2] میں اور ذکر[3] کے وقت۔

(السیر الکبیر للامام محمدؒ مع شرح السرخسی ج ۱ ص ۸۹ وبحر الرائق ج ۵ ص ۷۶ وراجع مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱۰ ص ۵۳۰ و ج ۱۲ ص ۴۶۲)

بلکہ حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود تین مقامات پر آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ قراءۃ[1] قرآن، جنازہ[2] اور لڑائی[3] کے وقت۔ (السیر الکبیر ج ۱ ص ۸۹)

یہ روایتیں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنے کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ مکروہ سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی اس وقت خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احنافؒ نے یہ مسئلہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے

کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن کریم پڑھنا اور اسی طرح کل حیّ یموت (کہ ہر زندہ مرنے والا ہے) وغیرہ پڑھنا مکروہ اور بدعت ہے، اور کراہت بھی اس میں تنزیہی نہیں بلکہ تحریمی ہے چنانچہ عالمگیری میں ہے:

وعلی متبعی الجنازۃ الصمت ویکرہ لھم رفع الصوت بالذکر وقرأۃ القرآن۔ (کذا فی شرح الطحاوی وعالمگیری مصری ج ۱ ص۱۶۲)

کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جانے والے ہوں ان پر لازم ہے کہ وہ خاموش رہیں اور ان کے لئے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔

امام سراج الدین اودیؒ لکھتے ہیں:

رفع الصوت بالذکر وقرأۃ القرآن وقولھم کل حیّ یموت ونحو ذٰلک خلف الجنازۃ بدعۃ (سراجیہ ص۲۳ طبع نول کشور)

کہ جنازہ کے پیچھے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن کریم پڑھنا اور یہ کہنا کہ ہر زندہ مرے گا، بدعت ہے۔

اور اسی کے قریب قریب عبارت ہے درمختار کی (دیکھئے کتاب الجنائز)

اور علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں کہ:

وینبغی لمن تبع الجنازۃ ان یطیل الصمت ویکرہ رفع الصوت بالذکر وقرأۃ القرآن وغیرھما فی الجنازۃ والکراھۃ فیھا کراھۃ تحریم۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۹ مصری)

اور مناسب ہے کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جائیں وہ طویل خاموشی اختیار کریں اور بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن کریم پڑھنا، اور اسی طرح کچھ اور پڑھنا مکروہ ہے، اور کراہت بھی اس میں تحریمی ہے۔

یہ تمام عبارتیں ذمہ دار حضرات فقہاء احناف کی ہیں جو اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہیں کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن کریم پڑھنا، کل حیّ یموت پڑھنا اور اسی طرح کچھ اور پڑھنا بدعت اور مکروہِ تحریمی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی سینہ زوری ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں کہ "بعض فقہاء نے میت کے ساتھ ذکر بالجہر کو مکروہ فرمایا، اُن کی مراد مکروہ تنزیہی ہے"۔ (جاء الحق ص۳۹۱)

ہاں اگر کوئی شخص اپنے دل میں آہستہ ذکر کرے تو اس کیلئے گنجائش ہے چنانچہ امام قاضی خان لکھتے ہیں:

ویکرہ رفع الصّوت بالذکر فان اراد ان یذکر الله یذکر فی نفسہ۔ | اور مکروہ ہے کہ (جنازہ کے ساتھ) بلند آواز سے ذکر کیا جائے۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے دل میں ذکر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ آہستہ دل میں ذکر کر سکتا ہے۔

(قاضی خان ج ۱ ص ۹۱ طبع نولکشور)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات فقہاء احنافؒ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنے کو مکروہ (تحریمی) اور بدعت کہتے ہوئے اس سے منع کرتے ہیں۔ مگر مولوی محمد عمر صاحب بزعم خویش کئی آیات سے یہ ثابت کرتے ہیں اور پھر یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں:

"جنازہ کے ساتھ کلمہ طیّبہ پڑھنا" اور پھر جامع الصغیر سیوطیؒ، کنوز الحقائق مناویؒ، اور کنز العمال سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ جنازہ میں زیادہ پڑھا کرو ـــ اور دوسری روایت یوں نقل کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے موتی کے لئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا سامان تیار کرو ـــ تو ان مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوا کہ جنازہ کے ساتھ کلمے کا ذکر ثواب ہے اور میّت کو مفید ہے۔ اور اس زمانہ میں ذکر جہری بالمیّت کرنا اہل سنّت کیلئے ضروری ہے کیونکہ مسلمانوں کو وہابی اور حنفی کے جنازے کا علم ہو جائے۔ (مقیاس الحنفیت ص ۵۸۴)

سبحان اللہ تعالیٰ! یہ ہیں مولوی محمد عمر صاحب کے جنازہ کے ساتھ ساتھ ذکر کرنے کے اثبات کے دلائل، کہ قرآن کریم میں جہاں بھی ذکر کا تذکرہ اور اس کی فضیلت آئی ہے اس سے جنازہ کے ساتھ ذکر کرنا بھی ثابت ہو گیا۔

پہلے یہ با حوالہ درج کر دیا گیا ہے کہ احکامِ عامہ سے امورِ خاصہ کا اثبات درست نہیں ہوتا۔ یہی قرآن کریم کی آیات جن سے مولوی محمد عمر صاحب کے نزدیک جنازہ کے ساتھ ساتھ کلمہ طیّبہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے، حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات فقہاء احنافؒ کے سامنے بھی تھیں مگر ان کو یہ مبارک اجتہاد نہ سُوجھا۔ یہ مولوی محمد عمر صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو قرآن کی ایک آیت ہی سے نہیں بلکہ کئی آیات سے یہ مسئلہ معلوم ہو گیا۔ باقی جو حدیث پیش کی ہے اس سے استدلال بھی ناکافی ہے اسلئے

کہ جھگڑا اس میں ہے کہ جو آدمی خلف الجنازہ یا متبعی الجنازہ (کہ جنازہ کے پیچھے جا رہے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں) کی فہرست میں شامل ہو، اس کے لئے جہر سے ذکر کرنا یا قرآن کریم وغیرہ پڑھنا کیسا ہے؟ ہم نے حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارتیں بتلائی ہیں، وہ اپنے مفہوم میں نص صریح ہیں اور مولوی محمد عمر صاحب کی پیش کردہ یہ روایتیں خلف الجنازہ یا متبعی الجنازہ کے مفہوم کے بیان سے قاصر ہیں۔ ان روایات کا صحیح مطلب یہ ہے کہ وفات کے وقت ان کو لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کی تلقین کرو جیسا کہ سنّت سے ثابت ہے۔ اور مسلمانوں میں تلقین شہادتین کا مسئلہ معمول بہا ہے اور اس کا بھی قوی احتمال ہے کہ جنازہ پڑھتے وقت بطور دعا لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کثرت سے پڑھا کرو کیونکہ یہ افضل الذکر ہے۔ اور فی الجنازہ کے لفظ، جس کا ترجمہ مولوی محمد عمر صاحب نے یہ کیا ہے "جنازہ میں زیادہ پڑھا کرو" اسکے مؤید ہیں۔ مولوی شاہ محمد رکن دین الوری بریلوی لکھتے ہیں: سوال: جو لوگ جنازہ کے ہمراہ ہوں ان کو کلمہ طیبہ راستہ میں پڑھنا کیسا ہے؟ جواب: پکار کر پڑھنا تو مکروہ ہے دل میں اگر پڑھیں تو مضائقہ نہیں۔ بہتر خاموشی ہے۔ (عالمگیری، رکن دین ص۲۰)

مولوی محمد عمر صاحب کی انوکھی دلیل مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ وہابی — فقہاء نے ذکر بالجہر فی الجنازہ مکروہ لکھا ہے (محمد عمر)۔ بحرالرائق ج ۲ ص۲۰۷ میں مذکور ہے کہ ولا بأس بمرثیۃ المیّت شعرًا۔ میّت کا شعروں میں مرثیہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ تم اپنے جنازہ کے ساتھ فقہاء کی اتباع میں مرثیہ خوانی کر لیا کرو، ہم ذکر کلمہ کر لیا کریں گے۔ (مقیاس حنفیت ص۵۸۵)

جواب: مولوی محمد عمر صاحب کا تقریر و تحریر میں یہی وطیرہ ہے کہ وہ خاموش نہیں رہا کرتے۔ ان کے نزدیک کچھ نہ کچھ کہہ دینا یا لکھ دینا ہی جواب تصوّر ہوتا ہے عام اس سے کہ وہ حقیقت اور نفس الامر میں جواب ہو یا نہ ہو۔ صاحب بحرالرائق تو یہ فرماتے ہیں کہ شعروں کے اندر میّت کا مرثیہ پڑھنا جائز ہے یعنی مُردہ کے دنیا سے چلے جانے پر افسوس اور صدمہ کا ذکر اور مُردہ کے کمالات اور خوبیوں کا تذکرہ درست ہے۔ یہ انہوں نے کب اور کہاں کہا ہے کہ جنازہ کے ساتھ ساتھ مرثیہ پڑھا کرو، جھگڑا تو جنازہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا ہے اور یہ حوالہ اس کا ہرگز جواب نہیں ہے۔ یہ ہے مولوی محمد عمر صاحب کا طرزِ استدلال اور اس کا پس منظر۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں۔ ابن عدیؒ نے کامل میں اور امام زیلعیؒ نے نصب الرایہ لتخریج

احادیث الہدایہ جلد دوم ص۲۹۲ مطبوعہ مجلسِ علمی ڈابھیل میں لکھا ہے عن ابن عمرؓ قال لم یکن یُسمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یمشی خلف الجنازۃ الا قول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ مبدیا و راجعا اگر یہ حدیث ضعیف بھی ہو پھر بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ انتہیٰ (جاء الحق ص۳۸۶)

جواب ۱: مفتی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ ضعیف حدیث فضائلِ اعمال میں معتبر ہے۔ اس کی تحقیق اپنے مقام پر آئے گی (ان شاء اللہ تعالیٰ) کہ فضائلِ اعمال میں کیسی ضعیف حدیث معتبر ہوتی ہے؟ لیکن یہ تو ضعیف بھی نہیں۔ اس میں خیر سے ایک راوی ہے جس کا نام ابراہیم بن ابی حمید ہے۔ امام ابو عروبہؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں۔ کان یضع الحدیث (لسان المیزان ج ۱ ص۲۸) کہ وہ جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ موضوع اور جعلی حدیثوں سے بھی مفتی احمد یار خان صاحب فضائلِ اعمال ثابت کرتے ہیں رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا امام شعرانیؒ، شیخ عبد الغنی نابلسی اور شیخ عثمان بحیرمیؒ وغیرہ سے جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کے جواز کے حوالجات نقل کرنا، تو اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ صوفیوں کا گروہ ہے اور حِل و حرمت میں ان کی بات ہر گز حجت نہیں ہوتی (میدانِ فتویٰ میں حضرات فقہاء کرامؒ کی بات معتبر ہوتی ہے نہ کہ حضرات صوفیاءؒ کی) اس کا مختصر جواب مفتی صاحب کی زبانی سن لیجئے، وہ لکھتے ہیں: "ابنِ حجرؒ شافعی ہیں تو احناف کے مقابل شوافع کے فتوے پر عمل ہوگا؟ ہرگز نہیں"۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص۳۲۷ ومثلہٗ فی ص۲۰۲)۔ ہم بھی کہہ دیں گے کہ حضرات احنافؒ کے مقابل حضرت امام شعرانیؒ وغیرہ شوافع کی بات پر ہرگز عمل نہ ہوگا، کیونکہ حضرات فقہاء احنافؒ کی صریح عبارات سے اس کی ممانعت ثابت ہے، جیسا کہ باحوالہ یہ بات بیان کر دی گئی ہے۔

قبر پر اذان

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے بعد میّت کو قبر میں دفن کیا جائے اور بسم اللہ علیٰ سنۃ رسول اللہ وغیرہ پڑھا جائے، اور دفن کے بعد

سورۂ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا بھی احادیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں سورۂ فاتحہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ بن معاذ کی قبر پر سبحان اللہ اور الحمد للہ وغیرہ خود بھی پڑھا اور حضرات صحابۂ کرامؓ کو اس کی تلقین بھی کی۔ اسی طرح استغفار اور تثبیت کا سوال بھی کیا۔ یہ سب اُمور صحیح اور ثابت ہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ قبر پر کھڑے ہو کر آپ نے دُعا بھی کی ہے اور اس کا حکم بھی فرمایا ہے۔ لیکن قبر پر اذان کا ثبوت نہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے اور نہ حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ سے۔ اس وقت قبریں بھی ہوتی تھیں، مُردے دفن بھی کئے جاتے تھے اور اذان بھی تھی اور اذان دینے والے بھی ہوتے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس وقت تو اذان علی القبر سنّت اور جائز نہ ہوئی، اور کئی صدیاں گزرنے کے بعد یہ جائز ہو گئی، اور اس کے جواز پر رسالے بھی لکھے جانے لگے۔

اذان ایک خاص عبادت ہے اور اس کے لئے شریعتِ مقدسہ میں مخصوص مواقع مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سے تجاوز کرنا حدود اللہ سے تعدّی اور معصیت ہے۔ اگر ایسی تمہیں جائز ہوتیں تو عیدین کی نماز کے لئے بھی اذان و اقامت درست ہوتی اور اس کے لئے اذان علی القبر سے بہت زیادہ اور بہت اچھے وجوہ بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارہ میں تمام حضرات فقہاءِ کرامؒ متفق ہیں۔ چنانچہ امام غرناطیؒ لکھتے ہیں:

ومن ذٰلك الاذان والاقامة فی العیدین قد نقل ابن عبد البر اتفاق العلماء علی ان لا اذان ولا اقامة فیها۔ (الاعتصام ج ۲ ص ۱۶)

اور اسی قبیل سے اذان و اقامت عیدین میں امام ابنِ عبد البرؒ نے تمام حضرات فقہاء کا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ عیدین میں نہ اذان ہے نہ اقامت۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاءِ احنافؒ قبر پر خلافِ سنّت اُمور کا سختی کے ساتھ انکار کرتے ہیں چنانچہ امام ابن ہمام الحنفیؒ اپنی بے نظیر تالیف میں لکھتے ہیں کہ:

ویکرہ عند القبر کل ما لم یعہد من السنّة والمعھود منھا لیس الا زیارتھا والدعاء

اور قبر کے پاس ہر وہ چیز مکروہ ہے جو سنّت سے ثابت نہ ہو، اور ثابت من السنّة صرف قبروں کی زیارت ہے اور

عندها قائما کما کان یفعل صلی اللہ علیہ وسلّم فی الخروج الیٰ بقیع و یقول السّلام علیکم دار قوم مؤمنین و انّا ان شاء اللہ بکم لاحقون اسأل اللہ لی ولکم العافیۃ۔ (فتح القدیر ج ۲ ص۲۲ طبع مصر)

انکے پاس کھڑے ہو کر دُعا کرنا جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم جنّت البقیع میں جاکر کیا کرتے تھے اور وہاں فرمایا کرتے تھے سلامتی ہو تم پر اے مومنوں کی بستی میں رہنے والو اور ہم بھی ان شاء اللہ تعالیٰ تم سے ملنے والے ہیں۔ میں اپنے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دُعا کرتا ہوں۔

اور اسی طرح کی عبارت بحر الرّائق ج ۲ ص۱۹۲ اور در المختار ج ا ص۱۶۶ اور فتاویٰ عالمگیری ج ا ص۱۰۷ وغیرہ میں بھی ہے۔ اس سے بھی صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اذانِ قبر بلکہ اس قسم کے وہ جملہ مراسم جو سنّت سے ثابت نہیں، قبر کے پاس مکروہ ہیں۔

علّامہ ابنِ عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

وفی الاقتصار علی ماذکر من الوارد اشارۃ الی انه لا یسنّ الاذان عند ادخال المیّت فی قبرہ کما ھو معتاد الاٰن وقد صرح ابن حجرؒ فی فتاواہ بانه بدعة۔ (شامی ج ا ص۶۵۹)

اور (زیارت اور دعا پر) اقتصار کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ میّت کو دفن کرتے وقت اذان کہنا جیسا کہ آج کل عادت ہو گئی ہے مسنون نہیں ہے اور امام ابنِ حجرؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح کی ہے کہ قبر پر اذان دینا بدعت ہے۔

اور درر البحار میں ہے:

من البدع الّتی شاعت فی الھند الاذان علی القبر بعد الدّفن۔

اُن بدعات میں سے جو (بعض) بلادِ ہند میں شائع ہو گئی ہیں ایک دفن کے بعد قبر پر اذان دینا بھی ہے۔

اور توشیح شرح تنقیح لمحمود البلخیؒ میں اس اذان کے متعلق لکھا ہے:

لیس بشیئ۔

یہ اذان کوئی چیز نہیں۔

یہ تمام عبارتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا شریعتِ مطہرہ میں سرے سے کوئی ثبوت ہی نہیں۔ یہ خلافِ سنّت بھی ہے اور بدعت بھی۔ حضرات فقہاء کرامؒ کے احکام کے خلاف بھی ہے اور لیس بشیئ بھی۔ ایک منصف آدمی کے لئے یہ حوالجات بالکل کافی ہیں۔ البتہ متعنّت کیلئے

کوئی چیز بھی سود مند نہیں ہوتی ۔ فریقِ مخالف کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ بھی سُن لیجئے اور ساتھ ساتھ جوابات بھی دیکھ لیجئے تاکہ حق و باطل میں بخوبی فرق معلوم ہو سکے ۔

پہلا اعتراض : مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں : "(ان عبارات میں جو دُعا کا ذکر کیا گیا ہے) کہ اذان خود دُعا بلکہ بہترین دعا سے ہے کہ وہ ذکرِ الٰہی ہے اور ہر ذکرِ الٰہی دعا ، تو وہ بھی سنّتِ ثابتہ کی ایک فرد ہوئی" (ایذان الاجر ص۸)

جواب : خان صاحب کا یہ ارشاد ایک مجدّدانہ مغالطہ ہے اور کئی وجوہ سے باطل ہے ۔

اوّلاً اس لئے کہ اگرچہ بعض اعتبارات سے ذکر اور دُعا ایک ہی ہے لیکن عرف میں یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔ دُعا میں طلب اور سوال پیدا ہوتا ہے اور ذکر اس سے خالی ہوتا ہے ۔ چنانچہ علّامہ شاطبی لکھتے ہیں :

هو فی العرف غیر الدّعاء (الاعتصام ج ۱ ص۲۸۸) ذکر عُرف میں دُعا کے علاوہ ہے ۔

اور فتح القدیر کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے جنّت البقیع والوں کے لئے جو دُعا کی تھی اس میں عافیت کا سوال تھا اور یہی سنّت سے ثابت ہے ۔

وثانیاً خود خان صاحب اذان کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ تو خالص ذکر بھی نہیں (فتاوی رضویہ ، جلد دوم ص۵۰۲) تو پھر یہ کیسے صحیح ہوا کہ اذان ذکرِ الٰہی ہے اور ہر ذکرِ الٰہی دُعا ہے ؟

وثالثاً اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اذان دُعا ہے تو سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعین وغیرہ کو یہ بات کیوں سمجھ نہ آئی کہ اذان دُعا ہے ، اور قبر پر یہ بھی ہونی چاہئے ۔ جب یہ طریقہ اُن کو سمجھ نہ آسکا اور حضرات ائمہ مجتہدین نے بھی اس کو نہ سمجھا ، تو کسی دوسرے کی سمجھ کیسے حجّت ہو سکتی ہے ؎

سرِّ خدا کہ عارف و زاہد کسے نگفت — در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

دوسرا اعتراض : مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ بحر الرائق کا یہ فرمانا کہ قبر پر جا کر بجز زیارت و دُعا اور کچھ کرنا مکروہ ہے ، بالکل درست ہے ۔ وہ زیارتِ قبور کے وقت فرماتے ہیں یعنی جب

وہاں زیارت کی نیت سے جاوے تو قبر کو چومنا یا سجدہ کرنا وغیرہ ناجائز کام نہ کرے اور یہاں گفتگو ہے دفن کے وقت کی، یہ زیارت کا وقت نہیں۔ اگر وقت دفن بھی اس میں شامل ہے پھر لازم ہوگا کہ میّت کو قبر میں اُتارنا، تختہ دینا، مٹی ڈالنا اور بعد دفن تلقین کرنا، جس کو فتاویٰ رشیدیہ میں بھی جائز کہا ہے، سب منع ہو الخ (جا۔ الحق ص۳۰۳ و ص۳۰۴ بلفظہٖ)

جواب: یہ ہے مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی ثم گجراتی کا جواب۔ مگر بات یہ ہے کہ صاحبِ بحر الرائق وغیرہ نے تو یکرہ عند القبر کہا ہے یکرہ فی القبر نہیں کہا۔ میّت کو قبر میں اُتارنا فی القبر ہے عند القبر نہیں ہے۔ اسی طرح تختہ دینا اور مٹی ڈالنا فی القبر اور علی القبر ہے عند القبر نہیں۔ ہاں البتہ دفن کے بعد تلقین کرنا عند القبر ہے مگر وہ تو والدّعا عندھا قائما کی مد میں ہے جو سنّت سے ثابت ہے۔ اور زیارت و دعا دفن سے قبل خالی قبر کی کوئی نہیں کرتا۔ مگر یہ یاد رہے کہ تلقین سے سورۂ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصّہ پڑھنا مُراد ہے۔ جس کا ثبوت حضرت ابنِ عمرؓ کی مرفوع حدیث سے ہے۔ (مشکوٰۃ ص$\frac{149}{1ج}$) اگر یہ موقوف بھی ہو تب بھی حکماً مرفوع ہے اسلئے البحرالرائق وغیرہ کے الفاظ ہی اس کو متعیّن کر دیتے ہیں کہ دفن کے بعد دُعا اور زیارت کے علاوہ قبر کے پاس اور جو کچھ بھی کیا جائیگا وہ خلافِ سنّت ہوگا، سجدہ ہو یا طواف، استمداد ہو یا اذان وغیرہ، اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں۔

تیسرا اعتراض: (علامہ شامیؒ نے امام ابنِ حجرؒ کے حوالہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ قبر کے پاس اذان بدعت ہے) اوّلاً تو ابنِ حجرؒ شافعی مذہب ہیں۔ بہت سے علماء جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں فرماتے ہیں کہ اذانِ قبر سنّت ہے اور امام ابنِ حجرؒ شافعی اس کی تردید کرتے ہیں تو بتاؤ کہ حنفیوں کو مسئلہ جمہور پر عمل کرنا ہوگا کہ قولِ شافعی پر؟ دوم امام ابنِ حجرؒ نے بھی اذانِ قبر کو منع نہ کیا بلکہ اس کے سُنّت ہونے کا انکار کیا یعنی یہ سنّت نہیں۔ (بلفظہٖ جا۔ الحق ص۳۰۲)

جواب: مفتی صاحب نے یہ جو کچھ لکھا ہے نری دفع الوقتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ ان کا ضمیر بھی ان کو ملامت کرتا ہوگا۔ اوّلاً اس لئے کہ یہی امام ابنِ حجرؒ (اور امام سیوطیؒ) جو شافعی ہیں مگر مسئلہ میلاد وغیرہ مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کی بدعت پسند پارٹی ان ہی سے ثابت کرتی ہے

اور اُس وقت اُن کی شافعیت پیش نظر نہیں ہوتی - وہاں تو ان کی تعریفیں کرتے کرتے قلم کند اور زبانیں خشک ہو جاتی ہیں اور یہاں اس طرح جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے "تو بتاؤ کہ حنفیوں کو مسئلہ جمہور پر عمل کرنا ہوگا کہ قولِ شافعی پر ؟" -

وثانیاً امام ابنِ حجرؒ نے صرف اس کی سنّیت ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کو بدعت بھی کہا ہے - چنانچہ خود مفتی احمد یار خان صاحب بحوالہ شامی یہ حوالہ اس طرح نقل کرتے ہیں (ترجمہ بھی مفتی صاحب کا ہے) -

وقد صرح ابن حجر بانه بدعة وقال من ظن انه سنة فلم یصب - اور ابنِ حجرؒ نے صریح فرمادی کہ یہ بدعت ہے اور جو کوئی اس کو سنّت جانے وہ درست نہیں کہتا (جاء الحق ص ۳۰۲)

اس سے قبل علّامہ شامیؒ کی عبارت یوں ہے کہ :

لا یسن الاذان عند ادخال المیّت فی قبره کما هو المعتاد الآن الخ (شامی ج ۱ ص ۸۳۷) میّت کو قبر میں داخل کرتے وقت جیسا کہ اب عادت بنالی گئی ہے اذان کہنا سنّت نہیں ہے -

امام ابنِ حجرؒ کی تصریح کے بعد کہ یہ بدعت ہے، یہ کہہ دینا کہ انہوں نے منع نہیں کیا کتنی حیرتناک بات ہے مگر مفتی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بدعت کے ذریعہ ہی سے تو ہماری گاڑی چلتی ہے ہم اس کو منع نہیں کہتے -

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح ۔ نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں

وثالثاً درر البحار والے تو حنفی ہیں وہ تو شافعی نہیں - ان کی بات کیوں رد کر دی گئی ہے ؟ اسی طرح امام ابنِ عابدین شامیؒ حنفی ہیں اور امام ابنِ حجرؒ کے اس حوالہ کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں - اس سے کیوں اغماض کیا گیا ہے ؟

ورابعاً وہ کونسے علماء ہیں جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں جو اذانِ قبر کو سنّت کہتے ہیں - ان کا نام اور کتاب کا حوالہ تو تحریر فرمائیے - یہ بات آپ نے صیغۂ راز میں کیوں رکھ چھوڑی ہے تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو جائے کہ ایسے علماء بھی ہیں (جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں) جو اذانِ قبر کو سنّت کہتے ہیں - باقی خان صاحب بریلی وغیرہ بدعت پسند مولویوں کی عبارتوں سے صرف اپنے ماؤف دل کی تسکین تلاش کیجئے - اہل سنّت والجماعت کے لئے ایسے مبتدعین کی بات پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی کیونکہ ان

کی بات صرف آپ کو ہی پسند آسکتی ہے ؎ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

ہمارے اکابر نے تصریح کر دی ہے۔ **الجواب**: قبر پر اذان کہنا خلافِ سنّت اور بدعتِ سیئہ ہے جیسا کہ تصریحاتِ فقہاء سے ثابت ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۵ ص۳۸۲)۔

چوتھا اعتراض: (علامہ محمود بلخیؒ کی توشیح کی عبارت کے جواب میں) مفتی صاحب لکھتے ہیں:

توشیح کا فرمانا لیس بشی ءٍ اس کے معنی یہ نہیں کہ حرام ہے۔ مراد یہ ہے کہ نہ فرض نہ واجب نہ سُنّت محض جائز اور مستحب ہے اور اس کو سنّت یا واجب سمجھنا محض غلط ہے۔ جو فقہاء کہ اس کو بدعت فرماتے ہیں، وہ بدعتِ جائزہ یا کہ بدعتِ مستحبہ فرماتے ہیں نہ کہ بدعتِ مکروہہ۔ کیونکہ بلا دلیل کراہت ثابت نہیں ہوتی۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص۳۰۵)۔

جواب: مفتی صاحب کا یہ جواب بچند وجوہ باطل ہے۔ اَوّلاً اس لئے کہ یہ ان کے اس زعم باطل پر مبنی ہے کہ جواز اور استحباب کے لئے دلیلِ شرعی ضروری نہیں سمجھتے اور علماء کے قول سے بھی اس کو وہ صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ سراسر باطل ہے کیونکہ جواز اور استحباب بھی شرعی احکام ہیں اور ان کے اثبات کے لئے بھی دلیلِ شرعی کی ضرورت ہے۔

وثانیاً مستحب جیسے شرعی حکم کو جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے لیس بشی ءٍ سے تعبیر کرنا اور وہ بھی محض اپنی غرضِ فاسد کے تحت، دین کی سراسر بغاوت ہے اور دُرِّ مختار کے حوالہ سے قیل یُستحب سے اس پر استدلال کرنا اور پھر لفظ قیل کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ضعف کی علامت نہیں، تمام بے بنیاد باتیں ہیں کیونکہ دین کسی اکیلے دوکیلے عالم کی رائے یا اُس کی لغزش کا نام نہیں ہے۔ یہاں جمہور کی نقل معتبر ہوگی یا کم از کم معتبر اور مستند عالم کی بات جو با دلیل ہو۔

وثالثاً وہ کون سے حضرات فقہاء کرام ہیں جو اذان علی القبر کو بدعتِ جائزہ یا بدعتِ مستحبہ فرماتے ہیں؟ شاید وہ مفتی صاحب کے عالمِ خیال، صوبۂ خواہش اور ضلع غرضِ فاسد میں آباد ہوں۔ مفتی صاحب نے ہدایہ کے حاشیہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ لیس بشی ءٍ سے وہ چیز مراد ہوگی جس پر ثواب نہ ملتا ہو اور لیس بشی ءٍ اباحت پر صادق آتا ہے، اور پھر یہ نتیجہ نکالا کہ: معلوم ہوا کہ لیس بشی ءٍ

مباح کو بھی کہا جاتا ہے (ص۳۰۵) تو یہ بھی مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند حضرات کے اس نظریہ پہ مبنی ہے کہ وہ اباحت کو دلیلِ شرعی کا محتاج نہیں سمجھتے۔ حالانکہ باحوالہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اباحت بھی حکمِ شرعی ہے اور اباحت بغیر اذنِ شارع اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تمام مغز کھپائی مفتی صاحب کے لئے بالکل بے سُود ہے۔

الحاصل یہ ایک واضح اور بیّن حقیقت ہے کہ قبر پہ اذان، نہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت ہے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور تبع تابعینؒ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، نہ حضرات مجتہدینؒ سے اس کا جواز منقول ہوا اور نہ ذمّہ دار فقہاء کرامؒ سے، بلکہ وہ اس کو خلافِ سنّت اور بدعت کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز خلافِ سُنّت اور بدعت ہو، وہ کیسے جائز اور مستحب ہو سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خان صاحب بریلی وغیرہ اس کو خود سُنّت کہتے ہیں۔ مگر اثباتِ سُنّت اُن کے منہ کی بات کا نام نہیں ہے، یہاں ٹھوس اور صریح دلیل درکار ہے۔

اذان علی القبر کے جواز کے دلائل قبر پہ اذان دینے کے جواز میں متعدّد اہلِ بدعت حضرات نے چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ چنانچہ اُن کے اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ایذان الاجر ہے (جس کا بہترین جواب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے امعان النظر سے دیا ہے) اس میں خان صاحب نے بزعمِ خود پندرہ دلیلیں قائم کی ہیں۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں "یہ پندرہ دلیلیں ہیں کہ چند ساعات میں فیضِ قدیر سے قلبِ فقیر پر فائض ہوئیں" (ایذان الاجر ص۱۴) مگر ان میں ایک بھی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے قبر کے اُوپر اذان کا مسئلہ ثابت ہو۔ ان دلائل میں کسی میں اذان کی فضیلت کا ذکر ہے اور کسی میں دُعا اور ذکر کی فضیلت کا تذکرہ ہے۔ کسی میں قبر کے اندر میّت کیلئے تثبیت کا سوال ہے، اور کسی میں اس کے لئے تخفیفِ عذاب کا بیان ہے۔ اور کسی میں سُبْحَانَ اللّٰہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وغیرہ کا قبر پہ اثبات ہے۔ کسی میں استعاذہ من الشّیطان کی دُعا کا ذکر ہے اور کسی میں تلقین کا۔ کسی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی لینے سے عذاب کے ٹل جانے کا بیان ہے اور کسی میں شیطان کے بھاگ جانے کا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مسائل اور دلائل اپنے مقام پر حق ہیں اور ان کا

کوئی بھی مسلمان منکر نہیں ہے۔ مگر سوال تو صرف یہ ہے کہ کیا معہود اذان آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ نے قبر پر دی ہے؟ اگر اس کا ثبوت ہے تو لائیے اللہ بسم اللہ۔ اس دلیل سے یہ مسئلہ ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا کہ کسی حدیث سے لاالٰہ الا اللہ کا جملہ لے لیا اور کسی سے درود شریف کی فضیلت اخذ کر لی، اور کسی حدیث سے شیطان کے بھاگنے کی بات اخذ کر لی اور کسی سے اذان کی، اور سب کو جوڑ کر اذان ثابت کر دی۔ اس کا نام دلیل نہیں ہے۔ ایسے طرزِ استدلال سے اسلام میں کیا کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خان صاحب کی سب سے بڑی اور وزنی دلیل کو جس کو انہوں نے دلائل کی مد میں نمبر اوّل پر پیش کیا ہے نقل کر کے اس کے متعلق کچھ عرض کر دیں تاکہ آپ کو نمونہ از خروارے کے طور پر بقیہ دلائل کا معیار اور خان صاحب کا گلستانِ دلائل بھی معلوم ہو جائے، اور ان دلائل سے ان کے اختیار کردہ مسائل کا خاکہ بھی سامنے آ جائے۔ اور یقین کیجئے کہ ان کی ہر دلیل انکے دعوٰی کے اثبات سے قاصر اور فی نفسہٖ غیر مؤثر ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

اِک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی سوز بھی جاتا رہا جاتی رہی تاثیر بھی

خان صاحب لکھتے ہیں کہ دلیل اوّل وارد ہے کہ جب بندہ قبر میں رکھا جاتا ہے اور سوال نکیرین ہوتا ہے۔ شیطان رجیم وہاں بھی خلل انداز ہوتا ہے اور جواب میں بہکاتا ہے۔ امام ترمذی محمدؐ بن علیؒ نوادر الاصول میں امام اجل سفیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ جب مُردے سے سوال ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے۔ شیطان اس پر ظاہر ہوتا اور اپنی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میں تیرا رب ہوں۔ اس لئے حکم آیا کہ میّت کے لئے جواب میں ثابت قدم رہنے کی دعا کریں اور صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ اذان شیطان کو دفع کرتی ہے، اور جب ثابت ہو گیا کہ وہ وقت عیاذاً باللہ مداخلت شیطان لعین کا ہے اور ارشاد ہوا کہ شیطان اذان سے بھاگتا ہے اور ہمیں حکم آیا کہ اس کے دفع کو اذان کہو، تو یہ اذان خاص حدیثوں سے مستنبط بلکہ عین ارشاد شارع کے مطابق اور مسلمان بھائی کی عمدہ امداد و اعانت ہوئی۔ (ایذان الاجر صـ۳ و صـ۴ بلفظہٖ ملخصاً)۔

جواب: خان صاحب کا یہ ارشاد ایک خالص مجددانہ مغالطہ اور قلتِ تدبّر کا افسوسناک

مظاہرہ ہے۔ اولاً اس لئے کہ شرعی اصول کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی تکلیفی زندگی جس میں اغوائے شیطانی کا خطرہ رہتا ہے موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ قبر میں اغوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باقی نوادرُ الاُصول کا حوالہ تو چنداں قابلِ التفات نہیں ہے اس لئے کہ یہ کوئی مرفوع حدیث نہیں بلکہ ایک تابعی کا موقوف قول ہے، اور پھر اس کی سند بھی ذکر نہیں کی گئی اور نوادر الاُصول ان کتابوں میں ہے جن میں رطب و یابس سبھی کچھ ہے۔ المُراح فی المزّاح لعلامہ بدرالدین غزیؒ (المتوفی ۹۸۴ھ) کے حاشیہ میں ہے:

قال السیوطیؒ فی الجامع الکبیر کل ما عزی الی العقیلی وابن عدی والخطیب البغدادی وابن عساکر او للحکیم الترمذی وذکر جماعۃ غیرھم فھو ضعیف فیستغنی بالعزو الیھا عن بیان ضعفہ۔	امام سیوطیؒ جامع کبیر میں لکھتے ہیں کہ جو روایت عقیلیؒ اور ابنِ عدیؒ اور خطیب بغدادیؒ اور ابنِ عساکرؒ اور حکیم ترمذیؒ اور ان کے علاوہ ایک بڑی جماعت کا ذکر کیا، کی طرف منسوب ہو تو وہ ضعیف ہوگی۔ ان کی طرف روایت کی نسبت کر دینا ہی اس کے ضعف کے لئے کافی ہے اسکے ضعف کے الگ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔
(حاشیہ المُراح فی المزاح ص۱۵)	

اگر ان کتابوں میں کوئی روایت باسند ہو اور سند بھی متصل ہو اور راوی بھی تمام ثقہ ہوں اور شذوذ اور علتِ قادحہ سے بھی محفوظ ہو، تو الگ بات ہے ورنہ ان کی طرف کسی روایت کا منسوب کر دینا ہی اس کے ضعیف اور کمزور ہونے کی دلیل ہے اور یہی وہ کتابیں ہیں کہ جن سے جملہ اہلِ بدعت اور خصوصاً خان صاحب بریلی اپنے سب مسائل ثابت کرتے ہیں کیا خوب ؎ مذہب معلوم اہلِ مذہب معلوم!

وثانیاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قبر میں بھی شیطان کا دخل ہوتا ہے اور بعض حضرات صحابہ کرامؓ سے دفن کے بعد کی دعاؤں میں اللھم اجرھا من الشیطان اور اللھم اعذہ من الشیطان اور اس قسم کے جو الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ اپنی حقیقت ہی پر محمول ہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ بہت سے مقامات ایسے ہیں جن میں شیطان کا دخل احادیث سے معلوم ہے مگر ان مقامات پر شاید خانصاحب بھی اذان کو گوارا نہ کریں، چنانچہ صحیح بخاری ج ۲ ص۹۴۵ وغیرہ کتب صحاح میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس وقت یہ دُعا پڑھے:

بسم اللہ جنّبنا الشیطان وجنّب الشّیطان — اللہ کے نام سے۔ اے اللہ مجھے شیطان سے بچا اور شیطان کو
ما رزقتنا (الحدیث۔ بخاری ج ۲ صـ۹۴۵) — اس چیز (یعنی اولاد) میں جو تُو ہمیں دے ہم سے الگ رکھ۔

حافظ ابنِ حجرؒ حضرت مجاہدؒ سے اس کی شرح میں نقل کرتے ہیں کہ :

ان الّذی یجامع ولا یسمّی یلتف الشّیطان — جو شخص ہمبستری کے وقت یہ دُعا نہیں پڑھتا تو شیطان اس کے
علیٰ احلیلہٖ الخ (فتح الباری ج ۲ صـ۹۲) — آلۂ تناسل پر لپٹ جاتا ہے (اور ساتھ شریک ہو جاتا ہے)۔

لیجئے اس سے زیادہ نازک مقام شیطان کو بھگانے کا اور کیا ہوگا؟ کیا قبر پر اذان دینے والے حضرات کے نزدیک اس موقع پر بھی شیطان کو بھگانے کا کبھی خیال پیدا ہوا ہے؟ ان کے نزدیک تو اس موقع پر بھی اذان کم از کم مستحب اور فردِ سنّت ہونی چاہیئے۔ یہاں صرف مسلمان بھائی ہی کی امداد نہیں، بلکہ مسلمان بہن کی ہمدردی اور امداد بھی ہوگی، اور وہ بے چاری دوگونہ تکلیف سے بھی محفوظ رہے گی بلکہ اور اولاد پر بھی احسان ہوگا کہ شیطان کی خلل اندازی سے وہ بھی محفوظ رہے گی۔ اس موقع پر اذان دینے میں مسلمان بھائی اور بہن اور اولاد کئی افراد کا بھلا ہے اور نیک آدمی کی اذان کا اثر بھی مخفی نہیں لہٰذا فریقِ مخالف کے نیک حضرات مریدوں مقتدیوں اور شاگردوں کو مشغول بکار ہونے کا حکم دیں اور خود اذان دینے کا فریضہ ادا کریں تاکہ انکی امداد ہو جائے۔ اگر اس موقع پر وہ ایسا نہیں کرتے تو وجہِ فرق بیان کریں۔

وثالثاً آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ :

ان ھذا الخشوش محتضرۃ (الحدیث) — یعنی قضائے حاجت کے مقامات پر شیاطین موجود رہتے ہیں
(ابوداوٗد ج ۱ صـ۲ و مشکوٰۃ ج ۱ صـ۴۳) — پس جب تم میں سے کوئی پاخانے جائے تو یہ دُعا کر لیا کرے۔

نیز فرمایا :

اللّٰھم انی اعوذ بك من الخبث والخبائث (ترمذی ج ۱ صـ۳) — کہ اے اللہ مجھے نر اور مادہ جنوں اور شیطانوں سے بچا۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ پاخانوں میں شیاطین موجود رہتے ہیں۔ کیا قبر پر اذان دینے والوں نے کبھی اس موقع پر اذان کہنے کو مستحب اور فردِ سُنّت کہا ہے؟ اور اس پر بھی کبھی عمل کیا ہے کہ پیر، مولوی اور مفتی صاحب تو قضائے حاجت میں مشغول ہوں اور یا وفا مرید اور شاگرد اذان دے کر شیاطین کو بھگانے

کی فکر میں ہوں، اور اگر ایسا کرتے ہیں تو خوب، اور اگر نہیں تو وجہِ فرق کیا ہے؟ بیّنوا و توجروا۔

و رابعًا خان صاحب بریلی کے پیش کردہ جملہ فوائد (اور ان سے اخذ کر کے مفتی احمد یار خان صاحب کے یہ تمام منافع کہ اذان میں پوری تلقین ہے ـــ اذان کی آواز سے شیطان بھاگتا ہے۔ ـــ اذان سے دل کی وحشت دُور ہوتی ہے ـــ اذان کی برکت سے غم دُور ہوتا ہے ـــ اذان کی برکت سے لگی ہوئی آگ بجھتی ہے ـــ اذان ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ کی برکت سے عذابِ قبر دُور ہوتا ہے اور اذان میں حضور علیہ السلام کا ذکر ہے اور صالحین کے ذکر کے وقت نزولِ رحمت ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ دیکھئے ایذان الاجر اور جاء الحق ص۲۹۷ تا ص۳۰۱ بلفظہٖ ملتقطًا) جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کو بھی معلوم تھے۔ مگر کیا وجہ ہے کہ آپ نے مُدّۃ العمر ایک دفعہ بھی کسی کی قبر پر اذان نہ کہی، نہ اس کا حکم صادر فرمایا، نہ حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ میں سے کسی نے اس پر عمل نہ کیا اور نہ حضرات ائمۂ دین میں سے کسی نے یہ راز سمجھا، تو آج چودھویں صدی میں کسی شخص کو یہ حق کہاں سے اور کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ اپنی ان بے حقیقت قیاس آرائیوں سے دین میں پیوند کاری کرے؟ قبر پہ اذان دے کر مسلمان بھائی کی عمدہ امداد کا یہ جادُو اثر نسخہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود رؤف اور رحیم ہونے کے اپنی امّتِ مرحومہ کو نہ بتایا اور حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کو بھی یہ نسخۂ عجیبہ و مفیدہ معلوم نہ ہو سکا اور حضرات ائمۂ مجتہدینؒ بھی اس اکسیرِ اعظم سے محفوظ رہے اور سلف صالحینؒ بھی اس زود اثر گُشتہ کے اثر سے فیض یاب نہ ہو سکے تو پھر آج اس نسخہ کو کون پوچھتا ہے؟ ؎

اور ہوں گے جو سہیں اُن کی جفائیں بے محل ــــ ہم کسی کا غمزۂ بے جا اٹھا سکتے نہیں

وخامسًا دلائل شرعیہ سے ثابت ہے کہ شیطانِ لعین انسان کا عدوِّ مبین ہے، اور ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ انسان کو اغوا کر کے اپنا رفیق اور ساتھی بنا لے۔ بیداری میں وہ بھلا پیچھا کیسے چھوڑتا، وہ تو خوابِ غفلت میں بھی انسان کو پریشان کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اور خواب کی ایک قسم تخویف من الشیطان ہے جو اس کی واضح دلیل ہے۔ اہلِ بدعت کے قاعدہ کی رُو سے لازم ہے کہ دن اور

رات کے جملہ اوقات میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی عمدہ امداد اس اذان کے ذریعہ کی جائے، اور سفر و حضر میں اس عمدہ امداد کو فراموش نہ کیا جائے۔ کوئی اس کو پسند کرے یا نہ کرے، یہ کہتے ہوئے اس پر عمل کرنا چاہیئے کہ مان نہ مان میں تیرا مہمان! اور یہ کس سے پوشیدہ ہے کہ اسمبلیوں، کلبوں، سنیماؤں، کالجوں، اسکولوں اور دفتروں میں آج کل جس طرح شیطان کا دخل ہے وہ کسی اور جگہ ہرگز نہیں۔ لہٰذا اپنے مسلمان بھائیوں کی عمدہ امداد اذان کے ذریعہ ہونی چاہیئے، اور پھر حکومت کے فیصلہ کا انتظار کیجئے کہ وہ اس ہمدردی کا کیا صلہ تجویز کرتی ہے؟ اور آج کون مسلمان ہے جو اس ناپائیدار دُنیا میں وحشت اور غم میں مبتلا نہیں، ہر طرف سے بیچارہ مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے اور وہ کون سنگدل ہے جس کے ماں باپ اور بیٹا یا کوئی عزیز فوت ہو جائے اور وہ غم و الم سے دوچار نہ ہو، اس کی عمدہ امداد اذان کے ذریعہ کیوں نہیں کی جاتی؟ اور سینکڑوں مکانات بعض افراد کی غلطی اور نادانی کی وجہ سے نذرِ آتش ہو جاتے ہیں پھر اذان کے ذریعہ آگ بجھا کر اُن بیچاروں کی یہ عمدہ امداد کیوں نہیں کی جاتی؟ یہ بھی کوئی عجیب نسخہ ہے کہ میّت کی عمدہ امداد تو اس سے ہوتی ہے اور زندوں کا ہولِ دل، وحشت اور غم اس سے دُور نہیں کیا جاتا، اور نہ تو آتشِ حسّی اس سے بجھائی جاتی ہے اور نہ معنوی (مثلاً حسد، بغض، عداوت وغیرہ) یہ کیا عجیب اور محیّر العقول منطق ہے، فیصلہ آپ پر ہے ؂

یہاں تک آپ کی تعظیم کر دی
اب آگے آپ کے اعمال جانیں

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

اہلِ بدعت حضرات کا ایک اُصولی مغالطہ ہے جس میں وہ سب کے سب گرفتار ہیں۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب کے الفاظ میں وہ مغالطہ یہ ہے کہ بعد دفن ذکر اللہ، تسبیح و تکبیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے اور جس کی اصل ثابت ہو وہ سنّت ہے۔ اس پر زیادتی کرنا منع نہیں۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ حج میں تلبیہ کے جو الفاظ احادیث سے منقول ہیں، ان میں کمی نہ کرے۔ اگر کچھ بڑھا دے تو جائز ہے (ہدایہ وغیرہ) اذان میں تکبیر بھی ہے اور کچھ زیادہ بھی، لہٰذا یہ سنّت سے ثابت ہے (بلفظہٖ جاء الحق ص۳۰۱)۔

جواب: یہ استدلال بھی سراسر مردود ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ پوری تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا

چکا ہے کہ یہ سب منافع اور فوائد جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور حضرات صحابہ کرام وغیرہم کو معلوم تھے۔ مگر انہوں نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ بھی قبر پر اذان نہیں دی۔ لہٰذا سنّتِ ثابتہ کے مقابلہ میں ایسے خودساختہ عقلی دلائل ہرگز قابلِ قبول نہیں ہیں۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ لکھتے ہیں، کہ وُہ عقلیات جو شریعت کے معیار اور میزان پر پورے نہ اُترتے ہوں "قابلِ اعتماد و محلِ اعتبار نمی تواند بود"۔ (عجالۂ نافعہ ص۳)۔

وثانیاً[۲] مفتی احمد یار خان صاحب نے ہدایہ کے حوالہ سے اتنی بات (جو مفید طلب تھی) تو نقل کر دی ہے کہ اگر کچھ بڑھا دے تو جائز ہے لیکن صاحبِ ہدایہ کی دلیل نقل نہیں کی کہ یہ زیادت کیوں جائز ہے؟ صاحبِ ہدایہ اپنی عادت کے موافق اس مسئلہ کی نقلی دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ:

ان اجلاء الصحابۃ رضؓ کابن مسعودؓ وابن عمرؓ وابی ھریرۃؓ زادوا علی الماثور (ہدایہ ج ۱ ص۲۱۴)

بڑے بڑے حضرات صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ، ابنِ عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ ماثور تلبیہ میں کچھ الفاظ زیادہ پڑھتے تھے۔

یہ وہ صحابی ہیں جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ہر وقت حاضری دینے والے تھے۔ ان کے اس زیادت والے عمل سے یہ ثابت ہوا کہ اُن کے پاس آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور موجود تھا، ورنہ حضرت ابنِ مسعودؓ اور حضرت ابنِ عمرؓ وہی جلیل القدر صحابی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی سنّت اور ہیئت کے بدلنے کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور تغییر کو بدعتِ ظلماء، اور بدعتِ عظمیٰ وغیرہ سے تعبیر کرتے تھے۔ جس کی پوری تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اگر ان کے پاس ایسا ثبوت نہ ہوتا تو ہرگز وہ یہ زیادتی نہ کرتے۔

ہم نے جو یہ کہا کہ ان کے پاس ثبوت ہوگا۔ یہ بات محض "ہوگا" پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ حقیقۃً ان کے پاس ثبوت موجود تھا۔ حضرت ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں:

والناس یزیدون لبیک ذا المعارج ونحوہ من الکلام والنبی صلّی اللہ علیہ وسلّم یسمع فلا یقول لھم شیئاً۔ (ابوداؤد ج ۱ ص۲۵۲ و نصب الرایہ ج ۳ ص۲۵)

کہ لوگوں نے لبیک ذا المعارج اور اسی طرح کا اور کلام تلبیہ میں زیادہ کیا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اُس کو سُنا اور اُن کو کچھ نہ کہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تلبیہ کے اندر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے اور آپ کی موجودگی میں یہ کلمات حضرات صحابہ کرامؓ زیادہ کرتے تھے، اور آپ نے سُن کر بھی اُن کو منع نہیں کیا تو یہ آپ کی تقریری حدیث ہے (دیکھئے نخبۃ الفکر ص۷۶ وغیرہ) - وہی حضرت ابو ہریرہؓ جن کا حوالہ صاحب ہدایہ نے دیا ہے کہ وہ تلبیہ میں بعض الفاظ زیادہ کیا کرتے تھے، ان سے (نسائی ج ۲ ص۱۳، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم ج ۱ ص۴۵۰ میں علیٰ شرط الشیخین اور اس کے ملخص موارد الظمآن ص۲۴۲) یہ روایت آتی ہے کہ وہ زیادت کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کیا کرتے تھے (ملاحظہ ہو زیلعی ج ۳ ص۲۵ وغیرہ) الغرض جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ تلبیہ میں زیادت کیا کرتے تھے - مگر یہ زیادت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قولی اور تقریری حدیث سے ثابت تھی - اس پر مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا قیاس کرنا سراسر باطل اور مردود ہے - غرضیکہ کوئی بھی ایسی صحیح اور صریح دلیل موجود نہیں جس سے قبر پر اذان کا جواز ثابت ہو سکے، چہ جائیکہ وہ فرد سنّت ہو - اور عرض کیا جا چکا ہے کہ جواز اور اباحت بھی حکم شرعی ہے اور وہ بھی صرف شارع سے ثابت ہوگا اور بس -

اذان میں انگوٹھے چُومنا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو پردۂ خفا میں ہو اور اُمت کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہو - آپ کی ایک ایک ادا، ایک ایک حرکت اور نشست و برخاست غرضیکہ کوئی بھی آپ کا قول و فعل پوشیدہ نہیں - اذان جیسی عبادت جو دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی تھی اور ہجرت کے بعد تقریباً دس سال مدینہ طیبہ میں آپ کے سامنے ہوتی رہی اور اذان کے کلمات نیز اذان دینے والوں کے نام اور اذان کی جملہ کیفیات احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہیں - مگر کسی بھی صحیح روایت میں اس کا ذکر نہیں کہ اذان سُنتے وقت انگوٹھے چُومنے چاہئیں - اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) سے ہی محبت ہے (اور ہر مسلمان کو ہونی چاہیئے) تو اذان دینے والے کے منہ کو چُومنا چاہیئے جس کے مبارک ہونٹوں اور زبان سے یہ مبارک نام نکلا ہے، اپنے انگوٹھے تو ہر وقت

ساتھ ہی رہتے ہیں، نہ تو اُن سے آپ کا اَمرِ گرامی صادر ہوتا ہے اور نہ اُن پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جب اس فعل کا صحیح احادیث سے ثبوت ہی نہیں (اور اذان جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ اور خیرالقرون میں ہوتی رہی) تو پھر اس کو آج کیسے دین کہا جا سکتا ہے اور کس طرح اس کو شعارِ دین بنانا درست ہے اور نہ کرنے والوں کو کیونکر ملامت کرنا روا ہے۔

انگوٹھے چومنے کے ثبوت میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اُصولی طور پر دو ہیں ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت ہے کہ اُنہوں نے جب مؤذن کا یہ قول سُنا کہ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ تو اس وقت اُنہوں نے

قبّل باطن الانملتين السباحتين ومسح عينيه فقال صلى الله عليه وسلم من فعل مثل ما فعل خليلي فقد حلت له شفاعتي۔

اپنے کلمے کی انگلیوں کے باطنی حصّوں کو چُما اور آنکھوں سے لگایا۔ پس حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص میرے اس پیارے کی طرح کرے، اس کیلئے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

یہ روایت مسند فردوس دیلمیؒ کے حوالہ سے تذکرۃ الموضوعات ص۳۶ اور الموضوعات کبیر ص۷۵ میں نقل کی گئی ہے اور مفتی احمد یار خان صاحب نے مقاصدِ حسنہ کے حوالہ سے جاء الحق ص۳۷۸ میں نقل کی ہے، اور ترجمہ بھی مفتی صاحب ہی کا ہے اور یہ روایت مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاس حنفیت ص۶۰۳ میں بھی نقل کی ہے۔

جواب : علّامہ محمد طاہر حنفیؒ لکھتے ہیں ولا یصح (تذکرۃ الموضوعات ص۳۶) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ ملّا علی قاریؒ، علّامہ سخاویؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں لا یصح (موضوعاتِ کبیر ص۷۵) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ جب سرے سے یہ روایت ہی صحیح نہیں تو اس پر عمل کرنے کی کیسے گنجائش؟ اور خود مفتی احمد یار خان صاحب نے امام سخاویؒ سے ولم یصح نقل کر کے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: "یہ حدیث پایۂ صحت تک نہ پہنچی" (جاء الحق ص۳۷۸)۔ مولوی محمد عمر صاحب کا یہ کمال ہے کہ اُنہوں نے تذکرۃ الموضوعات اور الموضوعاتِ کبیر سے حوالے تو نقل کئے ہیں۔ لیکن لا یصح کا جملہ شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کر گئے ہیں۔ تُف ہے اس علمی خیانت اور بد دیانتی پر۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی اُپج مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ "صحیح نہ ہونے سے ضعیف ہونا لازم نہیں کیونکہ صحیح کے بعد درجہ حسن باقی ہے۔ لہٰذا اگر یہ حدیث حسن ہو تب بھی کافی ہے (جاء الحق ص۳۸۲) مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کوئی محدث جب مطلق لا یصح کہتا ہے تو اس کا مطلب اس کے بغیر اور کچھ نہیں ہوتا کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر حدیث حسن ہوتی ہے تو اس کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے یا لیس بصحیح بل حسنٌ وغیرہ سے اس کو تعبیر کرتے ہیں۔ مطلق لا یصح سے حسن سمجھنا قلّتِ فہم کا نتیجہ ہے۔

ایک وہم اور اُس کا ازالہ حضرت ملّا علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ جب اس حدیث کا رفع حضرت صدیق اکبرؓ تک صحیح ہو گیا تو عمل کے لئے یہی کافی ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم پر میری اور میرے خلفاء راشدینؓ کی سنّت لازم ہے (موضوعاتِ کبیر ص۷۵)۔ اور یہی دلیل مفتی احمد یار خان صاحب نے جاء الحق ص۳۸۲ میں اور مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاسِ حنفیت ص۶۰۲ میں پیش کی ہے۔ لیکن یہ حضرت ملّا علی القاریؒ کا وہم ہے۔ اس لئے کہ اگر واقعی یہ روایت حضرت ابوبکرؓ تک موقوف بھی صحیح ہوتی تب بھی حجّت تھی۔ مگر حضرت ابوبکرؓ سے جو روایت منقول ہے وہ مرفوع ہے اور اس کی سند سرے سے صحیح ہی نہیں ہے نہ یہ کہ مرفوع صحیح نہیں۔ پھر یہ کہنا کہ مرفوع صحیح نہیں ہے موقوف صحیح ہے اور عمل کے لئے کافی ہے کیسے صحیح ہوا؟ باقی جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ لا یصح رفعہٗ یا لا یصح فی المرفوع تو وہ ابنِ صالحؒ وغیرہ بعض شیوخ کی موقوف روایات کے پیشِ نظر ہے۔ وہ اگر بالفرض صحیح بھی ہوں تب بھی موقوف ہونے کی وجہ سے حجّت نہیں ہیں خصوصاً جبکہ ابنِ صالحؒ وغیرہ صحابی بھی نہیں ہیں۔ ملّا علی القاریؒ کا وہم کوئی نئی چیز نہیں، امام عبداللہؒ ابن المبارکؒ نے خوب کہا ہے ومن ذا سلم من الوھم (لسان المیزان ج ۱ ص۱۷) وہم سے کون بچ سکتا ہے؟ الّا من عصمہ اللہ تعالیٰ۔

ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی تحقیق مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جاوے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، پھر بھی فضائل اعمال میں حدیث ضعیف معتبر ہوتی ہے (جاء الحق ص۳۸۳)۔

جواب: یہ بھی مفتی صاحب کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ کہہ دینا کہ فضائل اعمال میں ہر قسم کی حدیث غیر مشروط طور پر حجّت ہوتی ہے، قطعاً غلط ہے۔ امام قاضی ابن العربی المالکیؒ (المتوفی ۵۴۳ھ) وغیرہ تضعیف

حدیث کے متعلق فرماتے ہیں لا یعمل به مطلقاً (القول البدیع ص۱۹۵) "مطلقاً اس پر عمل صحیح نہیں ہے"۔ اور جو عمل کرتے ہیں وہ شرطیں لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام ابن دقیق العیدؒ (المتوفی ۷۰۲ھ) لکھتے ہیں:

العمل بالحدیث الضعیف مقید بشروط (امام ج۲ ص۱۷۱) — ضعیف حدیث پر عمل کرنا چند شرطوں سے مقید ہے۔

وہ شرطیں کیا ہیں۔ امام سخاویؒ (المتوفی ۹۰۲ھ) اپنے شیخ حافظ ابن حجرؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

ان شرائط العمل بالضعیف ثلاثة الاول متفق علیه ان یکون الضعیف غیر شدید فیخرج من انفرد من الکذابین والمتهمین بالکذب ومن فحش غلطه الثانی ان یکون مندرجا تحت اصل عام فیخرج ما یخترع بحیث لا یکون له اصل اصلا الثالث ان لا یعتقد عند العمل به ثبوته لئلا ینسب الی النبی صلی الله علیه وسلم ما لم یقله۔ (القول البدیع ص۱۹۵)

ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی تین شرطیں ہیں۔ اول جو تمام حضرات محدثین میں متفق علیہ ہے کہ حدیث زیادہ ضعیف نہ ہو۔ لہٰذا جس حدیث میں کوئی کذاب یا متہم بالکذب یا ایسا راوی منفرد ہو جو زیادہ غلطی کا شکار ہوا ہو تو اس کی ضعیف حدیث معمول بہ نہ ہوگی۔ دوم یہ کہ وہ عام قاعدہ کے تحت درج ہو، اس سے وہ خارج ہوگئی جس کی کوئی اصل نہ ہو اور محض اختراع کی گئی ہو۔ سوم عمل کرتے وقت یہ اعتقاد نہ کر لیا جائے کہ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم سے ثابت ہے تاکہ آپ کی طرف ایسی بات منسوب نہ ہو جائے جو آپ نے نہیں فرمائی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ شرطیں مفقود ہوں تو روایت ہرگز قابلِ عمل نہ ہوگی۔ اور آخری شرط تو خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کیونکہ جو چیز وثوق کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم سے ثابت نہیں، اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا اور پھر اس کو ثابت ماننا، سنگین جرم ہے اور یہ درجۂ اول کی متواتر حدیث من کذب علیّ (الحدیث) کے بظاہر خلاف ہے۔

حضرت مولانا عبدالحئیؒ لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ:

واما العمل بالضعیف فی فضائل الاعمال فدعوی الاتفاق فیه باطلة نعم هو مذهب — فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بالاتفاق عمل کا دعوٰی کرنا باطل ہے۔ ہاں جمہور کا یہ مذہب ہے۔

الجمهور لکنه مشروط بان لا یکون للحدیث ضعیفا شدید الضعف فان کان کذلك لم یقبل فی الفضائل ایضاً (الآثار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة ص۳۱)

مگر اس میں شرط یہ ہے کہ حدیث سخت ضعیف نہ ہو ورنہ فضائل اعمال میں بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ مبتدعین حضرات ایسی حدیثوں کے اثبات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، فوا اسفا! خان صاحب بریلی نے کیا ہی خُوب فرمایا ہے کہ "حدیث ماننے اور حضور اکرم سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف نسبت کرنے کے لئے ثبوت چاہیئے، بلے ثبوت نسبت جائز نہیں (ملفوظِ عرفانِ شریعت حصّہ سوم ص۲۷) - یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگرچہ سابقہ شرطوں کے ساتھ فضائلِ اعمال میں عمل کرنا جائز اور مستحب ہے لیکن شرط یہ ہے کہ موضوع نہ ہو۔ اگر روایت موضوع ہوگی تو ہرگز قابلِ عمل نہ ہوگی۔ حافظ ابنِ دقیق العیدؒ لکھتے ہیں:

وان کان ضعیفا لا یدخل فی حیّز الموضوع فان احدث شعاراً فی الدّین منع منه وان لو یحدث فھو محل نظر۔ (احکام الاحکام ج۱ ص۱۵)

یعنی اگر ضعیف حدیث ہو لیکن بشرطیکہ وہ موضوع نہ ہو، تو اس پر عمل جائز ہے لیکن اگر اس سے دین کے اندر کوئی شعار قائم اور پیدا ہوتا ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا ورنہ اس پر غور کیا جائے گا۔

لیجئے یہاں ایک اور بات بھی حل ہو گئی۔ وہ یہ کہ ضعیف حدیث اس وقت قابلِ عمل ہوگی جبکہ موضوع اور جعلی نہ ہو، اور ساتھ ہی وہ دین کا شعار اور علامت نہ ٹھہرالی گئی ہو۔ اگر دین کی علامت یا شعار کا خطرہ ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ اور اہلِ بدعت حضرات نیز سے ان چیزوں کو سنّت اور حنفیت کا معیار قرار دیتے ہیں اور ان بدعات کو نہ کرنے والوں کو گستاخ اور وہابی کہتے ہیں، اور ان کے خلاف مقیاس حنفیت جیسی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں بھلا یہ ضعیف روایتیں کیونکر حجّت ہو سکتی ہیں؟

اور علّامہ سخاویؒ لکھتے ہیں:

یجوز ویستحب العمل فی الفضائل والترغیب والترھیب بالحدیث الضعیف

کہ جائز اور مستحب ہے کہ فضائلِ اعمال اور ترغیب و ترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے مگر شرط یہ

ما لم یکن موضوعا۔ (القول البدیع ص۱۹۵) ہے کہ وہ موضوع اور جعلی نہ ہو۔

نیز لکھتے ہیں:

واما الموضوع فلا یجوز العمل بہ بحال (ص۱۹۶) بہرحال موضوع حدیث تو اس پر کسی حالت میں عمل جائز نہیں ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ فضائلِ اعمال میں ہر ضعیف حدیث قابلِ عمل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے حضرات محدثین کے نزدیک چند شرطیں ہیں، اور جو حدیث موضوع اور جعلی ہو اس پر کسی حالت اور کسی صورت میں عمل جائز نہیں ہے، نہ فضائلِ اعمال میں اور نہ ترغیب و ترہیب وغیرہ میں۔ اب بقائمی ہوش و حواس سُن لیجئے کہ انگلیاں چُومنے کی تمام حدیثیں صرف ضعیف ہی نہیں ہیں بلکہ موضوع اور جعلی ہیں۔

چنانچہ امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں:

الاحادیث التی رویت فی تقبیل الانامل وجعلها علی العینین عند سماع اسمہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المؤذن فی کلمۃ الشھادۃ کلها موضوعات انتھی (تیسیر المقال للسیوطی بحوالہ عماد الدین ص۱۳۳ طبع ۱۹۹۸ھ) وہ حدیثیں جن میں مؤذن سے کلمہ شہادت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نام سُننے کے وقت انگلیاں چُومنے اور آنکھوں پر رکھنے کا ذکر آیا ہے وہ سب کی سب موضوع اور جعلی ہیں۔

لیجئے اب تو قصہ ہی ختم ہو گیا۔ مفتی احمد یار خان صاحب کو یہ الفاظ دیکھ کر غور کرنا چاہیئے کہ "الحمد للہ کہ اس اعتراض کے پرخچے اُڑ گئے ہیں اور حق واضح ہو گیا"۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص۳۸۴)۔ پرخچے کس کی دلیل کے اُڑ گئے اور حق کس کی طرف سے واضح ہو گیا ہے؟ عیاں راچہ بیاں ع

ظلمت کے بھیانک ہاتھوں سے تنویر کا دامن چھوٹ چکا

امام سیوطیؒ کے کلھا موضوعات کے حوالہ کے بعد یہ ضرورت تو نہیں کہ ہم کچھ اور عرض کریں مگر محض تکمیلِ فائدہ کے لئے حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روایت کا ذکر بھی کر دیتے ہیں۔ اسی مضمون کی روایت حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی منقول ہے مگر اس کے الفاظ یہ ہیں:

ثم یقبل ابھامیہ۔ (الحدیث) پھر اپنے دونوں انگوٹھے چُومے۔

پہلی روایت میں انگوٹھوں کا ذکر نہیں بلکہ شہادت کی انگلیوں (اور ایک روایت میں ابہام

اور سباحۃ) کا ذکر تھا اور وہ مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کے باب یا سرخی کے مطابق نہ تھی مگر یہ روایت مطابق ہے۔ یہ روایت موضوعات کبیر صہ۷۵ اور تذکرۃ الموضوعات ص۳۶ وغیرہ میں ہے اور مفتی احمد یار خان صاحب نے مقاصد حسنہ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ (جاء الحق ص۳۷۸) اور مولوی محمد عمر صاحب نے طحطاوی ص۱۲۲ کے حوالہ سے نقل کی ہے (مقیاس ص۶۰۱) لیکن علامہ محمد طاہرؒ اور ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں:

بسند فیه مجاهیل مع انقطاعه الخ | کہ اس کی سند میں کئی مجہول راوی ہیں، اور سند بھی منقطع ہے۔

(تذکرہ ص۳۶ و موضوعات ص۷۵)

تو اس ضعیف روایت سے دین کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے؟ امام بیہقیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

فی هذا الاسناد قوم مجهولون ولم یکلفنا الله تعالیٰ ان نأخذ دیننا عمن لا نعرفه (کتاب القراۃ ص۱۲۷) | کہ اس سند میں کئی راوی مجہول ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین مجہول راویوں سے اخذ کریں۔

انگوٹھے چومنے کا ایک اور وزنی ثبوت

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں:

"صدر الافاضل مولائی مرشدی استاذی مولانا الحاج سید محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی دام ظلہم فرماتے ہیں کہ ولایت سے انجیل کا ایک بہت پرانا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برنباس آج کل وہ عام طور پر شائع ہے اور ہر زبان میں اس کے ترجمے کئے گئے ہیں۔ اس کے اکثر احکام اسلامی احکام سے ملتے جلتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے روح القدس (نور مصطفوی) کے دیکھنے کی تمنا کی تو وہ نور ان کے انگوٹھوں کے ناخنوں میں چمکایا گیا۔ انہوں نے فرط محبت سے ان ناخنوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔" (جاء الحق ص۳۷۹ و ص۳۸۰)۔ مولوی محمد عمر صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور انجیل برنباس کا صفحہ بھی دیا ہے (انجیل برنباس ص۶) اور عبارت بھی نقل کی ہے جو اغلب ہے کہ انجیل برنباس کی ہی عبارت ہوگی۔ اس میں یہ بھی ہے کہ "پس آدم علیہ السلام نے بمنت یہ کہا کہ اسے پروردگار یہ تحریر مجھے میرے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخنوں پر عطا فرما۔ تب اللہ نے پہلے انسان کو یہ تحریر اس کے دونوں انگوٹھوں پر عطا کی" (پھر آگے ہے) "تب پہلے انسان نے ان کلمات کو پدری محبت کے ساتھ بوسہ دیا اور اپنی دونوں آنکھوں سے ملا" (مقیاس حنفیت ص۶۰۴)۔

اب بھی اگر کوئی شخص انگوٹھے نہ چومے تو اس کی مرضی۔ یہ تو بقول مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ، تو ہی حدیثوں اور حضرات صوفیاء کرامؒ اور حضرات فقہاءؒ سے ثابت ہے بلکہ عیسائیوں سے بھی ثابت ہے اور انجیل برنباس کی بیّن شہادت ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! غیر مسلموں کی بات کو اپنی تائید میں پیش کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اصل چیز کسی معقول طریقہ سے اسلام سے بھی تو ثابت ہو۔ جب انگوٹھے چومنے کی سب حدیثیں ہی موضوع اور جعلی ہیں تو پھر اصل کیا اور اس کی تائید کیا؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سابق زمانہ میں عیسائیوں کی اقتداء کرتے ہوئے کسی نے اسی انجیل برنباس کو پیش نظر رکھ کر یہ جعلی حدیثیں بنا ڈالی ہیں اور یار لوگوں نے ان کو پلّے باندھ لیا ہے، اور دوسروں سے یوں تخاطب فرماتے ہیں کہ "انشاء اللہ کراہت کے لئے صحیح حدیث تو کیا، ضعیف بھی نہ ملے گی، صرف یاروں کا اجتہاد اور عداوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے"۔ (جاء الحق بلفظہ ص۳۹۴) لاحول ولا قوۃ الا باللہ، معاذ اللہ تعالیٰ، ثم معاذ اللہ تعالیٰ۔

دیکھا آپ نے اہل بدعت حضرات کو کہ دعویٰ کرتے وقت تو گاؤ زبان مگر ثبوت پیش کرتے وقت ریشہ خطمی۔ مفتی صاحب کو اس کا علم ہونا چاہیئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز کو ترک کرنا بھی سنّت ہے، اور آپ کا عدم فعل بھی حضرات فقہاء کرام کے نزدیک کراہت کی دلیل ہے اور یہ صرف یاروں کا اجتہاد نہیں بلکہ ان کے پاس سو فیصدی محدّثین کا طے شدہ قاعدہ ہے کہ جعلی اور موضوع حدیث قابلِ عمل نہیں ہے مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ کیا جعلی اور موضوع حدیث کو تسلیم کرنے اور اس کی ترویج سے عداوتِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم ہوتی ہے یا جعلی حدیث کے انکار سے؟ اس کا جواب مفتی صاحب پر موقوف ہے، جیسا مناسب سمجھیں ارشاد فرمائیں۔

کفنی یا الفی لکھنے کا بیان

میّت کو غسل دینے کے بعد اس کو سنّت کے مطابق کفن پہنانا احادیث سے ثابت ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ بطور تبرک کسی کے کفن میں کوئی کپڑا رکھا جائے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے لئے اپنا تہبند عطا فرمایا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ کسی بزرگ سے کوئی کپڑا لے کر اپنے کفن

کے لئے اس کو رکھ لیا جائے جیسا کہ بخاری باب من اعدّ الکفن میں اس کے متعلق حدیث آتی ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے تبرّکات کو اپنی قبروں میں کھولنے کی وصیّت اگر بسندِ صحیح ثابت ہو تو تسلیم کرنے میں کوئی تامّل نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک دو نہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے سامنے فوت ہوئے اور دفن کئے گئے۔ اسی طرح حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے سامنے بھی ہوتا رہا۔ کفن بھی لوگ مُردوں کو پہناتے تھے اور لکھنا بھی جانتے تھے۔ ان کو کلمہ طیّبہ بھی ہم سے بدرجہا زیادہ اچھا یاد تھا اور ان کے دلوں میں اس کی صحیح معنی میں عظمت بھی تھی۔ اسی طرح دُرود شریف وغیرہ اور تسبیح و تہلیل وغیرہ سبھی کچھ ان کو حفظ تھا، اور ان کو قبر اور آخرت کا صحیح حال بھی معلوم تھا اور اپنے اعزّہ و اقارب کا تو ذکر ہی چھوڑیئے۔ اہلِ محلہ میں سے اگر کوئی فوت ہو جاتا تو کئی کئی دن تک وہ اس غم میں مبتلا رہتے تھے کہ خدا معلوم اس کے ساتھ قبر میں کیا ہوا ہوگا؟ الغرض ان میں کامل ہمدردی بھی تھی اور فکرِ آخرت بھی۔ مع ہذا اُنہوں نے کفنی وغیرہ نہ لکھی اور نہ اس کا حکم دیا۔ پھر آج وہ کونسا نیا انقلاب رُونما ہوا ہے جس کے تحت یہ سب کچھ جائز ہو گیا ہے؟ جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو گیا ہے۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں:

"لہٰذا میّت کے لئے کفن وغیرہ پہ ضرور عہد نامہ لکھا جاوے"۔ (بلفظہ جاء الحق ص۳۲۵)

کفنی اور الفی لکھنے کے جواز پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں، امام حکیم ترمذیؒ کی نوادر الاصول سے جو مرفوع روایت نقل کی گئی ہے کہ جو شخص اس دُعا کو لکھے اور میّت کے سینے اور کفن کے درمیان کسی کاغذ میں لکھ کر رکھے تو اس کو عذابِ قبر نہ ہوگا اور نہ منکر نکیر کو دیکھے گا (جاء الحق ص۳۲۳)۔ اسی طرح طاؤس تابعیؒ سے بحوالہ ترمذی مذکور جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کی وصیّت کے بموجب اُن کے کفن میں یہ کلمات لکھے گئے (جاء الحق ص۳۲۴) یہ تمام بے حقیقت اور بے اصل باتیں ہیں۔ پہلے امام سیوطیؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ کسی روایت کا حکیم ترمذیؒ وغیرہ کی طرف منسوب کر دینا ہی اس کے ضعیف اور کمزور ہونے کے لئے بالکل کافی ہے۔ باقی جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سرکاری اصطبل کے گھوڑوں کی رانوں پر حُبس فی سبیل اللہ لکھا ہوتا تھا، باوجودیکہ گھوڑے کا نجاست میں آلودہ ہونے کا خطرہ بھی رہتا تھا، لہٰذا میّت کے کفن پر لکھنا بھی درست ہے

(جاء الحق ص۳۲۴ محصلہ) تو یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ سرکاری زندہ گھوڑوں پر نمبر لگانے سے میّت کے کفن پر لکھنے کا اثبات مشکل اور دُور کی بات ہے یہی وجہ ہے کہ امام ابنِ حجرؒ نے اس کو رد کیا ہے۔ باقی انکو شافعی کہہ کر اغماض کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیا امام ابن حجرؒ شافعی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ غلط قیاس کو باطل کردیں؟ اگر یہ دلیل اور قیاس صحیح ہوتا تو حضرت عمرؓ کے وقت اور بعد کو خیر القرون میں یہ قیاس لوگوں کو کیوں نہ سوجھا؟ کونسا نیا حادثہ اور مسئلہ درپیش ہوا ہے جس کے لئے یہ قیاس ایجاد کیا گیا ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق صاحبؒ کے والد حضرت سیف الدین صاحبؒ جو صوفی مشرب آدمی تھے، ان کی وصیّت سے استدلال بھی صحیح نہیں ہے خود شیخ عبدالحق صاحبؒ لکھتے ہیں "مشرب پیر حجّت نیست دلیل از کتاب وسنّت مے باید" (اخبار الاخیار ص۹۳)۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو حضرات پیشانی اور کفن پر لکھنے کی اجازت دیتے ہیں ان میں بعض اس کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ روشنائی سے نہ لکھا جائے بلکہ محض انگلی سے لکھا جائے۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب شامی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ:

ان ممّا یکتبُ علی جبھۃ المیّت بغیر مداد بالاصبع المسبحۃ الخ (جاء الحق ص۳۲۷)

میّت کی پیشانی پر انگلی سے بغیر سیاہی کے لکھ دیا جاوے۔

سیاہی وغیرہ سے لکھنے میں چونکہ بے ادبی کا احتمال ہے اس لئے بعض علماء نے منع کرنے کی یہ دلیل پیش کی ہے جیسے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور علّامہ شامیؒ وغیرہ اور ان کا حوالہ مفتی احمد یار خان صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ جہاں بزرگوں سے قبر میں شجرہ رکھنے کا واقعہ نقل کرتے ہیں اس میں اس کی تصریح کرتے ہیں کہ "بر سینۂ مُردہ درونِ کفن یا بالائے کفن گذارند ایں طریق را فقہاء منع مے کنند" (بحوالہ جاء الحق ص۳۲۲) اس سے معلوم ہوا کہ کفن کے اُوپر یا کفن کے نیچے میّت کے سینہ پر کسی لکھی ہوئی چیز کا رکھنا حضرات فقہاء کرامؒ کے نزدیک منع ہے۔ ہاں اگر قبر کے سرہانہ میں کوئی طاقچہ ہو اور اس میں رکھا جائے تو حضرت شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ یہ درست ہے۔ لیکن اس سے محل نزاع حل نہیں ہوتا کیونکہ جھگڑا کفنی اور الفی لکھنے کا ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کہتے ہیں۔ درمختار میں اسی جگہ ایک واقعہ نقل فرمایا کہ کسی نے وصیّت

کی تھی کہ اُس کے سینہ پر یا پیشانی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کیا گذری؟ اُس نے کہا کہ بعد دفن ملائکہ عذاب آئے مگر جب انہوں نے بسم اللہ لکھی ہوئی دیکھی تو کہا کہ تُو عذابِ الٰہی سے بچ گیا۔ (بلفظہٖ جاء الحق ص۳۲۴)

عذابِ الٰہی سے اور فرشتوں کے جھگڑے سے بچنے کا یہ بہت ہی عمدہ نسخہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ خیر القرون میں کسی کو کیوں نہ سُوجھا؟ اور ان کو ایسا مبارک خواب کیوں نہ آیا؟ پھر یہ بھی قابلِ غور امر ہے کہ خواب سے دین کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"اجماع اہلِ شرع است بر آنکہ ہیچ حکم از احکام شریعت بواقعات و منامات اُمّتیان ثابت نمے شود۔ (قرۃ العینین ص۳۲۶) | اہل شرع کا اس بات پر اجماع ہے کہ شریعت کے حکموں میں سے کوئی بھی حکم واقعات اور اُمّتیوں کے خوابوں سے ثابت نہیں ہو سکتا۔

غرضیکہ جو کام آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے نہیں کیا باوجودیکہ اس کا سبب موجود تھا، آج بھی اس کے کرنے کی مطلقاً کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ کسی صوفی کا کوئی قول و فعل اور خواب معتبر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی لکھتے ہیں، کہ "نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ، خلیفہ نظام الدین گفتہ است فعلِ مشائخ حجّت نہ باشد"۔ (البلاغ المبین ص۵۵ منسوب بشاہ ولی اللہ صاحبؒ۔ بعض حضرات نے ان کی کتاب ہونے کا انکار بھی کیا ہے)۔

بدنی اور مالی طریقہ پر ایصالِ ثواب کا حکم

جمہور اہل اسلام کا اس امر پر اتّفاق ہے کہ میّت کے لئے ایصالِ ثواب درست اور جائز ہے، خواہ بدنی عبادت ہو خواہ مالی ہو۔ البتہ بدنی عبادت میں (مثلاً نماز، روزہ اور تلاوتِ[علہ] قرآن کریم وغیرہ) حضرت

علہ مولانا عبد المجید صاحبؒ غیر مقلد تحریر فرماتے ہیں کہ "مروجہ ختم بدعت ہے۔ ہاں اگر خاموشی سے بلا ریا صدقہ کیا جائے خصوصاً صدقہ جلدیہ وغیرہ تو اس کا ثواب میّت کو پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح تلاوت قرآن کریم کا بھی انتہیٰ بلفظہٖ (اہلحدیث ۔۔۔ ۸ ستمبر ۱۹۴۹ء ص۶ کالم ع۳)۔ اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں:۔ "ولودان ایں تلاوت معمول از برائے میّت

امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ اختلاف کرتے ہیں (شرح فقہ اکبر ص۱۵۵ و کتاب الروح ص۱۴۵ وغیرہ) مگر اکثر حضرات شوافعؒ اور حضرات موالکؒ اس مسئلہ میں دیگر آئمہ کا ساتھ دیتے ہیں۔ حافظ ابن القیمؒ نے کتاب الروح از ص۱۴۵ تا ص۱۷۷ میں اس کی نقلی اور عقلی طور پر مبسوط بحث کی ہے۔ حق اور اقرب الی الصواب یہی بات ہے کہ بدنی اور مالی ہر قسم کی عبادت کا ثواب میت کو پہنچایا جا سکتا ہے مگر اس کیلئے چند بنیادی اور اصولی شرطیں ہیں۔ جب تک وہ نہ ہوں کوئی فائدہ نہیں ہوگا:

(۱) میت مؤمن اور مسلمان و صحیح العقیدہ ہو، گو کتنی ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، اور اسی طرح ایصالِ ثواب کرنے والا بھی مؤمن اور مسلمان ہو، ورنہ سب محنت رائیگاں ہوگی۔

(۲) ایسی کسی عبادت میں ریا، نام و نمود و شہرت اور اپنی مصنوعی عزت اور ناک کی حفاظت کا ہرگز سوال نہ ہو اور نہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کا خیال ہی دل میں ہو، اور خیرات منّ و اذٰی سے بھی پاک ہو۔

(۳) جو مال صدقہ و خیرات میں دیا جائے وہ حلال اور طیّب ہو خبیث، ناپاک اور غلول وغیرہ کا غیر طیّب مال ہرگز نہ ہو جیسا کہ قرآن کریم، صحیح احادیث اور اقوالِ حضرات فقہاء کرام سے یہ بالکل واضح ہے۔

(۴) جس مال کا صدقہ اور خیرات دی جائے اُس میں کوئی وارث غائب اور نابالغ بچہ نہ ہو، ورنہ اس کا صدقہ کرنا بلا خلاف حرام اور موجبِ عذابِ خداوندی ہے۔

(۵) جو قرآن کریم میّت کو پڑھ کر بخشا جائے وہ بلا معاوضہ اور بلا اُجرت پڑھا جائے۔

(۶) اپنی طرف سے دنوں کی اور خاص کیفیّتوں کی تعیین نہ کی جائے اور نہ کھانے کے اقسام میں یہ تعیین ہو۔

(۷) یہ کھانا صرف فقراء اور مساکین کو دیا جائے، برادری کو اور اغنیاء کو نہ کھلایا جائے۔

ان میں بعض ایسے اُمور ہیں جن میں کسی ادنٰی کلمہ گو کو بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، اور ان کا ثبوت قرآن کریم اور صحیح احادیث سے بخوبی واضح ہے۔ بعض دعاوی کے اختصاراً دلائل سُن لیجئے۔

قرآن کریم میں آتا ہے کہ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ کہ خبیث اور ناپاک اور ردی چیز اللہ تعالٰی کے راستہ میں خرچ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ حدیث شریف میں آتا ہے لا يقبل الله صدقة من غلول۔

(ترمذی ج ۱ صـ۲) یعنی اللہ تعالیٰ حرام مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا اور حضرت ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں :

ولو علم الفقیر انه من الحرام ودعا له وامّن المعطی کفرا۔ (شرح فقہ اکبر صـ۲۳۱ کانپوری)

یعنی اگر فقیر کو معلوم ہو کہ یہ مال جو مجھے دیا جارہا ہے حرام ہے اور اُس نے دینے والے کے حق میں دُعا کی اور دینے والے نے آمین کہی تو دونوں کافر ہو جائیں گے۔

اور یہی عبارت فتاوٰی عالمگیری ج ۲ صـ۲۹۹ میں بھی موجود ہے۔

امام قاضی خانؒ لکھتے ہیں :

وان اتخذ طعاما للفقراء کان حسنًا اذا کانوا بالغین فان کان فی الورثة صغیرًا لم یتخذوا ذٰلك من الترکة۔ (قاضی خاں ج ۴ صـ۸۷ نولکشور)

کہ اگر میت کے ترکہ سے فقراء کیلئے کھانا تیار کر لیا جائے تو اچھا ہوگا جبکہ وارث سب بالغ ہوں اور اگر وارثوں میں کوئی ایک بھی نابالغ ہو تو ترکہ سے یہ کھانا تیار نہیں کیا جا سکتا۔

اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :

حدیث جریرؓ یدل علی الکراهة ولا سیما اذا کان فی الورثة صغار او غائب (شامی ج ۱ صـ۸۴۱)

حضرت جریرؓ کی روایت کراہت پر دلالت کرتی ہے خصوصاً جبکہ وارثوں میں چھوٹے بچے یا کوئی وارث غائب ہو۔

اور ملا علی القاری لکھتے ہیں کہ :

بل صح عن جریرؓ کنا نعده من النیاحة وهو ظاهر فی التحریم قال الغزالی ویکره الاکل منه قلت هذا اذا لم یکن من مال الیتیم والغائب والا فهو حرام بلا خلاف۔ (مرقات علی المشکوٰة ج ۱ صـ۱۵۱)

بلکہ حضرت جریرؓ کی حدیث سے ثابت ہے کہ میت کے ہاں سے کھانے کو حضرات صحابہ کرامؓ نوحہ کی طرح سمجھتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کھانا حرام ہے۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ ایسا کھانا مکروہ ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کراہت اس وقت ہوگی، جب کہ میت کے وارثوں میں کوئی نابالغ یا غائب نہ ہو ورنہ یہ بلا اختلاف حرام ہوگا۔

ان عبارات سے یہ بات بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ میت کے وارثوں میں اگر سب ہی بالغ اور حاضر ہوں تب بھی ایسا کھانا مکروہ ہے بلکہ بظاہر حرام ہے، اور اگر میت کے وارثوں میں کوئی نابالغ یا کوئی وارث

غائب ہو تو بالاتفاق ایسا کھانا حرام ہوگا اور فقراء کے لئے بھی ایسا کھانا ناجائز ہوگا۔

خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں:

"غالباً ورثہ میں کوئی یتیم یا اور بچہ نابالغ ہوتا یا بعض ورثاء موجود نہیں ہوتے، نہ اُن سے اس کا اذن لیا جاتا جب تو یہ امر سخت حرام شدید پر متضمن ہوتا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔ بے شک جو لوگ یتیموں کے مالِ ناحق کھاتے ہیں، بلاشبہ وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور قریب ہے کہ جہنم کے گھراؤ میں جائیں گے۔ مالِ غیر میں بے اذن غیر تصرّف خود ناجائز ہے۔ قال اللہ تعالیٰ لَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ خصوصاً نابالغ کا مال ضائع کرنا جس کا اختیار نہ خود اُسے نہ اُس کے باپ نہ اس کے وصی کو۔ لان الولایۃ للنظر لا للضرر علی الخصوص اگر ان میں کوئی یتیم ہو تو آفت سخت تر ہے والعیاذ باللہ رب العٰلمین۔ ہاں اگر محتاجوں کے دینے کو کھانا پکوائیں تو حرج نہیں بلکہ خوب ہے بشرطیکہ یہ کوئی عاقل بالغ اپنے مالِ خاص سے کرے یا ترکہ سے کریں تو سب وارث موجود بالغ و نابالغ راضی ہوں" (احکام شریعت حصہ سوم ص۱۹۳)۔ خان صاحب کی یہ عبارت قابلِ داد ہے۔ مگر ان کا یہ مجددانہ مغالطہ قابلِ غور ہے کہ جب نابالغ کو اپنے مال کا باقرار خان صاحب خود بھی اختیار نہیں تو پھر بالغ و نابالغ راضی ہوں کا کیا مطلب ہے؟ نابالغ کی رضا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ فقہاء احناف نے تصریح کی ہے:

لا تجوز وصیۃ الصبی اذا لم یکن مراھقا عندنا۔ (قاضی خان ج ۴ ص۸۳۶)

یعنی نابالغ لڑکے کی وصیت ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے جبکہ مراہق نہ ہو۔

اور سراجیہ ص۱۴۷ میں ہے:

وصیۃ الصبی باطلۃ۔

نابالغ کی وصیت باطل ہے۔

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں:

"جب کوئی آدمی مر جاوے اور کوئی شخص اس کا عزیز و قریب اپنے خاص مال میں سے اس کے لئے فاتحہ کرے۔ اس میں کسی فقیہ و محدث کو کلام نہیں اور خاص میت کا مال اگر اس کام میں صرف کرنے لگیں تو اس میں

یہ شرط ہے کہ اس کے وارثوں میں کوئی نابالغ لڑکی یا لڑکا نہ ہو؛ اس لئے کہ ترکہ بعد مرنے مورث کے ملک وارثوں کا ہو جاتا ہے۔ پس اگر وارث بالغ ہیں تو وہ مال خاص ان کا ہو گیا۔ اگر کوئی وارث ان میں غائب نہیں، سب موجود ہیں یا کوئی غائب تھا اور اس نے اجازت دے دی تو اس صورت میں ان کو اختیار ہے جسقدر چاہیں میت کے لئے صرف کر دیں، اور اگر سب نابالغ ہیں تو ترکہ میت سب ان کی ملک ہو گیا۔ اس کا صرف کر دینا میت کے ایصالِ ثواب میں جائز نہیں، نہ کپڑا، نہ کھانا، نہ روپیہ نہ پیسہ۔ فقط تجہیز و تکفین میں جو اُٹھے وہی درست ہے اور بس۔ اور اگر بعضے وارث نابالغ ہیں تب بھی نابالغوں کا حصّہ کل اشیاء ترکہ میں مشترک ہے اس کا صرف کرنا بھی ایصالِ ثواب کے لئے جائز نہیں الخ"۔ (انوار ساطعہ ص۱۲۵)

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

"نیز اگر میت کی فاتحہ میت کے ترکہ سے کی ہو تو خیال رہے کہ غائب وارث یا نابالغ کے حصّے سے فاتحہ نہ کی جاوے یعنی اوّلاً مالِ میت تقسیم ہو جائے، پھر کوئی بالغ وارث اپنے حصّہ سے یہ امورِ خیر کرے۔ ورنہ یہ کھانا کسی کو بھی جائز نہ ہو گا کہ بغیر مالک کی اجازت یا بچہ کا مال کھانا ناجائز ہے۔ یہ ضرور خیال رہے"۔ (جاء الحق ص۲۵۶)

مگر مفتی صاحب بھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک فیصدی تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں وغیرہ بھی شاید بمشکل ایسا ہو جس میں شرعی طور پر مالِ ترکہ تقسیم ہو چکنے کے بعد بالغ وارث صرف اپنے حصّہ سے یہ صدقہ کرتے ہوں۔ اور کتنے مولوی، حافظ اور پیر ہیں جو تیجہ، ساتواں اور دسواں وغیرہ مجالس میں شریک ہونے سے قبل یہ سوال کر لیتے ہیں، کہ اس ترکہ میں کوئی نابالغ یا غائب وارث تو شامل نہیں اور کیا اس کی شرعی تقسیم ہو چکی ہے یا نہیں؟

تلاوتِ قرآنِ کریم پر اُجرت لینا

قرآنِ کریم کا پڑھنا ایک بہت عمدہ عبادت ہے، اور پڑھ کر اس کا ثواب میت کو بخشا جا سکتا ہے بشرطیکہ ایصالِ ثواب کے لئے جو قرآن کریم پڑھا گیا ہو اُس پر اُجرت نہ لی گئی ہو، خواہ اُجرت پہلے

طے کی گئی ہو یا طے نہ کی گئی ہو مگر عرف اور رواج سے یہ معلوم ہو کہ کچھ نہ کچھ اُجرت ضرور ملے گی لان المعھود کالمشروط، اور فقہاء احناف نے اس کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ تاج الشریعت محمود بن احمد الحنفیؒ (المتوفی ۶۷۳ھ) شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں :

ان القراٰن لا یستحق بالاجرۃ الثواب لا للمیّت ولا للقاری (بحوالہ انوارِ ساطعہ ص ۱۰۱)

کہ جو قرآن کریم اُجرت پر پڑھا جاتا ہے اُس کا ثواب نہ تو میّت کو پہنچتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو۔

اور علّامہ عینی الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ :

الاٰخذ والمعطی اٰثمان، فالحاصل ان ماشاع فی زماننا من قرأۃ الاجزاء بالاجرۃ لایجوز۔ (بنایہ شرح ہدایہ ج ۳ ص ۶۵۵)

قرآن کریم کی تلاوت پر اُجرت لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہوتے ہیں۔ حاصل یہ کہ ہمارے زمانہ میں جو قرآنِ کریم کے پاروں کا اُجرت کے ساتھ پڑھنا رائج ہو چکا ہے، وہ جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی پوری تشریح علامہ شامیؒ نے کی ہے، فلیراجع۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ تلاوتِ قرآنِ کریم پر اُجرت لینے کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

صورتِ اوّل آنکہ ثواب قرآن خواندہ خود را بعوض مبلغ کذا بدست کسے بفروشند ایں صورت محض باطل است باجماع اہلِ سنّت الیٰ ان قال صورتِ دوم آنکہ شخصے را برائے ختم نمودنِ قرآن بمزدوری بگیرند و ثوابِ آں ختم بمستاجر برسد و ایں صورت نزد حنفیہ جائز نیست و نزد شافعیہ طولے و تفصیلے دارد" (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۸)

اور مولانا عبد الحی صاحبؒ نے حضرات فقہاء کرامؒ کے متعدّد حوالوں سے یہ امر ثابت کیا ہے کہ اُجرت لے کر قرآن کریم پڑھنا اور تسبیح و تہلیل کرنا باطل ہے۔ نہ اس کا ثواب میّت کو پہنچتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو۔ (دیکھئے مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲ ص ۸۷)۔

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ :

واما قرأۃ القراٰن واھدائھا لہ تطوعا

قرآن کریم کا اُجرت کے بغیر پڑھ کر بطور تبرع کے اس کا ثواب

بغیر اُجرۃ فھذا یصل الیہ کمایصل ثواب الصوم والحج ۔ (کتاب الروح ص۱۷۵)	میت کو بخشنا صحیح ہے اور اس کا ثواب اس کو پہنچتا ہے جیساکہ روزہ اور حج کا ثواب اس کو پہنچتا ہے ۔

حضرت ملّا علی القاریؒ لکھتے ہیں کہ :

ثم قراٴۃ القراٰن واھداٴ ثوابہ تطوعا بغیر اُجرۃ یصل الیہ ۔ (شرح فقہ اکبر ص۱۶۰ طبع کانپور)	قرآن مجید کا بغیر اُجرت کے محض للہ پڑھ کر اس کا ثواب میت کو ہدیہ کرنا درست ہے ۔

علّامہ صدرالدین علی بن محمد الاذرعی الدمشقی الحنفیؒ (المتوفی ۷۴۶ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ :

واما استیجار قوم یقرأون القراٰن ویھدونہ للمیّت فھذا لم یفعلہ احد من السلف ولا امر بہ احد من ائمۃ الدین ولا رخص فیہ والاستیجار عن نفس التلاوۃ غیر جائز بلا خلاف ۔ (شرح عقیدۃ الطحاویہ ص۳۸۶ طبع مصر)	اُجرت پر قرآنِ کریم کی تلاوت کرکے اس کا ثواب میّت کو ہدیہ کرنا، تو سلفؒ میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا اور حضرات ائمہ دینؒ میں سے کسی نے اس کا حکم اور اجازت دی ہے۔ نفسِ تلاوت پر اُجرت ناجائز ہے ۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے ۔

بجا معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب بریلوی کا حوالہ نقل کر دیا جائے تاکہ اس پر رجسٹری ہو جائے ۔

مسئلہ : ...... بعض لوگ بعد دفن کر دینے میّت کے حافظ کو اس کی قبر پر واسطے تلاوت سوم تک یا کچھ کم و بیش بٹھاتے ہیں اور وہ حافظ اپنی اُجرت لیتے ہیں ۔ پس اس طرح کی اُجرت دے کر قبروں پر پڑھوانا چاہیئے یا نہیں ؟ بیّنوا توجروا ۔

الجواب : "تلاوتِ قرآنِ عظیم پر اُجرت لینا دینا حرام ہے اور حرام پر استحقاق عذاب ہے ، نہ کہ ثواب پہنچے ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ حافظ کو اتنے دنوں کے لئے معیّن داموں پر کام کاج کیلئے نوکر رکھ لیں ۔ پھر اُس سے کہیں ایک کام یہ کرو کہ اتنی دیر قبر پر پڑھ آیا کرو ، یہ جائز ہے ۔" (احکامِ شریعت حصّہ اوّل ص۶۳)

مگر خان صاحب ہی از راہِ کرم یہ فرمائیں کہ یہ طریقہ کون کرتا ہے ؟ اور کہاں ہوتا ہے ؟

مولوی عبد السّمیع صاحب لکھتے ہیں : "اگر حافظوں کو مزدوری دے کر قرآن پڑھوادیں یہ البتہ مکروہ ہے ۔ اس کی تصدیق کتبِ فقہ میں موجود ہے الخ ۔ (انوارِ ساطعہ ص۱۰۷) ۔ جوہرہ نیّرہ ج ۱ ص۲۷۳ میں ہے

"لا یجوز ھو المختار" یہ جائز نہیں ہے یہی مختار ہے۔ بہار شریعت صہ ۱۳۹ ج ۴ میں ہے۔ سوم وغیرہ کے موقع پر اجرت پر قرآن پڑھوانا ناجائز ہے۔ دینے والا لینے والا دونوں گنہگار۔ اھ اور صہ ۱۶۹ ج ۴ میں ہے۔ میت کے گھر والے تیجہ وغیرہ کے دن دعوت کریں تو ناجائز و بدعت قبیحہ ہے الخ۔ رسالہ رضوان صہ ۶۳ بابت ماہ اگست و ستمبر ۱۹۷۸ء میں ہے۔ میت کے گھر کا کھانا ناجائز و ممنوع ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی صاحبؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

"پس جو کچھ ملّاؤں کو دیا جاتا ہے وہ اجرت ان کے پڑھنے کی ہے، اور جو پڑھائی کہ اجرت پر ہوتی ہے اس کا ثواب نہ پڑھنے والے کو ہوتا ہے اور نہ مُردہ کو۔ لہٰذا یہ فعل ان کا باطل اور لینا دینا دونوں حرام اور موجب ثواب کا نہیں بلکہ گناہ ہے۔ مُردہ کو اس کا ثواب نہیں ہوتا ہے اور دینے والے اور لینے والے دونوں گنہگار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کام کا ترک بھی واجب ہے۔ اگر لوجہ اللہ ثواب پہنچانا منظور ہے تو ہر شخص اپنے مکان پر پڑھ کر ثواب پہنچا دے اور تیسرے دن کا کیوں انتظار کیا جاوے نفس ایصالِ ثواب کوئی منع نہیں کرتا۔ اگر بلا تعین ہو۔ مگر ان قیود و خصوصیات کے ساتھ بدعت بھی ہے اور ثواب بھی نہیں پہنچتا۔" (فتاوٰی رشیدیہ صہ ۸۴ ج ۲)

الغرض اس نکتہ پر خان صاحب بریلوی اور مولانا گنگوہی صاحبؒ دونوں متفق ہیں کہ ایصالِ ثواب کے لئے جو قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہے اُس پر اُجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں اور ثواب کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اس پر استحقاق عذاب ہے۔ اب جو لوگ اس مسئلہ میں علماءِ دیوبند کو کوستے ہیں، تو اُن کو بغور سوچ لینا چاہیئے کہ طعن کس پر ہوگا؟ ؎

یوں نظر دوڑے نہ برچھی تان کر   اپنا بیگانہ ذرا پہچان کر

نوٹ ضروری | قرآن کریم کی تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کے معاوضہ میں اُجرت اور تنخواہ لینا نیز مؤذن، امام و خطیب اور قاضی کے لئے اُجرت و تنخواہ لینا جائز ہے۔ حضرات خلفاء راشدینؓ نے اپنے اپنے دور میں ان حضرات کو وظیفے اور تنخواہیں دیں۔ اگر یہ کار روائی ناجائز ہوتی تو یقیناً حضرات خلفاء راشدینؓ اس کا کبھی بھی ارتکاب نہ کرتے۔ اور حضرات خلفاء راشدینؓ کا عمل اور سُنّت بفحوائے حدیث علیکم بسنّتی وسنۃ الخلفاء الراشدین (الحدیث) اُمّت کے لئے مشعلِ راہ ہے جس سے ان کیلئے کوئی مخلص نہیں ہے۔ امام ابو الفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی الحنبلیؒ (المتوفّٰی ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

ان عمرؓ بن الخطاب وعثمانؓ بن عفان کانا   حضرت عمرؓ بن الخطاب اور عثمانؓ بن عفان مؤذنوں

یرزقان المؤذّنین والائمّة والمعلّمین ۔ اماموں اور معلّموں کو وظائف اور تنخواہیں دیا کرتے تھے ۔ (سیرت العمرین لابن جوزیؒ ص۱۶۵)

امام جمال الدّین ابو محمد عبداللہ بن یوسف الزیلعی الحنفیؒ (المتوفی ۷۶۲ھ) نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ معلّمین کو وظیفہ دیا کرتے تھے (نصب الرّایہ ج ۴ ص۱۳۷) ۔ حضرات فقہاء کرام کے وظائف کے متعلّق علّامہ ابن جوزیؒ نے تفصیلات نقل کی ہیں اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ کس فقیہ کو کس شہر میں تعلیمِ فقہ پر مامور کیا گیا تھا (سیرت العمرین ص۱۶۸) ۔ اور نظام العالم والامم ج ۲ ص۱۸۳ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قضاۃ (یعنی شرعی طور پر جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والے قاضیوں اور ججوں) کے لئے بھی وظائف اور تنخواہیں مقرر کی تھیں ۔ اور کتاب الخراج لقاضی ابی یوسفؒ میں اس کی مزید تشریح موجود ہے اسی میں ملاحظہ فرمالیں ۔

۔ امام ابو عبید قاسمؒ بن سلّامؒ (المتوفی ۲۲۴ھ) رقمطراز ہیں کہ :

ان عمرؓ بن الخطاب کتب الیٰ بعض عُمّاله ان اعط النّاس علیٰ تعلم القراٰن (کتاب الاموال ص۲۶۱) حضرت عمرؓ نے اپنے بعض گورنروں کو لکھا کہ قرآن کریم پڑھنے والوں کا وظیفہ مقرر کرو ۔

اس پر بعض عُمّال نے یہ لکھا کہ بعض لوگوں نے قرآن کریم سیکھنے کی رغبت اور شوق کے بغیر محض وظیفہ حاصل کرنے کی خاطر طالب علم بننا اختیار کر لیا ہے ، مگر حضرت عمرؓ نے اس کے باوجود ان لوگوں کا وظیفہ بند نہیں کیا ۔

اور علّامہ زیلعیؒ باحوالہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

ان عمرؓ بن الخطاب کتب الیٰ بعض عُمّاله ان اعط النّاس علیٰ تعلیم القراٰن (نصب الرّایہ ج ۴ ص۱۳۷) حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عاملوں کو لکھا کہ جو لوگ قرآنِ کریم کی تعلیم دیتے اور پڑھاتے ہیں ان کو وظیفہ دو ۔

خلیفۂ راشد حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے حضرت یزیدؒ بن ابی مالکؒ اور حضرت حارثؒ بن یمجد اشعریؒ کو بھیجا کہ وہ دیہات میں لوگوں کو دین اور فقہ سکھائیں اور ان کے لئے روزینہ مقرر کیا ۔ یزیدؒ بن ابی مالکؒ نے تو قبول کر لیا مگر حارثؒ نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا (کتاب الاموال ص۲۶۶) بظاہر ان کی مالی حالت اچھی اور مضبوط تھی اس لئے انہوں نے بلامعاوضہ ہی یہ خدمت انجام دی جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بیت المال سے وظائف لیا کرتے تھے لیکن حضرت عثمانؓ چونکہ کافی مال دار اور غنی تھے اس لئے انہوں نے

زمانۂ خلافت میں اپنی تنخواہ کا بیت المال پر بالکل بوجھ نہیں ڈالا۔

قاضی ابوبکر محمدؒ بن عبداللہؒ ابن العربی المالکیؒ (المتوفی ۵۴۳ھ) اس مسئلہ پر بحث اور اختلاف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اذان، نماز، قضا اور تمام اعمالِ دینیہ پر اُجرت لینا جائز ہے، کیونکہ امیر المؤمنین اور خلیفہ ان تمام امور پر اُجرت لیتا ہے (بحوالہ نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۶ و تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۱۸۴) - حضرت امام نووی الشافعیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث واضربوا لی بسھم (الحدیث) میں تصریح ہے کہ رُقیہ دَم اور جھاڑ پھونک پر سورۂ فاتحہ اور ذکر پڑھ کر اُجرت لینا جائز ہے اور یہ بالکل حلال ہے اس میں کوئی کراہت نہیں - اور اسی طرح تعلیمِ قرآن کریم پر بھی اُجرت لینا جائز ہے - اور یہی حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ، حضرت امام اسحاقؒ، حضرت امام ابو ثورؒ اور دیگر حضرات سلف صالحینؒ اور ان کے بعد آنے والے حضرات کا مسلک ہے - اور حضرت امام ابو حنیفہؒ نے تعلیمِ قرآن کریم پر اُجرت لینا منع کیا ہے البتہ رُقیہ پر اُجرت لینے کے جواز کے وہ بھی قائل ہیں (شرح مسلم ج ۲ ص ۲۲۴) -

ان تمام ٹھوس حوالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ امام مسجد، مؤذن، قرآن کریم کی تعلیم دینے والا مُعلّم اور قاری، فقہ اور دین کی تعلیم دینے والا مدرس اور اسی طرح فصلِ خصومات کرنے والا قاضی اور جج وظیفہ اُجرت اور تنخواہ لے سکتے ہیں اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ جیسے حضرات خلفاء راشدینؓ کی طرف سے یہ وظائف اور تنخواہیں ان کے لئے مقرر کی گئی تھیں اور اسلامی مملکت میں بیت المال اس بوجھ کا متحمل تھا - جہاں بیت المال نہ ہو (جیسا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے اس پُرفتن دَور میں نہیں ہے) تو وہاں اہلِ اسلام پر لازم ہے کہ وہ یہ بوجھ اُٹھائیں تاکہ تبلیغِ دین کا سلسلہ جاری رہے اور اس طریقہ سے دین کا احیاء ہوتا رہے ورنہ ناموافق ہواؤں میں دین کا یہ چراغ بجھ جائے گا - خدا تعالیٰ اس کو روشن رکھے اور بجھنے نہ دے بے دینی کی آندھیاں تو ہر طرف سے اُٹھ رہی ہیں ؎

ہواؤں کا رُخ بتا رہا ہے ضرور طوفان آ رہا ہے　　　نگاہ رکھنا سفینہ والو اُٹھی ہیں موجیں کدھر سے پہلے

مسئلہ اُجرت اور حضرت امام ابو حنیفہؒ

حضرت امام نوویؒ کا حوالہ اُوپر گذر چکا ہے اور دیگر بہت سے حضرات فقہاء کرامؒ نے امام الائمہ حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ (المتوفی ۱۵۰ھ) سے تعلیمِ قرآن کریم پر اُجرت

لینا مکروہ اور ممنوع نقل کیا ہے۔ انہوں نے کمال ورع اور تقویٰ کی بنا پر ان دینی اُمور پر اُجرت لینا منع کیا؟ یا مال دار اور غنی لوگوں کے لئے انہوں نے اُجرت لینا مکروہ کہا؟ یا اس لئے کہ ان دینی کاموں پر اُجرت لینے کو مقصود بالذّات سمجھ کر دنیا بٹورنے کا ذریعہ ہی نہ بنالیا جائے؟ اور یا اس لئے کہ خیرالقرون میں نادار اور مفلس خُدّامِ دین کو بیت المال سے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے ملتے، اس لئے ان لوگوں کو الگ اُجرت اور تنخواہ لینا مکروہ سمجھا؟ الغرض حضرت امام صاحبؒ کے اس فتوٰی کی بنیاد کئی اُمور پر ہو سکتی ہے اور انہی کے فتوٰی پر صاد کہتے ہوئے حضرات متقدّمین فقہاء احنافؒ نے اس اُجرت کو مکروہ فرمایا۔ لیکن جب بیت المال کا نظام درہم برہم ہوگیا تو حضرات فقہاء احنافؒ میں متأخرین حضرات کو زمانہ کی اہم ضرورت کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اور پھر انہوں نے متّفقہ طور پر جواز کا فتوٰی دیا۔ چنانچہ امام قاضی خان الحنفیؒ فرماتے ہیں کہ:

انما کرہ المتقدمون الاستیجار لتعلیم القرآن وکرھوا اخذ الاجر علیٰ ذٰلک لانہ کان للمعلمین عطیات فی بیت المال فی ذٰلک الزمان وکان لھم زیادۃ رغبۃ فی امر الدّین واقامۃ الحسبۃ وفی زماننا انقطعت عطیاتھم وانتقصت رغائب الناس فی امر الاٰخرۃ فلو اشتغلوا بالتعلیم بالحاجۃ الیٰ مصالح المعاش لاختل معاشھم قلنا بصحۃ الاجارۃ ووجوب الاجرۃ للمعلم بحیث لو امتنع الوالد عن اعطاء الاجر حُبس فیہ اھ

(فتاوٰی قاضی خان ج ۳ ص۳ طبع نولکشور لکھنؤ)

بلاشبہ حضرات متقدّمینؒ نے تعلیمِ قرآن کریم پر کسی کو اُجرت دیکر ملازم رکھنا مکروہ سمجھا ہے اور اس پر اُجرت لینا بھی مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں مُعلّمین کے لئے بیت المال میں عطیات مقرر ہوتے تھے نیز اُمورِ دین اور لِلّٰہ فی اللّٰہ کام کرنے میں ان حضرات کی رغبت زیادہ تھی، اور ہمارے زمانہ میں عطیّات بھی منقطع ہو چکے ہیں اور آخرت کے معاملہ میں لوگوں کی رغبتیں بھی کم ہو چکی ہیں۔ سو اگر ایسے لوگ ناداری کی حالت میں تعلیم کا شُغل جاری رکھتے ہوئے روزی کمانے میں مصروف ہوئے تو ان کی کمائی میں سخت خلل پڑے گا۔ اس لئے ہم نے یہ کہا کہ یہ اجارہ صحیح ہے اور معلّم کے لئے اُجرت واجب ہے۔ اب اگر تعلیم پانے والے شاگرد کا والد (اور موجودہ اصطلاح میں مدرسہ، ادارہ اور مہتمم) معلّم کو تنخواہ دینے سے گریز کرے تو اُسے گرفتار کیا جائے گا۔

حضرات فقہاء احنافؒ میں فقیہ النفس ہونے کے لحاظ سے جو مقام امام قاضی خانؒ کا ہے، وہ اہلِ علم

حضرات سے مخفی نہیں ہے۔

علامہ ابن النجیم الحنفیؒ (الملقب بابی حنیفۃ الثانی) فرماتے ہیں:

اما علی المختار للفتویٰ فی زماننا فیجوز اخذ الاجر للامام والمؤذن والمعلم والمفتی اھ (البحر الرائق ج ۱ ص ۲۵۴) — بہرحال ہمارے زمانہ میں فتویٰ کے لئے مختار قول یہ ہے کہ امام اور مؤذن اور معلم اور مفتی کو اجرت لینا جائز ہے۔

اور صاحبِ ہدایہ بھی یہی تصریح فرماتے ہیں کہ اب فتویٰ جواز پر ہے (ہدایہ ج ۴ ص ۱۵) ۔ اور اسی طرح علامہ بدرالدین العینی الحنفیؒ صراحت فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو بنایہ شرح ہدایہ ج ۳ ص ۶۵۵) ۔

حضرات فقہاء کرام کی ان واضح تصریحات کے بعد مطلقاً حاجت اور ضرورت نہیں کہ ہم اُجرت لینے کی ممانعت کے دلائل کا تذکرہ کر کے پھر ان کے تفصیلی جوابات عرض کریں۔ صرف اجمالی طور پر یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ جن بعض آیات اور احادیث سے عدمِ جوازِ اُجرت بر تعلیم قرآن کریم پر استدلال کیا گیا ہے وہ ممانعت میں نص اور متعین المعنیٰ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو محال تھا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ اور حضرات ائمہ ثلاثہؒ اور جمہور علماء کرامؒ اور متاخرین حضرات فقہاء احنافؒ اس کے خلاف فتویٰ صادر کرتے کیونکہ قرآن کریم کی وہ آیات اور احادیث ان کے پیش نظر بھی تھیں اور احادیث اس سلسلہ کی اکثر و بیشتر ضعیف ہیں۔ اور اگر بعض صحیح ہیں تو حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ نے ان کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے (ملاحظہ ہو سراج المنیر ج ۳ ص ۳۲۲ للعزیزی)

فائدہ: کسی بیمار اور مصیبت زدہ وغیرہ پر قرآن کریم پڑھ کر یا تعویذ لکھ کر اُجرت لینا جائز ہے۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵۴ وغیرہ کی یہ روایت ان احق ما اخذتم علیہ اجراً کتاب اللہ (او کما قال کہ زیادہ مناسب وہ چیز جس پر تم اُجرت لو، کتاب اللہ ہے) اس کی دلیل ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس سے رُقیہ اور جھاڑ پھونک وغیرہ پر اُجرت لینا مراد ہے، ایصالِ ثواب پر اُجرت لینا مراد نہیں ہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ لکھتے ہیں:

المراد الرقیۃ لا التلاوۃ (فتاویٰ ج ۲ ص ۱۹۸)۔ — اس سے مراد جھاڑ پھونک ہے۔ تلاوت نہیں ہے۔

علامہ عزیزیؒ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ جھاڑ پھونک پر قرآن کریم کی تلاوت پر اُجرت لینا جائز ہے۔

(السراج المنیر ج ۱ ص ۴۸۵)

ایصالِ ثواب کے لئے دِنوں کی تعیین

میّت کے لئے دعا اور استغفار کرنا اور صدقہ و خیرات دینا اور بلا اُجرت کے قرآن کریم پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا، اسی طرح نفلی نماز و روزہ اور حج وغیرہ سے میّت کو ثواب پہنچانا جائز اور صحیح ہے۔ لیکن ایصالِ ثواب کیلئے شریعتِ حقّہ نے دنوں اور تاریخوں کی کوئی تعیین و تخصیص نہیں کی ہے۔ اور پہلے باحوالہ یہ گذر چکا ہے کہ اپنی طرف سے ایسی تعیین کرنا بدعت ہے۔ دلائلِ اربعہ میں سے کوئی دلیل اس پر دال نہیں ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین ضروری ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسم مسلمانوں نے اہلِ ہنود سے لی ہے، کیونکہ اُن کے نزدیک ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین ہے۔ چنانچہ مشہور مؤرّخ علّامہ بیرونی (المتوفی ۴۳۰ھ) لکھتے ہیں کہ اہلِ ہنود کے نزدیک جو حقوق میّت کے وارث پر عائد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ضیافت کرنا اور یومِ وفات سے گیارھویں اور پندرھویں روز کھانا کھلانا، اس میں ہر ماہ کی چھٹی تاریخ کو فضیلت ہے۔ اسی طرح اختتامِ سال پر بھی کھانا کھلانا ضروری ہے۔ نو (۹) دن تک اپنے گھر کے سامنے طعام پختہ و کوزہ آب رکھیں ورنہ میّت کی رُوح ناراض ہوگی اور بھوک و پیاس کی حالت میں گھر کے ارد گرد پھرتی رہے گی۔ پھر عین دسویں دن میّت کے نام پر بہت سا کھانا تیار کر کے دیا جائے اور آبِ خنک دیا جائے اور اسی طرح گیارھویں تاریخ کو بھی۔ نیز لکھا ہے کہ ماہ پوس میں وہ حلوا پکا کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ برہمن کے کھانے پینے کے برتن بالکل علیحدہ ہوں (کتاب الہند ص۲۷۰ و ص۲۸۲ محصلہ)۔ اور یہی کچھ برائے نام مسلمان کرتے ہیں کہ حلوا اور پانی بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور مُلّاجی کے برتن بھی الگ ہوتے ہیں اور دنوں کی تعیین بھی کی جاتی ہے خصوصاً دسویں گیارھویں اور اختتامِ سال کے بعد سالانہ عُرس۔ مشہور نومسلم عالم (جو پہلے پنڈت تھے) مولانا عبید اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ــــ " برہمن کے مرنے کے بعد گیارھواں دن اور کھتری کے مرنے کے بعد تیرھواں دن اور دلیش یعنی بنئے وغیرہ کے مرنے کے بعد پندرھواں یا سولھواں دن اور شودر یعنی بالدھی وغیرہ کے مرنے کے بعد تیسواں یا اکتیسواں دن مقرر ہے۔ ازاں جملہ ایک چھ ماہی کا دن ہے یعنی مرنے کے بعد چھ مہینے، ازاں جملہ برسی کا دن ہے اور ایک دن گائے کو بھی کھلاتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک دن سدھ کا ہے مُردے کے مر جانے سے چار برس

پیچھے، ازاں جملہ اسوج کے مہینے کے نصف اوّل میں ہر سال اپنے بزرگوں کو ثواب پہنچاتے ہیں لیکن جس تاریخ میں کوئی مرا، اُس تاریخ میں ثواب پہنچانا ضرور جانتے ہیں اور کھانے کے ثواب پہنچانے کا نام سرادھ ہے، اور جب سرادھ کا کھانا تیار ہو جائے تو اوّل اس پر پنڈت کو بُلوا کر کچھ بید پڑھواتے ہیں۔ جو پنڈت اس کھانے پر بید پڑھتا ہے وہ ان کی زبان میں ایھشر من کہلاتا ہے، اور اسی طرح اور بھی دن مقرر ہیں"۔ (بلفظہٖ تحفۃ الہند ص۹۱)۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ (المتوفی ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں خاص یہ رسم سیوم کی ہے۔ اور کسی ولایت میں کوئی جانتا بھی نہیں سو یہ ہنود کے تیجہ کو دیکھ کر وضع ہوا ہے (البراہین القاطعہ ص۱۱۱) اور یہی کچھ کلمہ گو مسلمان کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ پنڈت کی جگہ ختمی مُلّا نے لے لی ہے اور کھانے پر بید کی جگہ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ افسوس اور صد افسوس کہ ان تمام غیر اسلامی رسموں نے اسلامی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس پر تنقید کرنا گویا اسلام پر تنقید کرنا ہے اور یہ سب کچھ ہندوستان میں آکر ہوا فوا اسفا! ؏ وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں

میّت کے گھر اجتماع اور کھانا پکنے کا بیان

حدیث اور فقہ کی عبارات اس پر شاہد ہیں کہ جب کسی کی وفات ہو جائے تو اس کے گھر والے چونکہ صدمہ میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے اہلِ محلہ اور رشتہ دار اہلِ میّت کا کھانا تیار کریں اور جو نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو سکا ہو وہ تعزیت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن میت کے گھر اجتماع اور اہلِ میّت کا لوگوں کیلئے کھانا تیار کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے اور بہت سے علاقے اس قبیح حرکت کا شکار ہو کر مقروض ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات سود پر قرض لیا جاتا ہے اور اس طرح وارثوں کا اور خصوصًا یتیموں کا مال برباد کیا جاتا ہے۔

حضرت جریرؓ بن عبداللہ (المتوفی ۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ:

كُنّا نرى الاجتماع الى اهل الميّت وصنعة الطعام من النياحة (ابن ماجہ ص۱۱۶ و مسند احمد ج۲ ص۲۰۴)

ہم (یعنی حضرات صحابۂ کرام) میّت کے گھر جمع ہونے کو اور میّت کے گھر کھانا تیار کرنے کو نوحہ سمجھتے تھے۔

اور منتقی الاخبار صـ۱۲۲ میں وصنعة الطعام بعد دفنه من النیاحة کے الفاظ آئے ہیں۔

مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ میت پر آواز کے ساتھ رونا، بین اور نوحہ کرنا اہلِ جاہلیت کا کام ہے اور نوحہ کرنا جمہور سلف وخلف کے نزدیک حرام[1] ہے۔ اسی طرح میت کے گھر کا کھانا بھی سمجھا جائے۔ یہ روایت دو طریق سے مروی ہے۔ علّامہ ہیثمیؒ ایک سند کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ بخاری کی شرط پر صحیح ہے اور دوسری کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے (مجمع الزوائد ج صـ)۔ حافظ ابنِ ہمامؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (فتح القدیر ج ۱ صـ۴۷۳)۔ علّامہ حلبیؒ لکھتے ہیں۔ باسنادٍ صحیح (کبیری صـ۶۰۹)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کے گھر اجتماع کرنا اور وہاں کھانا تناول کرنا حضرات صحابہ کرامؓ کے نزدیک نوحہ جیسا ایک جُرم تھا اور اس امر پر ان کا اجماع واتفاق رہا ہے۔ ضرورت تو نہیں مگر حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارات بھی ملاحظہ کر لیجیے تاکہ یہ مسئلہ بھی بیّن طور پر سامنے آجائے۔

علّامہ ابن امیر الحاج المالکیؒ (المتوفّٰی ۷۳۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

اما اصلاح اهل المیّت طعامًا وجمع الناس فلم ینقل فیه شیٔ وهو بدعة غیر مستحب (مدخل ج۳ صـ۲۷۵)	اہلِ میت کا کھانا تیار کرنا اور لوگوں کا جمع ہونا اسمیں کوئی چیز منقول نہیں ہے بلکہ یہ بدعتِ غیر مستحبہ ہے۔

نیز لکھتے ہیں کہ:

مما احدثه بعضهم من فعل الثالث للمیّت وعملهم الاطعمة فیه حتّٰی صار عندهم کانه امر معمول به (مدخل ج۳ صـ۲۷۵)	بعض لوگوں نے یہ بدعت نکالی ہے کہ میت کے تیجہ پر طعام تیار کرتے ہیں، اور یہ اُن کے نزدیک معمول کام بن گیا ہے۔

امام ابنِ حجر مکّیؒ شافعیؒ سے سوال کیا گیا کہ:

عمّا یعمل یوم ثالث من موته من تهئیة اکل و اطعامه للفقراء وغیرهم وعما یعمل یوم السابع الخ	میت کے تیسرے دن فقراء وغیرہ کیلئے جو کھانا تیار کیا جاتا ہے اور اسی طرح ساتویں دن، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

[1] امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نوحہ کی حرمت پر اجماع ہے (شرح مسلم ج ۱ صـ۳۰۳)

جمیع مایفعل ممّا ذکر فی السّوال من البدع المذمومة (فتاویٰ کبریٰ ج ۲ ص۷)

سوال میں جتنی چیزیں ذکر کی گئی ہیں، وہ سب کی سب بدعاتِ مذمومہ ہیں۔

علامہ محمد بن محمد منبجی حنبلیؒ (المتوفی ۷۸۵ھ تسلیۃ المصائب ص۹۹ میں) اور امام شمس الدین بن قدامہ حنبلیؒ (المتوفی ۶۸۲ھ شرح مقنع للکبیر ج ۲ ص۴۲۶ میں) اور امام موفق الدین بن قدامہ حنبلیؒ (المتوفی سنہ ۶۲۰ھ) لکھتے ہیں، واللفظ لہ:

فاما صنع اھل المیّت طعاما للناس فمکروہ لان فیہ زیادۃ علی مصیبتھم و شغلا لھم الیٰ شغلھم وتشبیھا بصنع اھل الجاھلیۃ (مغنی ج ۲ ص۴۱۳)

کہ اہلِ میّت جو لوگوں کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں وہ مکروہ ہے کیونکہ اس میں اہلِ میّت کو مزید تکلیف اور شغل میں مبتلا کرنا ہے۔ نیز اس سے مشرکین اہلِ جاہلیت کے ساتھ مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔

علامہ ابنِ عابدین شامیؒ لکھتے ہیں کہ:

مذھبنا و مذھب غیرنا کالشّافعیۃ والحنابلۃ الخ (ج ۱ ص۸۴۱)

ہمارا اور حضرات شوافعؒ اور حضرات حنابلہؒ کا یہی مذہب ہے۔

چونکہ ہمیں ایک ایسے طبقہ سے واسطہ پڑ چکا ہے جو خود کو حنفی کہلاتا ہے اسلئے ہم فقہ حنفی کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں تاکہ ان کو مسلّم حضرات فقہاء احنافؒ کے نظریہ کو سامنے رکھ کر غور و فکر کا موقع مل سکے۔

فقہاء احناف کثّر اللہ تعالیٰ سوادہم کے نزدیک میّت کے گھر سے طعام کھانا، تیجہ، ساتواں اور چالیسواں وغیرہ کرنا۔ | جس طرح دوسرے مسالک کے حضرات فقہاء کرامؒ نے ان بدعات کا انکار کیا ہے، اسی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر حضرات فقہاء احنافؒ نے ان کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ طاہرؒ بن احمد الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یباح اتخاذ الضیافۃ عند ثلاثۃ ایام لان الضیافۃ یتخذ عند السرور (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۲ ص۳۴۲)

کہ اہلِ میّت کی طرف سے تین دن تک ضیافت مباح نہیں ہے کیونکہ ضیافت خوشی کے موقع پر ہوا کرتی ہے۔

صوبۂ سرحد اور اسی طرح بعض دیگر علاقوں میں یہ بدعت رائج ہے کہ میّت کو دفن کر چکنے کے بعد پہلی رات

عموماً سب گاؤں کی بلا امتیاز روٹی پکائی جاتی ہے ۔ جس کو وہ لوگ اپنی زبان میں تماشاں ، ہشومہ اور ٹمٹی وغیرہ کہتے ہیں ۔ اس میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر لوگوں کو چاول گھی اور کھانڈ سے تواضع کی جاتی ہے ۔ اس عبارت میں اسی کھانے کو حضرات فقہاء کرامؒ نے غیر مباح بھی کہا ہے اور مکروہ و بدعتِ مستقبحہ بھی ۔ صد افسوس ہے کہ بڑے بڑے عمامہ بردار مولوی بھی اس قبیح ترین بدعت میں مبتلا ہیں ۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا و من جمیع البدعات ۔

امام قاضی خانؒ لکھتے ہیں :

ویکرہ اتخاذ الضیافة فی ایام المصیبة لانها ایام تاسف فلا یلیق بها ما کان للسرور (فتاوی خانیہ ج ۴ ص ۸۱)

یعنی مصیبت کے دنوں میں ضیافت کرنا مکروہ ہے کیونکہ جو کام خوشی کے وقت ہو وہ غمی کے مناسب نہیں ہے ۔

اِسی کے قریب قریب عبارت فتاوٰی سراجیہ ص ۷۵ میں ہے ۔

حافظ ابنِ ہمامؒ لکھتے ہیں کہ :

ویکرہ اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لا فی الشرور وهی بدعة مستقبحة (فتح القدیر ج ۱ ص ۴۷۳)

میت کے گھر کھانا تیار کرنا مکروہ ہے کیونکہ طعام کھانا تو خوشی کے موقع پر ہوتا ہے نہ کہ غمی میں ، اور یہ نہایت ہی بُری اور قبیح بدعت ہے ۔

اور علامہ قہستانیؒ لکھتے ہیں کہ :

ویکرہ اتخاذ الضیافة فی هذه الایام وکذا اکلها کما فی خیرة الفتاوی (جامع الرموز ج ۱ ص ۲۴۳)

ان دنوں میں میت کے گھر کھانا تیار کرنا اور کھانا دونوں مکروہ ہیں جیسا کہ خیرۃ الفتاوٰی میں مذکور ہے ۔

فتاوٰی عالمگیری میں ہے کہ :

ولا یباح اتخاذ الطعام ثلاثة ایام کذا فی التتارخانیه ۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷)

تین دن تک میت کے گھر میں کھانا تیار کرنا مکروہ ہے ایسا ہی فتاوٰی تاتارخانیہ میں ہے ۔

اور امام حافظ الدین محمدؒ بن شہاب کردری الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ :

ویکرہ اتخاذ الضیافة ثلاثة ایام واکلها

تین دن تک ضیافت مکروہ ہے اور اسی طرح اس کا کھانا

لانها مشروعة للسرور ويكره اتخاذ اطعام فی الیوم الاوّل والثالث و بعد الاسبوع والاعیاد ونقل اطعام الی القبر فی المواسم و اتخاذ الدعوة لقرأة القرآن و جمع الصّلحاء والقرّاء للختم او لقرأة سورة الانعام او الاخلاص فالحاصل ان اتخاذ الطعام عند قرأة القرآن لاجل الاکل یکرہ۔ (فتاویٰ بزازیہ ج ۴ ص۸۱ طبع مصر)

بھی کیونکہ ضیافت تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے اور پہلے دوسرے اور تیسرے دن طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے، اور اسی طرح ہفتہ کے بعد اور عیدوں کے موقعہ پر بھی اور اسی طرح موسم بموسم قبروں کی طرف طعام لے جانا بھی مکروہ ہے اور قرأت قرآن کے لئے اور صلحاء اور قراء کو جمع کرکے ختم قرآن کے لئے دعوت کرنا بھی مکروہ ہے وعلی ہذا القیاس سورۂ انعام یا سورۂ اخلاص کی قرأت کے لئے طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قرأت قرآن کے وقت کھانے کے لئے طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

اسی مضمون کی عبارت شامی (ج ۱ ص۸۴۱ طبع مصر) میں بھی ہے اور علامہ علی متقیؒ کا یہ حوالہ کہ ان ھذا الاجتماع فی الیوم الثالث خصوصاً لیس فیه فرضیة الخ پہلے نقل ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہو: ص۱۶

امام نوویؒ شرح منہاج میں لکھتے ہیں کہ:

الاجتماع علی مقبرة فی الیوم الثالث وتقسیم الورد والعود والطعام فی الایام المخصوصة کالثالث والخامس والتاسع والعاشر والعشرین والاربعین والشهر السادس والسنّة بدعة ممنوعة (بحوالہ انوارِ ساطعہ ص۱۰۵)

قبر پر تیسرے دن اجتماع کرنا اور گلاب اور اگر کی بتیاں تقسیم کرنا اور مخصوص دنوں کے اندر روٹی کھلانا، مثلاً تیجہ، پانچواں، نواں، دسواں، بیسواں اور چالیسواں دن اور چھٹا مہینہ اور سال کے بعد، یہ سب کے سب اُمور بدعت ممنوعہ ہیں۔

حضرت ملا علی القاریؒ، حضرت عاصمؒ بن کلیب کی روایت کو نقل کرتے وقت یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

قرر اصحاب مذهبنا من انه یکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاوّل والثالث وبعد الاسبوع۔ (مرقات ج ۵ ص۴۸۲)

ہمارے مذہب (حنفی) کے حضرات فقہاء کرام نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ میت کے پہلے اور تیسرے دن اور اسی طرح ہفتہ کے بعد طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

اِن عبارات میں اس امر کی پوری صراحت موجود ہے کہ میّت کی وجہ سے دنوں کی تخصیص کر کے کھانا پکانا (اور خصوصاً تیسرے، دسویں اور چالیسویں وغیرہ دنوں میں بدعت اور مکروہ ہے اور ایسے کھانے سے بہرحال پرہیز کرنا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا لکھنوی لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ در جامع البرکات مے نویسد وآنکہ بعد سالے یا ششماہی یا چہل روز دریں دیار پزند و درمیان برادران بخشش کنند وآں را بھاجی میگویند چیزے داخل اعتبار نیست بہتر آنست کہ نہ خورند" - انتہٰی (مجموعہ فتاوی ج ۳ ص۱۰۷)۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ:

"وعادت نبود کہ برائے میّت جمع شوند و قرآن خوانند وختمات خوانند بر سرِ گور و نہ غیر آں وایں مجموع بدعت است نعم برائے تعزیت اہلِ میّت و جمع وتسلیہ وصبر فرمودن ایشاں را سنّت ومستحب است اما ایں اجتماع مخصوص روزِ سوم وارتکابِ تکلّفاتِ دیگر وصرفِ اموال بے وصیّت از حقِ یتامیٰ بدعت است وحرام"۔ (مدارج النبوّت ج ۱ ص۴۲۲ طبع نولکشور)

شیخ صاحب موصوف نے شرح سفر السعادت ص۲۷۳ اور اشعۃ اللمعات ج ۱ ص۷۲۵ میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔

اور شیخ الاسلام کشف الغطاء میں لکھتے ہیں کہ:

"آنچہ متعارف شدہ از پختن اہلِ مصیبت طعام را در سوم وقسمت نمودن آں میان اہلِ تعزیت واقران غیر مباح ونامشروع است وتصریح کردہ بداں در خزانہ چہ شرعیت دعوت نزدِ سرور است و نزدِ شرور"۔

اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ لکھتے ہیں کہ:

"بعد مُردن من رسوم دنیوی مثل دہم وبستم وچہلم وششماہی وبرسینی ہیچ نکنند"۔ (وصیت نامہ مع مالا بدّ منہ ص۱۹۱)

اور حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب نقشبندیؒ (المتوفی سنہ ھ) لکھتے ہیں کہ:

(سوالِ ششم آنکہ طعام بروحِ میّت بروزِ سوم ودہم وگل دادن روزِ سوم از کجا است؟) مخدوما طعام دادن للہِ تعالیٰ بے رسم وریا وثواب آں را بمیّت گزرانیدن بسیار خوب است وعبادت بزرگ اما

تعیینِ وقت اصل معتمد علیہ ظاہر نمی شود و روزِ سوم گل دادن بمرداں بدعت است"۔ (مکتوبات، مکتوب ۱۱۱)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"دیگر از عاداتِ شنیعہ ما مردم اسراف است در ماتمہا و سیوم و چہلم و ششماہی و فاتحہ سالینہ و ایں ہمہ را در عرب اوّل وجود نبود مصلحت آں است کہ غیر تعزیت وارثان میّت تا سہ روز و اطعام شاں یک شب و روز رسمے نباشد"۔ (تفہیمات ج ۲ ص ۲۴۷ و وصیّت نامہ ص ۱۳)

اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ (المتوفّی ۸۰۰ھ) کے ملفوظات میں ہے کہ:

"اس زمانہ میں سیوم کے روز میّت کی زیارت کے واسطے شربت و برگ و میوہ لے جاتے ہیں اور کھاتے ہیں" — اور فرمایا کہ "صندوق لے جاتے ہیں اور سیپارہ خوانی کرتے ہیں یہ مکروہ ہے"۔ (الدر المنظوم ص ۸۳)

اور علامہ محی الدّین برکلی نقشبندی الحنفیؒ (المتوفّی ۹۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"ان بدعات میں سے ایک یہ ہے کہ موت کے دن یا اس کے بعد ضیافتِ طعام کی وصیّت کرنا اور قرآن و کلمہ پڑھنے والوں کو پیسے دینا یا قبر پر چالیس روز تک یا کم و بیش ایام تک آدمی بٹھانا یا قبر پر قبہ بنانے کی وصیّت کرنا یہ سب امور منکرہ ہیں"۔ (طریقہ محمدی صفحہ آخری)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ مرید خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی چشتیؒ (المتوفّی فی حدود ۸۰۰ھ) قبور کی زیارت کے لئے بھی از خود دنوں کی تعیین (مثلاً تیسرے یا ساتویں روز) کو بدعت شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میداں زیارت سنّت است لیکن زیارت روز و شب
معہود سیوم ہفتمے داں بدعتے میکن حذر (تحفۂ نصائح)

اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

"مقرر کردن روزِ سوم وغیرہ بالتخصیص و او را ضروری انگاشتن در شریعتِ محمّدیہ ثابت نیست صاحب نصاب الاحتساب (مولانا ضیاء الدّین عمرؒ بن محمدؒ بن عوض سنامی الحنفی معاصر حضرت شیخ نظام الدّین اولیاء المتوفّی ۷۲۵ھ) آں را مکروہ نوشتہ و راہ تخصیص بگذارند و ہر روز یکہ خواہند ثواب

بروحِ میت رسانند"۔ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص۷۷)۔

قارئین کرام! آپ نے جماعت احناف کثّر اللہ تعالیٰ سوادہم کے ذمّہ دار حضرات فقہاء کرامؒ اور حضرات صوفیاء عظامؒ کی عبارتیں ملاحظہ کرلی ہیں کہ وہ میت کے گھر کھانا تناول کرنے، سوم، دہم، چہلم اور برسی وغیرہ کو بدعت اور مکروہ (بلکہ بعض حرام) کہتے ہیں۔ مگر صد افسوس ہے کہ فریقِ مخالف کی گنگا ہی اُلٹی ہے۔ جو حضرات یہ بدعات نہیں کرتے، ان کو وہ وہابی وغیرہ کے خطابات سے نوازتے ہیں، اور عوام النّاس کو اُن کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ **فوا اسفا!**

لطیفہ: فریقِ مخالف کے اعلیٰ حضرت نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ — حتی الامکان اتباعِ شریعت نہ چھوڑو، اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے، اُس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اللہ توفیق دے۔ بلفظہٖ (وصایا شریف ص۸)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا دین اور مذہب شریعتِ اسلامی سے جُدا ہے اور اس دین پر جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہے مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ شریعتِ حقّہ کا اتباع تو حتی الامکان بتایا مگر ان کا مذہب اور دین اپنانا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ سُبحان اللہ تعالیٰ! اور بات بھی صحیح ہے کیونکہ عقائد سے لے کر اعمال تک اور عبادات سے اخلاق تک خان صاحب کا دین و مذہب شریعتِ اسلامی سے بالکل جُدا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، یار زندہ صحبت باقی! لیکن فاتحہ کے سلسلہ میں خان صاحب کے اتباع سے گذارش ہے کہ ان کی وصیتِ شریفہ پر عمل کرکے ثوابِ دارین حاصل کریں اور اس گرانی اور مہنگائی میں ان لذیذ چیزوں کا خُوب لُطف اُٹھائیں۔

خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اعزہ سے اگر بطیبِ خاطر ممکن ہو تو فاتحہ میں ہفتہ (میں) دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دُودھ کا برف خانہ ساز اگرچہ بھینس کے دُودھ کا ہو، مُرغ کی بریانی، مُرغ پلاؤ خواہ بکری کا، شامی کباب، پراٹھے اور بالائی، فیرینی، اُرد کی دال مع ادرک و لوازم، گوشت بھری کچوریاں، سیب کا پانی، انار کا پانی، سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف، اگر روزانہ ایک چیز ہو سکے یوں کر دیا جیسے مناسب

جانو، مگر بطیبِ خاطر۔ میرے لکھنے پر مجبورانہ نہ ہو"۔ انتہٰی بلفظہٖ (وصایا شریف ص۸)

فریقِ مخالف کو اعلیٰ حضرت کی اس زرّیں وصیّت پر عمل پیرا ہو کر ثوابِ دارین حاصل کرنا چاہیئے۔

مولوی محمد عمر صاحب نے اپنی کتاب مقیاس حنفیت میں اس مضمون کی مستقل سُرخیاں قائم کر کے امّتِ محمّدیہ پر کرم فرمائی کی ہے: فضیلتِ دودھ، فضیلتِ حلوا و شہد، فضیلتِ گوشت اور پراٹھا وغیرہ، پھر کیوں عوام النّاس اس پر عمل نہ کریں کہ ہم خرما و ہم ثواب۔ مگر مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے فضیلتِ جہاد پر کوئی سُرخی قائم نہیں کی لیکن یہ بیچارے جہاد تو کیا کریں گے۔ تحریکِ ختمِ نبوّت میں ان کی اکثریت عامۃ المسلمین کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے۔ یہ صرف کھانے پینے کے مجاہد اور شیر ہیں جہاد اور حق گوئی سے ان کی کیا نسبت؟ ؎

تجھے طعام سے ممکن نہیں فراغ کہ تُو طعام خواہ ہے مگر صاحبِ جہاد نہیں (اقبال تغیّر)

اگر فریقِ مخالف خان صاحب کی سابق وصیّت پر عمل نہ کر سکے اور مختلف اشیاء تیار کرنے اور مہیّا کرنے سے عاجز ہو تو ان کے دوسرے فتوے پر عمل کرے تاکہ اس کی تلافی ہو جائے، اور نہیں تو کم از کم بُڑھیا دادی کے سوم پر ہی ایسا کر لیا کریں تاکہ اس گرانی کے وقت پیاری نانی بھی ساتھ ہی یاد آ جائے۔

خان صاحب لکھتے ہیں: "مسئلہ: میّت کے سوم کا کس قدر وزن ہونا چاہیئے۔ اگر چھوہاروں پر فاتحہ دلا دی جائے تو ان کا کس قدر وزن ہو؟ الجواب: کوئی وزن شرعاً مقرر نہیں، اتنے ہوں جس میں ستّر ہزار عدد پورا ہو جائے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ انتہٰی بلفظہٖ (عرفانِ شریعت حصہ اوّل ص۳)

اگر شریعت نے وزن مقرر نہیں کیا تو خان صاحب کو عرفانِ شریعت کا یہ زرّیں نسخہ کہاں سے حاصل ہوا ہے؟ سچ فرمایا انھوں نے کہ ان کا مذہب و دین ان کی کتابوں ہی سے ظاہر ہوگا اور جس پر قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اگر فی چھوہارہ ایک تولہ ہو تو ستّر ہزار کا وزن اکیس من اور پینتیس سیر ہوگا، اور اگر چھ ماشہ فی چھوہارہ وزن ہو تو ستّر ہزار کا وزن دس من اور ساڑھے سینتیس سیر ہوگا اور قابلِ استعمال چھوہارہ چھ ماشہ سے کیا کم ہوگا؟ اگر چھ روپے سیر بھی چھوہارے ہوں تو دس من اور ۳۷ سیر کی قیمت تقریباً چھبیس ۲۶ سو روپیہ سے اُوپر ہوگی۔ ایسے دو سوم تو کیا ایک بھی اس زمانہ میں اچھے خاصے

چودھریوں اور نوابوں کو بھی نانی یاد کرا دے گا اور دادی جی تو مفت میں یاد آ جائیں گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو اعتراضات فریقِ مخالف کی طرف سے کئے جاتے ہیں، ہم اُن کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

فریقِ مخالف کا پہلا اعتراض فریقِ مخالف کا کہنا ہے کہ میّت کے گھر سے کھانا ناجائز اور مکروہ نہیں ہے کیونکہ مشکوٰۃ ج ۲ صفحہ ۵۴۴ میں ایک حدیث آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب ایک میّت کو دفن کیا اور اس سے فارغ ہوئے تو:

استقبلہٗ داعی امرأتہٖ: میّت کی بیوی کا ایک قاصد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دینے آیا۔ علّامہ حلبیؒ (کبیری صفحہ ۶۰۹ اور صغیری صفحہ ۳۰۰ میں) اور ملّا علی القاریؒ (مرقات ج ۵ صفحہ ۴۸۲ میں) لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ میّت کے گھر سے کھانا درست ہے۔ ورنہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہرگز نہ کھاتے۔ (انوارِ ساطعہ صفحہ ۱۰۹ محصلہ)۔

الجواب: اس روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ اوّلاً[۱] اس لئے کہ امرأتہٖ کا نسخہ صاحبِ مشکوٰۃ کا وہم یا کسی کاتب کی غلطی ہے۔ اصل الفاظ داعی امرأۃٍ ہیں کہ کسی عورت کے قاصد نے آپ کو دعوت دی تھی۔ باقی داعی امرأتہٖ (کہ میّت کی بیوی کے داعی نے دعوت دی) یہ غلط ہے۔ چنانچہ یہی روایت ابو داؤد ج ۲ صفحہ ۱۱۷، مشکل الآثار ج ۲ صفحہ ۱۳۲، معتصر صفحہ ۱۶۹، شرح معانی الآثار ج ۲ صفحہ ۳۲۲، دارقطنی ج ۲ صفحہ ۵۴۵، مسند احمد ج ۵ صفحہ ۲۹۳، سنن الکبریٰ ج ۶ صفحہ ۹۷، عقود الجواہر المنیفہ ج ۲ صفحہ ۶۲، خصائص الکبریٰ ج ۲ صفحہ ۱۰۳، مستدرک حاکم ج ۴ صفحہ ۲۳۴، محلّٰی بن حزم ج ۷ صفحہ ۴۱۵، عون المعبود ج ۳ صفحہ ۲۴۹ اور بذل المجہود ج ۴ صفحہ ۲۳۹ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے لیکن ان تمام میں امرأۃٍ کے الفاظ ہیں اور یہی صحیح ہے امرأتہٖ کی ضمیر کے ساتھ جو میّت کی طرف راجع ہے، غلط ہے[۱]۔

وثانیاً[۲] جن حضرات نے امرأتہٖ کے الفاظ کو پیشِ نظر رکھا ہے اُنہوں نے دیگر جوابات دیئے ہیں

---

[۱] مولوی عبد السمیع صاحب کا اس امرأتہٖ والی روایت کو مرفوع قرار دے کر حضرت جریرؓ کی کنا نعد (الحدیث) کو موقوف کہہ کر اُس کو رد کرنا (دیکھئے انوارِ ساطعہ صفحہ ۱۱۰) فنِ حدیث سے بالکل بے خبری ہے۔

کسی نے کہا کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور بعض نے رکیک تاویلات کے تحت میّت کے ہاں سے کھانا تناول کرنے کو درست کہا۔ اور فریقِ مخالف کے اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلوی نے یہ جواب دیا کہ اس عورت نے آپ کو پہلے دعوت دی تھی، وقتِ موعود پر تقدیراً اس کا خاوند فوت ہو گیا۔ بنا بریں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہاں کھانا تناول کرنا وفات کی وجہ سے نہ تھا بلکہ سابق وعدہ کی بنا پر تھا۔ اور خان صاحب نے ملّا علی ان قاریؒ اور علامہ حلبیؒ کی تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے (دیکھئے احکامِ شریعت حصّہ سوم از صـ۱۹۴ تا صـ۱۹۷) راقم الحروف کے نزدیک پہلا جواب ہی متعیّن ہے کہ میّت کے گھر کھانا تناول ہی نہیں کیا گیا۔ اصل الفاظ ہی امرأتہٖ ہیں نہ کہ امرأتہ۔

اور جن حضرات نے اس روایت سے استدلال کیا ہے ان کا مدار ہی لفظ امرأتہ ہے۔ علاوہ بریں جب حضرت ملّا علی ان قاریؒ نے اصل حقیقت کا جائزہ لیا تو اپنی آخری تصنیف میں اس سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے شرح نقایہ ج ۱ صـ۱۴۰ میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ میّت کے ہاں کھانا تناول کرنا مکروہ اور بدعتِ مستقبحہ ہے۔

خان صاحب بریلوی نے حضرت ملّا علی ان قاریؒ اور علامہ حلبیؒ کی عبارت کے مفصّل جوابات دینے کے بعد کیا خوب ارشاد فرمایا کہ: اگر فاضل حلبیؒ اور ملّا علی ان قاریؒ ہمارے دیار کا رسم و رواج دیکھتے تو غمی کی ان دعوتوں پر حرمتِ قطعی کا حکم لگاتے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی اجازت دینے میں شیطان مردود کے لئے ایک دروازہ کھول دینا ہے اور مسلمانوں اور بالخصوص نادار مسلمانوں کو سخت مصیبت میں ڈال دینا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہم کو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے والحمد للہ رب العٰلمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا محمد وّاٰلہٖ اجمعین۔ (احکامِ شریعت حصّہ سوم صـ۱۹۷ مترجماً)۔

دوسرا اعتراض | مولوی عبدالسمیع صاحب اور مفتی احمد یار صاحب وغیرہ کہتے ہیں کہ ان عبارات میں تیجہ، دسواں اور چالیسواں وغیرہ کرنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ اپنے مہمانوں اور رشتہ داروں کی ضیافت کی وجہ سے ہے۔ فقہائے کرامؒ نے تصریح کی ہے کہ اگر فقراء کیلئے کھانا تیار کیا جائے تو اچھا ہے۔ نیز شاہ ولی اللہ صاحبؒ

کی عبارت میں اسراف کا ذکر ہے اور اسراف کرنے کو ہم بھی منع کرتے ہیں۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کی عبارت میں رسومِ دنیوی کی ممانعت ہے کہ عورتیں جمع ہو کر ان ایام میں رونا پیٹنا کرتی ہیں، اصل تیجہ وغیرہ سے ممانعت نہیں ہے (محصلہ۔ انوارِ ساطعہ ص۱۰۱ و ص۱۱۳ و ص۱۱۵، جاء الحق ص۲۵۵ و ص۲۵۶)۔

الجواب: بلاشک غمی کے ایام میں رشتہ داروں اور عام لوگوں کے طعن وتشنیع سے بچنے کیلئے تیجہ وغیرہ کرنا ممنوع اور بدعت ہے اور اسراف کرنا اور عورتوں کا جمع ہو کر نوحہ وغیرہ کرنا بھی گناہ ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ عاقل اور بالغ اور حاضر وارث اگر اپنے مال سے فقراء کے لئے کھانا تیار کریں تو جائز ہے۔ مگر اس نقطہ کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ دنوں کی تعیین بھی منع، بدعت اور مکروہ ہے، اور مثلاً تیجہ وغیرہ کی تخصیص کرنا بھی اسی بدعت اور مکروہ کی زد میں ہے اور دنوں کی اسی تعیین کو قاضی ثناء اللہ صاحبؒ رسومِ دنیوی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی عبارت بغور ملاحظہ کیجئے۔ یہ کہنا کہ ان اُمور میں بدعت اور کراہت تیجہ وغیرہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اور اُمور کے سبب سے ہے محض سینہ زوری اور نری جہالت ہے حضرات فقہاء کرام دنوں کی تخصیص کو بھی بدعت ہی کہتے ہیں۔ امام نوویؒ، ابنِ حجرؒ اور صاحبِ بزازیہؒ وغیرہ کی عبارات میں الیوم الثالث الخ کی اور شیخ عبدالحق دہلویؒ اور صاحبِ کشف الغطاء اور خواجہ محمد معصومؒ وغیرہ کی عبارتوں میں روزِ سوم کی خاص طور پر قید موجود ہے۔ پھر کس طرح اس کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے علامہ طیبیؒ اور ملا علی القاریؒ حضرت ابنِ مسعودؓ کی حدیث لا یجعل احدکم للشیطان الخ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

فکیف من اصر علی بدعة او منکر انتھٰی۔ (مرقات ص۳۵۳ ج۲، والتعلیق المحمود ص۱۷۹ ج۱)

پھر کیا حال ہوگا ان لوگوں کا جو کسی بدعت اور منکر امر پر اصرار کرتے ہیں۔

مولانا احمد علی سہارنپوریؒ فرماتے ہیں:

ھٰذا محل تذکر للذین یصرون علی الاجتماع فی الیوم الثالث للمیت ویرونه ارجح من الحضور للجماعة۔ (حاشیہ ترمذی ص۴۰ ج۱)

یہ (حدیث) ان لوگوں کے لیے نصیحت حاصل کرنے کا مقام ہے جو میت کے بعد تیسرے دن مجتمع ہوتے ہیں اور اس اجتماع کو جماعت کی نماز کے لیے حاضری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں۔

اس عبارت میں نہ تو قبر پر اجتماع کی تخصیص ہے اور نہ عورتوں کے نوحہ کرنے کی۔ بلکہ وفات کے بعد تیسرے دن جو بھی اجتماع ہو، اس کا یہی حکم ہے کہ وہ بدعت بھی ہے اور مکروہ بھی۔ اور یہی حضرات فقہاء

کرامؒ کا ارشاد ہے اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں۔

مولوی احمد رضا خان صاحب دوسرے، تیسرے اور چالیسویں دن کے اجتماع اور عورتوں کے کھانے پینے اور چھالیا وغیرہ کے اہتمام کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

اولاً یہ دعوت خود ناجائز و بدعت شنیعہ و قبیحہ ہے۔ امام احمدؒ اپنے مسند اور ابن ماجہ سنن میں بسند صحیح حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کنا نعد الاجتماع الیٰ اھل المیت وصنعھم الطعام من النیاحۃ۔ ہم گروہِ صحابہؓ اہلِ میت کے یہاں جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرانے کو مُردے کی نیاحت شمار کرتے تھے، جس کی حرمت پر متواتر حدیثیں ناطق ـــ الیٰ ان قال امام بزازی وجیز میں فرماتے ہیں یکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاوّل والثالث وبعد الاسبوع یعنی میت کے پہلے یا تیسرے دن یا ہفتہ کے بعد جو کھانے تیار کرائے جاتے ہیں سب مکروہ و ممنوع ہیں (بلفظہٖ احکام شریعت حصہ سوم ص ۱۹۱، ۱۹۲)

نیز مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں کہ "شریعت میں ثواب پہنچانا ہے، دوسرے دن ہو خواہ تیسرے دن باقی یہ تعیین عرفی ہیں جب چاہیں کریں، انہیں دنوں کی گنتی ضروری جاننا جہالت ہے و بدعت۔ (مجموعہ فتاویٰ قلمی مؤلفہ احمد رضا خان صاحب ج ۴ ص ۱۳۱، کتاب الحظر والاباحۃ)۔

نیز خان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ سمجھتا ہے کہ ثواب تیسرے دن پہنچتا ہے یا اس دن زیادہ پہنچے گا اور روز کم، تو یہ عقیدہ بھی اس کا غلط ہے (الحجۃ الفائحہ ص ۱۴)

اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کا مسئلہ حق ہے مگر ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تخصیص اور تعیین ضروری جاننا گو عملاً ہی کیوں نہ ہو، جہالت اور بدعت ہے۔

تیسرا اعتراض فریقِ مخالف کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوئی تو تیسرے دن حضرت ابوذرؓ نے کھجوریں، دودھ اور جَو کی روٹی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے رکھی اور آپ نے ان پر سورۃ فاتحہ اور قل ھو اللہ پڑھ کر دعا فرمائی اور حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کر دو اور فرمایا کہ ان اشیاء کا ثواب میرے لختِ جگر ابراہیمؓ کو پہنچے۔ اس روایت سے ایک تو تیجہ کا ثبوت ہوا، اور دوسرا کھانا سامنے رکھ کر اس پر ختم کہنے کا ثبوت ہوا۔ فریقِ مخالف کا بیان ہے

کہ یہ روایت حضرت ملا علی القاریؒ نے کتاب اوزجندی میں تحریر فرمائی ہے۔

الجواب : مولانا عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ :

نہ کتاب اوزجندی از تصانیف ملا علی قاری است ونہ روایت مذکور صحیح ومعتبر است، بلکہ موضوع و باطل براں اعتماد نشاید درکتب حدیث نشانے ازہمچو روایت یافتہ نمے شود۔

(مجموعہ فتاویٰ، ج ۲ ص۷۷)

کہ نہ تو کتاب اوزجندی حضرت ملا علی القاری کی تصنیفات میں سے ہے اور نہ یہ روایت صحیح اور معتبر ہے بلکہ یہ موضوع اور باطل روایت ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ حدیث کی کسی کتاب میں اس قسم کی روایت کا کوئی نشان موجود نہیں ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "انوارِ ساطعہ ص۱۴۵ اور حاشیہ خزانۃ الروایات میں ہے، کہ حضور علیہ السلام نے امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں دن اور چھٹے ماہ اور سال بھر بعد صدقہ دیا۔ یہ تیجہ ششماہی اور برسی کی اصل ہے (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۵۰)۔

مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسی موضوع اور جعلی روایات سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ حدیث جب پیش ہو تو صحیح سند کے ساتھ ہو یا معتبر حضرات محدثین کرامؒ سے اس کی تصحیح ہونی چاہیئے محض روایت یا حدیث کا نام لے لینا کفایت نہیں کرتا۔

فائدہ : عوام الناس میں جمعرات کے دن صدقہ وخیرات کرنے کی بھی ایک رسم جاری ہے۔ لیکن اس کی بھی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ خان صاحب بریلوی سے کسی نے یوں سوال کیا کہ بعضے لوگ کہتے ہیں کہ فلاں درخت پر شہید مرد ہیں اور فلانے طاق میں شہید مرد رہتے ہیں۔ اُس درخت اور اُس طاق کے پاس جاکر جمعرات کو فاتحہ شیرینی اور چاول وغیرہ پر دلاتے ہیں الخ۔ خان صاحب لکھتے ہیں :

الجواب : یہ سب واہیات وخرافات اور جاہلانہ حماقات وبطالات ہیں، ان کا ازالہ لازم ما انزل اللہ بہا من سلطان۔ (بلفظہٖ احکامِ شریعت حصہ اوّل ص۱۱)۔

کھانا سامنے رکھ کر اُس پر ختم دینا

صحیح احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے کھانے پر بسم اللہ بھی پڑھی ہے اور بطور برکت اور دُعا کے مختلف کھانے کی چیزوں پر قرأت بھی کی ہے۔ اور چیزوں میں اضافہ کیلئے بھی اشیاء کو سامنے رکھ کر اُن پر دعائیں پڑھی ہیں۔ یہ تمام اُمور محلِ نزاع سے خارج ہیں جھگڑا صرف اس امر کا ہے کہ میّت کے لئے ایصالِ ثواب کے طور پر جو کھانا دیا جاتا ہے اُس پر بھی کچھ پڑھنا صحیح ہے؟ اور کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اور حضرات صحابہ کرامؓ نے ایسا کیا ہے؟ اس کا آسان اور صحیح جواب صرف یہ ہے کہ ایسا کرنا ہرگز ثابت نہیں ہے بلکہ یہ بدعت ہے۔ چنانچہ فتاویٰ سمرقندیہ میں ہے کہ:

قراۃ الفاتحۃ والاخلاص والکافرون علی الطعام بدعۃ۔ (الجُنہ ص۱۵۵) ۔ سورۃ فاتحہ اور اخلاص اور کافرون کا طعام پر پڑھنا بدعت ہے۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ کے فتاویٰ میں ہے:

سوال: فاتحہ مروّجہ حال یعنی طعام را روبرو نہادہ دست برداشتہ چیزے خواندن چہ حکم دارد؟

جواب: ایں طور مخصوص نہ در زمانِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم بود نہ در زمان خلفاء۔ بلکہ وجودِ آں در قرونِ ثلاثہ کہ مشہود لہا بالخیر اند منقول نشدہ وحالا در حرمین شریفین زادہما اللہ شرفا عادت خواص نیست واگر کسے ایں طور مخصوص بعمل آورد وآں طعام حرام نمی شود نخوردنش مضائقہ نیست وایں را ضروری دانستن مذموم است الخ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص۷۷)

اور مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

"وقتِ فاتحہ کھانے کا قاری کے پیشِ نظر ہونا اگرچہ بیکار بات ہے مگر اس کے سبب سے وصولِ ثواب یا جوازِ فاتحہ میں کچھ خلل نہیں۔" (الحجۃ الفاتحہ ص۱۶)

مشہور بریلوی عالم مولوی محمد صالح صاحب کھانا سامنے رکھ کر اُس پر پڑھنے کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"یہ رسم سوائے ہندوستان کے اور کسی اسلامی ممالک میں رائج نہیں۔" (انتہیٰ بلفظہٖ تحفۃ الاحباب ص۱۲۲)

جب یہ امر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ بلکہ خیر القرون سے ثابت نہیں ہے اور حضرات فقہاء کرام اس کو بدعت کہتے ہیں اور بقول خان صاحب بریلوی یہ بیکار بات ہے اور بقول مولوی محمد صالح صاحب ہندوستان کے بغیر کسی اسلامی مُلک میں یہ رسم جاری اور رائج نہیں، تو اس کو ضروری سمجھنا اور اہل السنّت اور حنفیت کی علامت قرار دینا اور نہ کرنے والوں کو وہابی کہنا اور ملامت کرنا، یہ کہاں کا انصاف اور دیانت ہے؟ بلکہ قرینِ قیاس و انصاف یہی بات ہے کہ ہندوستان میں یہ رسم ہندوؤں سے ماخوذ ہے۔ وہ کھانے پر بید پڑھتے تھے، اور کلمہ گو مسلمان قرآن پڑھتے ہیں۔ وہاں پنڈت یہ کام کرتے تھے اور یہاں حافظ جی اور میاں جی یہ کارروائی کرتے ہیں۔

مفتی احمد یار خان لکھتے ہیں کہ کھانے کو سامنے رکھ کر دُعا کی تو کونسی خرابی ہے۔ اسی طرح قبر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا پڑھتے ہیں۔ (جا۔الحق ص۲۵۴)۔

مگر اس پر مطلقاً غور نہ کیا کہ جنازہ اور قبر کو سامنے رکھ کر دُعا کرنے کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور حضرات صحابہ کرامؓ سے ثبوت ہے۔ لیکن ایصالِ ثواب کے لئے کھانا سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھنے کا ہرگز ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ بدعت ہے اور بقول خان صاحب بیکار بات ہے۔ اور بدعت بیکار اور لایعنی کام میں ضرور حرج ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ بیکار امر اور فعلِ عبث حرام ہوتا ہے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا یہ حوالہ نقل ہو چکا ہے کہ "وہر چیزکہ برآں ترغیب صاحبِ شرع و تعیینِ وقت نباشد آں فعل عبث است و مخالفِ سنّتِ خیر الانامؐ و مخالفِ سنّت حرام، پس ہرگز روا نہ باشد"۔ (فتاوٰی عزیزی ج ۱ ص۹۸)۔

چٹائی اور بچھوڑی بچھانا

جب کسی کا کوئی عزیز و قریب فوت ہو جائے تو اُس کی تعزیت کرنا اور صبر کی تلقین کرنا مسنون امر ہے مگر صرف اسی حد تک جس تک شریعت حقہ سے ثابت ہے۔ مسجد میں ہو یا گھر میں، تین دن تک تعزیت کی اجازت ہے۔ لیکن گلیوں اور کوچوں میں اور گھروں کے سامنے بیٹھنا اور چٹائیاں اور دریاں

وغیرہ بچھا کر حقّہ سُلگا کر بیٹھ جانا یہ تمام اُمور بدعات ہیں۔ ان سے اجتناب اشد ضروری ہے۔ چنانچہ امام فخر الدّین عثمانؒ بن علی الزیلعی الحنفیؒ (المتوفی ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا بأس بالجلوس لها الی ثلاثة ایام من غیر ارتکاب محظور من فرش البسط والاطعمة من اهل المیت لانها تتخذ عند السرور۔ (تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۴۶ طبع مصر)

تعزیت کے لئے تین دن بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کیلئے خاص اہتمام سے چٹائی اور دری نہ بچھائی جائے کیونکہ یہ امر ممنوع ہے اور نہ میّت کے اہل سے کھانا تناول کیا جائے اس لئے کہ یہ باتیں خوشی کے وقت کی ہیں نہ کہ غمی کی۔

اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ:

ولا بأس لاهل المصيبة ان يجلسوا فی البیت او المسجد ثلاثة ایام والناس یأتونهم ویعزونهم ویکره الجلوس علی باب الدار وما یفعل فی بلاد العجم من فرش البسط والقیام علی قوارع الطریق من اقبح القبائح۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷ طبع مصر)

اہلِ مصیبت کیلئے مسجد میں یا گھر میں تین دن تک لوگوں کی تعزیت کیلئے بیٹھنا کوئی حرج کی بات نہیں۔ لوگ آئیں اور تعزیت کرکے چلے جائیں۔ اور مکروہ ہے کہ وہ گھر کے دروازہ پر بیٹھیں اور ملکِ عجم کے شہروں میں جو یہ کارروائی کی جاتی ہے کہ لوگ چٹائیاں اور دریاں بچھاتے ہیں اور راستوں کے درمیان بیٹھ جاتے ہیں تو یہ قبیح ترین حرکت ہے۔

اور شیخ عبدالحق محدّث دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"ونشستن بردر، یا بر راہ برائے عزاء المکروہ است اَشدّ کراہت از جہت بودن آں عملِ جاہلیت (الیٰ ان قال) کہ تعزیت کہ بایں کیفیت کہ الآن متعارف است ودر ایّام متعدّدہ کنند نبود"۔ (شرح سفر السعادت ص ۲۷۳)

ان عبارات سے بخوبی یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ تعزیت کے لئے جو طریقہ آج کل اختیار کیا جاتا ہے کہ گلیوں میں اور دروازوں پر چٹائیاں اور دریاں بچھا کر تعزیت کے لئے بیٹھتے ہیں۔ یہ قبیح ترین حرکت ہے اور اشد مکروہ ہے کیونکہ اہلِ جاہلیت کی رسم ہے اور حضرات سلف صالحینؒ میں یہ طریقہ ہرگز رائج نہ تھا۔ علاوہ بریں جو لوگ نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے ہوں، اُن کے لئے تعزیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جنازہ پڑھنے کی وجہ سے میّت کا حق ادا ہو گیا، الّا یہ کہ کوئی بزرگ ہستی اور صاحبِ اثر شخصیت ہو جو اہلِ میّت کو

صبر کی تلقین کرنے کی غرض سے دوبارہ حاضر ہو تو الگ بات ہے۔

مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاسِ حنفیت ص ۵۱۶/۵۱۷ میں جس روایت سے پھوڑی کا ثبوت پیش کیا ہے، وہ صرف مولوی محمد عمر صاحب کا ہی کام ہے۔ اس روایت میں اشارۃً بھی پھوڑی کا ذکر نہیں ہے اور نہ اس کا پھوڑی سے دُور کا واسطہ ہے۔ محض تعزیت کی روایت سے مولوی محمد عمر صاحب کا پھوڑی پر ثبوت مہیّا کرنا سراسر باطل ہے۔

فائدہ : میّت کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے رفع یدیہ ثم قال اللّٰھم اغفر لعبید ابی عامرؓ (بخاری ج ۲ ص ۶۱۹ و مسلم ج ۲ ص ۳۰۳) حضرت عبید ابو عامرؓ کے لئے اُن کی وفات کی خبر سُن کر ہاتھ اُٹھا کر اُن کے لئے دُعا مانگی تھی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ (المتوفّٰی ۱۲۶۲ھ) فرماتے ہیں کہ تعزیت کے وقت ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا ظاہراً جائز ہے الخ (مسائل اربعین ص ۳۴) اور قبر پر بھی ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے ثابت ہے (دیکھئے مسلم ج ۱ ص ۳۱۳ و اصابہ فی تذکرۃ الصّحابہ ج ۲ ص ۲۱۸)۔

حیلۂ اسقاط

یہ بات تو پہلے بوضاحت بیان کی گئی ہے کہ میّت کے لئے صدقہ اور خیرات کرنا اس کے ساتھ ایک بہت ہی عمدہ حسنِ سلوک اور ہمدردی ہے اور نصوصِ شرعیہ سے اس کا ثبوت ہے اور اہل السنّت والجماعت کا اس پر اتّفاق ہے، مگر ایصالِ ثواب کا طریقہ وہی معتبر ہو گا جو دلائلِ شرعیہ سے ثابت ہے۔ اگر کسی عاقل اور بالغ کے ذمّہ کچھ نمازیں باقی ہوں اور اس حالت میں اس کی وفات ہو جائے تو حضرات فقہاء کرامؒ نے روزہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لئے فدیہ تجویز کیا ہے۔ مگر اس میں صرف قیاس ہی نہیں بلکہ حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت ابنِ عمرؓ کی روایتیں بھی موجود ہیں گو بظاہر موقوف ہیں مگر حکماً مرفوع ہیں۔

عن ابن عباس قال لا یصلی احد عن احد ولا یصوم احد عن احد ولکن یطعم عنہ (مشکل الآثار ص ۱۴۱/۳۵)

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے۔ مگر ہاں اس

سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۲۵۷ جوہر النقی ج ۴ ص ۲۵۷ مع السنن والزیلعی ج ۲ ص ۴۶۳) کی طرف سے فدیہ دے دے۔

علامہ ماردینیؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند علیٰ شرط الشیخین صحیح ہے (الجوہر ج ۴ ص ۲۵۷) اور حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ اسنادہ صحیحٌ (الدرایہ ص ۱۷۷)۔

وعن ابنِ عمرؓ قال لا یصلّین احد عن احد ولا یصومن احد عن احد ولکن ان کنت فاعلاً تصدقت عنه او اهديت عنه - (ایضاً)۔

حضرت ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ روزہ رکھ سکتا ہے اور لیکن اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو اُس کی طرف سے صدقہ یا ہدیہ اور فدیہ دے دو۔

ہر روزہ کا بدلہ نصف صاع گندم ہے، صاع دو سو ستر تولہ کا ہوتا ہے علامہ سندھیؒ (المتوفی سنہ) فرماتے ہیں ؎

صاع کوفی ہست اے مردِ فہیم — دو صد و ہفتاد تولہ مستقیم

صاع تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوا اور نصف صاع تقریباً پونے دو سیر کا۔ ہر آدمی کو اپنی نمازوں اور روزوں کا حساب کر کے حسبِ تصریح حضرات فقہاء کرام وصیت کرنی چاہیئے (دیکھئے خانیہ ج ۱ ص ۹۶، و جامع الرموز ج ۱ ص ۱۶۱ و نور الایضاح ص ۱۰۴)۔ اور اگر بغیر وصیت کے وارث نے بطور تبرّع فدیہ دیا، تب بھی جائز ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ثواب پہنچے گا۔ مگر وارثوں پر یہ فدیہ لازم نہ ہوگا۔ اور ہر نماز کا بدلہ بھی نصف صاع ہوگا اور وتر کے لئے مستقل نصف صاع ہوگا۔ پانچ نمازوں کا اندازہ بمع وتر ساڑھے دس سیر گندم ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ کے حقوق نہیں تو اس کے لئے فدیہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص مال دار ہے اور اس کے ترکہ سے وارثوں کی حق تلفی کئے بغیر ثلث سے فدیہ دیا جا سکتا ہے تو دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص فقیر اور غریب ہے اور اس کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ حقوق ہیں اور اُس کے ثُلث ترکہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب نمازوں اور روزوں کا فدیہ ادا ہو سکے تو حضرات فقہاء کرامؒ نے اس کے لئے یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ جتنی مقدار میں گندم یا اس کی رقم کا اس کا ترکہ متحمّل ہے تو وہ گندم یا رقم میّت کا وارث کسی فقیر کو دے دے۔ پھر فقیر وارثِ میّت کو ہبہ کرے، پھر وارث فقیر کو دے دے۔ حتیٰ کہ اتنی بار یہ معاملہ ہوتا رہے جتنی میں نمازوں اور روزوں کا اندازہ پورا ہو جائے

یہی صورت فقہ حنفی کی متعدد کتابوں میں لکھی ہے ۔ (مثلاً دیکھئے کبیری ص۵۳۵، شامی ج ۱ ص۶۹۲، اور نُورالایضاح ص۱۰۱ وغیرہ) ۔ اور حضرات فقہاء احنافؒ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر یہ فدیہ نماز کا عوض بن سکا تو فبہا، ورنہ صدقہ کا ثواب تو میّت کو حاصل ہو گا (دیکھئے نورالانوار ص۴۳ وغیرہ ۔ اِس ساری بحث کو پیش نظر رکھ کر ذیل کے اُمور بخوبی اس سے ظاہر ہوتے ہیں ۔

(۱) نمازوں اور روزوں کا صحیح حساب اور تخمینہ لگایا جائیگا محض رسمی طور پر فدیہ کا کوئی معنیٰ نہیں ۔

(۲) اور اپنے وارثوں کو اسکی وصیّت کی جائے کہ میری طرف سے میرے ثلث ترکہ میں سے اتنا فدیہ دے دینا ۔

(۳) جس کے ذمّہ نماز اور روزہ وغیرہ نہیں، اس کے لئے اس معہود فدیہ کا کوئی معنیٰ نہیں ہے ۔ بایں طور کہ اُس نے اپنی زندگی میں نماز اور روزہ کی پابندی کی ہے، اور بہت سے خدا کے بندے آج بھی ایسے موجود ہیں، یا نابالغ بچّے اور مجنون اور پاگل وغیرہ ہیں، ان کے لئے اس فدیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بشرطیکہ بلوغت سے تا مرگ جنون رہا ہو ۔

(۴) اگر کوئی فقیر ہے اور اس کا ترکہ تمام روزوں اور نمازوں کی ادائیگی کا متحمّل نہیں، تو صرف اُس کے لئے حضرات فقہاء کرامؒ نے حیلہ تجویز کیا ہے ۔ خانوں، سرداروں، وڈیروں، امیروں اور نوابوں کے لئے یہ حیلہ ہرگز نہیں ہو سکتا ۔

(۵) یہ فدیہ صرف حقوق اللہ مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ کی طرف سے ہو سکتا ہے ۔ حقوق العباد تو حقوق ادا کرنے ہی کی صورت میں ادا ہو سکتے ہیں اور بس، یا صاحب حق بطیبِ خاطر خود معاف کر دے جب آخری مرتبہ حیلہ کی صورت میں میّت کے ذمّہ جو نمازیں اور روزے تھے وہ ادا ہو گئے، تو وہ گندم اور رقم اس فقیر کی ملک ہو گئی جس نے قبول کر لی، پھر اس سے واپس لے کر وارثوں کو اس کی تقسیم کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے ۔ پہلے تو بامرِ مجبوری بشکلِ حیلہ فقیر سے واپس ہوتی رہی مگر اب کیا ضرورت پیش آئی ہے کہ اُس فقیر سے واپس لے کر اُس کو میّت کے وارث خود تقسیم کریں ۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

الذی یعود فی ھبتہٖ کالکلب یعود فی قیئہٖ — جو شخص ہبہ کر کے پھر اس کو واپس لیتا ہے تو اسکی مثال

او کما قال ۔ (بخاری ج ۱ ص۳۵۷ و مسلم ج ۲ ص۳۶) ۔ — ایسی ہی ہے جیسے کُتا قے کر کے خود چاٹ لیتا ہے ۔

صوبۂ سرحد اور بعض دوسرے علاقوں میں یہ دستور ہے کہ حیلۂ اسقاط کے لئے ایک خاص باکرامت گٹھڑی ہوتی ہے جس میں قرآن کریم کے علاوہ کچھ ریز گاری اور گُڑ شریف بھی شامل ہوتا ہے اور پھر اس کو ایک دائرہ کے اندر گھمایا جاتا ہے اور ایک مخصوص دُعا سے شروع کرکے کہ کل حق من حقوق اللہ تعالیٰ بعضھا ادی الخ وہ گٹھڑی اصحابِ دائرہ کو دی جاتی ہے جن میں اکثر بڑے بڑے خان، نواب اور امیر مُلّا بھی شامل ہوتے ہیں، اور وہ یہ کہتے ہوئے کہ قبلت بالطریقۃ المذکورۃ ووھبتلک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حضرات فقہاء کرامؒ کی ان عبارتوں میں نہ تو قرآنِ کریم کا کہیں ذکر ہے اور نہ گُڑ شریف کا۔ خدا معلوم یہ حیلہ در حیلہ کا ثبوت کہاں سے نکلا ہے؟ اور اس گٹھڑی میں جو رقم ہوتی ہے وہ بھی محض اپنی عزّت اور ناک کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ اس کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میّت کی نمازوں اور روزوں کا حساب کیا ہے؟ اور کتنی بار چکّر دینے سے وہ حساب بے باق ہوگا؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جس حیلۂ اسقاط کا جواز حضرات فقہاء کرام سے ملتا ہے اور جن لوگوں کے لئے ملتا ہے اور جن حالات میں ملتا ہے وہ تقریباً تقریباً آج مفقود ہیں اور یہ محض دنیا کمانے کا ایک مذموم حیلہ بن کر رہ گیا ہے اور بمشکل ایک دو فیصدی حیلے ایسے ہوتے ہوں گے جو حضرات فقہاء کرام کے بیان کردہ حیلہ کے عین مطابق ہوں گے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے کیا ہی خُوب ارشاد فرمایا کہ:

"حیلہ اسقاط کا مفلس کے واسطے علماء نے وضع کیا تھا۔ اب یہ حیلہ تحصیل چند فلوس کا مُلّانوں کے واسطے مقرّر ہو گیا ہے، حق تعالیٰ نیّت سے واقف ہے، وہاں حیلہ کارگر نہیں مفلس کے واسطے بشرطِ صحّتِ نیّت ورثہ کے کیا عجب ہے کہ مفید ہو، ورنہ لغو اور حیلہ تحصیل دنیا دَنیّہ کا ہے فقط واللہ اعلم۔" رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۰۳) ۔ اور دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ "حقوقِ مالیہ تو ادائے حقوق سے ادا ہو سکتے ہیں، اور حقوقِ بدنیہ جیسے نماز روزہ، تو اگر ہر نماز اور ہر روزہ کے بدلے نصف صاع گیہوں اور ایک صاع جَو ادا کرنے سے اُمید ادا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ باقی رہا یہ اسقاطِ مروّجہ، محض لغو اور بے ہودہ حیلہ ہے، اور اس کا خیر القرون میں کچھ اثر نہیں ہے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔" رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۲۶) ۔

بعض فقہاءؒ نے تو اس میں غلطی سے ایسا غلو کیا کہ صاف لکھ دیا کہ :

وان لم یملک شیئاً استقرض وارثه ۔ اگر مردہ کسی چیز کا مالک نہ ہو تو اس کا وارث قرض لے کر فدیہ ادا کرے۔ (جامع الرموز ج ۱ ص۱۶۲)

مولوی محمد صالح صاحب بریلوی لکھتے ہیں کہ "اگر میّت کی جائداد کچھ بھی نہ ہو تو وارث پر لازم ہے کہ قرض لے کر ادا کرے"۔ انتہی بلفظہٖ (تحفۃ الاحباب ص۸۹) ۔

حالانکہ یہ حضرات فقہاءِ احنافؒ کے مسلک کے بالکل خلاف ہے ۔ چنانچہ امام قاضی خانؒ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

وعلیه ان یوصی بالفدیة ویعتبر ذٰلک من ثلث ماله عندنا وان لم یوص و تبرع الورثة عنه جاز ولا یلزمهم من غیر ایصاء عندنا خلافا للشافعیؒ ۔ (قاضی خان ج ۱ ص۹۶)

میت پر فدیہ کی وصیّت لازم ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ وصیّت ثلث مال سے ہی ہوگی۔ اگر میّت نے وصیّت نہ کی اور وارثوں نے بطور تبرع کے اس کی طرف سے فدیہ ادا کر دیا تو جائز ہے مگر ہمارے نزدیک بغیر وصیّت کے وارثوں پر یہ لازم نہیں ہے، بخلاف حضرت امام شافعیؒ کے۔

جب میّت کے اپنے ترکہ میں ثلث مال سے فدیہ بھی بغیر وصیّت کے وارثوں پر لازم نہیں ہے تو بصورتِ عدمِ مِلک کے وارث کا قرض لے کر فدیہ ادا کرنے کا کیا مطلب ہوگا ؟

حقیقت یہ ہے کہ اس غلط حیلۂ اسقاط کے طریقہ نے بعض علاقوں میں بہت سے لوگوں کو بہت ہی زیادہ پریشان کر رکھا ہے اور مُلّا محض اپنے چند ٹکوں کے لئے طرح طرح کے حیلے اور بہانے اور حکمتیں اور مصلحتیں اور فوائد و منافع تراش کر سادہ لوح مسلمانوں سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں ۔

مفتی احمد یار خان صاحب حضرت مولانا گنگوہیؒ کی سابق عبارت پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"مفلس کی قید مولوی رشید احمد صاحب نے اپنے گھر سے لگائی ہے الخ"۔ (جاء الحق ص۳۱۷) ۔

مگر مفتی صاحب خود اپنا لکھا فراموش کر گئے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ : "اب اگر کسی کے ذمہ دس بیس سال کی نمازیں ہیں تو صدہا من غلہ خیرات کرنا ہوگا ۔ شاید کوئی بڑا دین دار مال دار تو یہ کر سکے مگر غرباء سے

ناممکن۔ ان کے لئے یہ طریقہ ہے کہ ولی میت بقدر طاقت گندم الخ (جاء الحق ص۳۶۵) مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ آپ نے غرباء کی قید اپنے گھر سے کیوں لگائی ہے؟ کیا سچ کہا گیا ہے ؎

غیر کی آنکھوں کا تنکا تجھ کو آتا ہے نظر   دیکھ اپنی آنکھ کا غافل ذرا شہتیر بھی

لطیفہ: مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ وہابی دیوبندی جس طرح کہ زندہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، اسی طرح مُردوں کے بھی دشمن ہیں کہ نفع پہنچانے سے لوگوں کو روکتے ہیں، اور مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بلفظہٖ (جاء الحق ص۳۶۵)۔

مفتی صاحب ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ فرمائیں کہ وہابی دیوبندی تو خیر بقول شما دشمن ہوئے مگر آپ لوگوں نے اپنے پیٹ کو ایسا سر پر اُٹھا لیا ہے کہ زندہ مسلمانوں کو بھی خیر خواہ بن کر لوٹ کر کھا گئے اور مُردہ مسلمانوں کو بھی خیر سے نہ چھوڑا کبھی تیجا اور ساتواں کی صورت میں اور کبھی گیارھویں اور چالیسویں کی شکل میں اور کبھی عرس و میلاد وغیرہ کے رنگ میں جونک بن کر سادہ مسلمانوں کو چوس لیا ہے، اور نہ تو زندگی میں، اور نہ بعد از زندگی کسی طرح ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہی خواہ اور خیر خواہ آخر ایسے ہی درکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "بے شک بہت سے مولوی اور پیر لوگوں کے اموال ناجائز طریقہ سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین سے روکتے ہیں" اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الآیۃ)۔ وہ سیدھا سادہ خدا تعالیٰ کا دین جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے ذریعہ ہم تک پہنچا تھا۔ اُس پر مفتی صاحب اور ان کی جماعت نے زراندوزی کی بدعات کے سینکڑوں غلاف چڑھا دیئے ہیں اور صحیح دین جس کو اس دور میں اصل شکل میں صرف اکابرین علماء دیوبند ہی پیش کرتے ہیں اُس سے مفتی صاحب وغیرہ روکتے ہیں فوا اسفا!

دورانِ قرآن

میت کے لئے ایصالِ ثواب کا مسئلہ اور نادار مفلس کے لئے حیلہ اسقاط کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا ازلی کلام اور ظاہری و باطنی، جسمانی اور روحانی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ قرآن کریم، صحیح احادیث اور اجماعِ اُمّت سے ایصالِ ثواب کا طریقہ ثابت ہے لیکن اس کا ثبوت کسی صحیح دلیل سے نہیں ہو سکا کہ جنازہ کے بعد میّت پر قرآن کریم کو پھیرا جائے۔ تمام احادیث کا ذخیرہ چھان لیجئے کہیں آپ کو اس کا نام و نشان تک نہیں مل سکے گا۔ شافعیوںؒ اور مالکیوںؒ و حنبلیوںؒ کی معتبر و مستند کتابوں کی ورق گردانی کر لیجئے، کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہو گا۔ حضرت امام اعظم امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کی کتابیں دیکھ لیجئے، کہیں اس کا بیان نہ ہو گا۔ فقہ حنفی کے معتبر و مستند فتاویٰ متون اور شروح کو ملاحظہ کر لیجئے، کہیں اس کا پتہ نہ پاؤ گے۔ کتب ظاہر الروایہ کا مطالعہ کر لیں، کہیں اس کی جھلک نظر نہ آئے گی۔ حضرات صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظامؒ کی سوانح عمریاں ملاحظہ کیجئے، اس کا وجود کہیں نہیں ملے گا، اور موت کوئی ایسی نادر چیز نہیں جس کا کہیں وقوع نہ ہوا ہو۔ پھر کیا وجہ ہے، کہ حضرات صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان میں سے کسی نے دورانِ قرآن کا حیلہ تجویز کیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرات فقہاء احنافؒ نے کتب فقہ میں اور حافظ ابن القیمؒ نے اغاثۃ اللھفان ج ا ص۳۸۸ میں اس کی تصریح کی ہے کہ ہر ایسا حیلہ جس کی وجہ سے انسان کسی حرام سے بچ سکے یا بغیر ابطالِ حق غیر کے اور بغیر ادخال شبہ فی الدّین کے کسی حلال چیز کا حصول اس سے ہو سکے، تو وہ درست ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ وہ مقام نہیں جس میں ہمیں اپنی طرف سے قیاس و اجتہاد کر کے از خود حیلے تراش کر ایک نیا دین گھڑا کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہو کیونکہ کفن و دفن کے اور ایصالِ ثواب کے اور میّت سے ہمدردی کے تمام پہلو جناب رؤف و رحیم اور رحمۃ للعلمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ایک ایک کر کے ہمیں بتائے اور حضرات صحابہ کرام اور اہل خیر القرون نے اپنے عمل سے وہ ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ اگر ایسے مقام پر اُنہوں نے کوئی حیلہ نہیں کیا تو یقین جانیئے کہ ہمارے لئے بھی اس کے کرنے کی ہرگز ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب سبت کے ایسے ہی ناجائز حیلوں کے سبب ان پر عذاب نازل کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے یہود بے بہبود کے ایسے ہی نفسانی حیلوں کے پیش نظر قاتل اللہ الیھود (الحدیث) کے سنگین الفاظ سے اُن کے حق میں بد دُعا فرمائی تھی،

(صحیحین) اور اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کو آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قال لا ترتکبوا ما ارتکبتِ الیھود فتستحلوا محارم اللہ بادنی الحیل — وھذا اسناد جیّد ۔ (تفسیر ابن کثیر ج۲ ص۲۵۷ و راجع دُرمنثور ج۳ ص۱۳۹)

تم ایسی حرکات کا ارتکاب نہ کرو جیسا کہ یہود نے کیا کہ تم معمولی حیلوں سے اللہ تعالےٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھنے لگو۔

الغرض صوبہ سرحد اور دیگر مختلف علاقوں میں چند ٹکوں کی غرض سے قرآن مجید کو جو پھیرا جاتا ہے، اس کا شریعتِ اسلامیہ میں کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ شریعتِ حقّہ اس قبیح ترین حرکت سے سخت بیزار ہے اور تمام حق پرست علماء کا یہ اوّلین فرض ہے کہ اس رسمِ بد کو فی الفور ختم کر دیں اور اس مصنوعی اور خود ساختہ طریقے سے (جس میں لفظ دَورانِ قرآن ہی اس کے خود ساختہ ہونے کی واضح دلیل ہے کیونکہ قرآن کریم پھرتا نہیں پھیرا جاتا ہے اور اس کے لئے اگر عرب سے یہ رسم نکلتی تو تدویرِ قرآن کا لفظ استعمال کیا جاتا نہ کہ دورانِ قرآن کا) مسلمانوں کو نجات دلا کر اُن کے سامنے وہی اسلام پیش کریں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور آئمۂ مجتہدین سے ثابت ہے۔ اور اپنی طرف سے ان بدعات کو پیش کر کے اسلام کا نام دینا دینِ اسلام سے اشد ترین دشمنی ہے ۔ اللہ تعالےٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے ۔ آمین !

تصویر کا دوسرا رُخ

نہایت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم مُجوّزین دورانِ قرآن کے دلائل بھی قارئینِ کرام کے سامنے عرض کر دیں اور پھر ان پر سنداً و متناً ، روایۃً و درایۃً کلام کریں ۔ مُجوّزین کا کہنا ہے کہ دورانِ قرآن کا ثبوت خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ بن الخطاب سے ہے ۔ چنانچہ امام ابو اللیث سمرقندیؒ (المتوفی ۳۸۳ھ) لکھتے ہیں کہ :

حدثنا العباس بن سفیان عن ابن علیۃ عن ابن عون عن محمد عن عبد اللہ قال قال عمرؓ ایھا المؤمنون اجعلوا القرآن وسیلۃً

ہم سے عباسؒ بن سفیانؒ نے بیان کیا اور وہ ابن علیہؒ سے اور وہ ابنِ عونؒ سے اور وہ محمدؒ سے اور وہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے مومنو!

لنجاة الموتی فتحلقوا وقولوا اللّٰھم اغفر لھذا
المیّت بحرمة القرآن المجید وتناوبوا بایدیکم
متناوبةً وفعل عمرؓ فی اٰخر الخلافة مثله فی
زمانه لامرأة ملقبة بحبیبة بنت عربد زوجة
قلّاب (وفی نسخة ملّاب) بجزء القرآن من مَالِیَ
الیٰ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ وشاع فعله فی زمان خلافة
عثمانؓ بانکار مروان بعناد وقال الامام
السمرقندی ثم اشتھر فی خلافة ھارون
الرّشید من غیر انکار نکیر دوران القرآن
لحیلة الاسقاط فاصله ثابت بن عمرؓ وان
لم یذکر فی الکتب المشھورة من الاحادیث و
ولکنه مذکور فی الکتب من التواریخ بسند
قوی کما قال المؤرخ صاحب الفتوح اخبرنا
ابو عاصم عن ابن جریج عن ابن شھاب
عن ابی سلمة عن ابی موسی قال فعل عمرؓ
تعاور جزء القرآن فی حلقة عشرین رجلا
بعد صلاة الجنازة لامرأة ملقبة بحبیبة الخ
ولرجل من قبیلة الانصار ما حفظنا اسمهٗ
وثبت بھذا السند ایضًا اخبرنا سعد عن
ایوب عن جمیع عن عبد الرحمن بن ابی بکرؓ
انه اوجد دوران القرآن عمرؓ والقرآن

قرآن کو مُردوں کی نجات کا ذریعہ بناؤ۔ پس حلقہ باندھو
اور کہو اے اللہ اس میّت کو اس قرآن کی حرمت سے بخش
دے اور باری باری ایک دوسرے کے ہاتھوں سے قرآن کو
لیتے رہو۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری ایّام میں حبیبہ
بنت عربد قلّاب کی بیوی کے لئے ایسا ہی حیلہ تجویز کیا گیا تھا
مَالِیَ سے عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ تک جو قرآن مجید کی جزء تھی،
اس کے ساتھ حیلہ کیا گیا تھا اور یہ طریقہ عہدِ عثمانی میں مشہور
ہو چکا تھا البتہ مروان نے عناداً اس پر اعتراض کیا تھا۔ امام
سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ ہارون الرشید کی خلافت میں
رائج ہو چکا تھا کہ انہوں نے حیلۂ اسقاط میں دورانِ قرآن
بھی کیا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا تو اس کی اصل حضرت
عمرؓ سے ثابت ہے اگرچہ حدیث کی مشہور کتابوں میں اس کا
ذکر نہیں ہے۔ لیکن تاریخ کی بعض کتابوں میں قوی سند کے
ساتھ اس کا ذکر ہے چنانچہ مؤرخ صاحبِ فتوح نے
کہا ہے کہ ہم سے ابوعاصمؒ نے بیان کیا۔ وہ ابن جریجؒ سے اور
وہ ابن شہاب زہریؒ سے اور وہ ابومسلمؒ سے اور وہ حضرت
ابوموسیٰؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیس آدمیوں کے
حلقہ میں نمازِ جنازہ کے بعد ایک عورت کے لئے جس کا لقب
حبیبہ تھا اور ایک انصاری کے لئے جس کا نام ہمیں یاد نہیں
رہا، قرآن کا دَوران کیا تھا اور اس سند سے بھی ثابت ہے
کہ ہم سے سعدؒ نے بیان کیا وہ ایوبؒ سے اور وہ جمیع سے اور

شافع للمؤمنين حياتا و بعد مماتا- انتهى (فتاوی سمرقندی)

وہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ دورانِ قرآن کا ایجاد حضرت عمرؓ نے کیا اور قرآن مومنوں کیلئے زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی شفاعت کرنے والا ہے۔

الجواب : فنِ حدیث کے پیش نظر اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ امام ابواللیثؒ اگرچہ ایک بہت بڑے فقیہ ہیں مگر فنِ روایت اور حدیث میں تو حضرات محدثین کرامؒ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ لہٰذا ان کی پیش کردہ روایتؒ اسماء الرجال کی کتابوں سے پرکھ کر دیکھیں گے کیونکہ یہی وہ فن ہے جو حدیث کا محافظ ہے۔ پہلی سند ہرگز قابلِ استدلال نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ اسمیں عیاشؒ بن سفیانؒ مجہول ہے، کتبِ رجال میں اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل سکا۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہرگز اسؐ کا مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین مجہول شخصیتوں سے لیتے پھریں۔ وثانیاً امام سمرقندیؒ کی وفات ۳۸۳ھ میں ہوئی ہے (مقدمہ حقانی ص۱۴۹) اور ابنِ علیہ کی وفات ۱۹۳ھ یا ۱۹۴ھ کو ہوئی ہے (تہذیب ج ا ص۲۷۹)۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے، کہ امام سمرقندیؒ صرف ایک واسطہ سے ابنِ علیہ سے یہ روایت کرتے ہیں، درمیان میں ایک سو نواسی ۱۸۹ سال کا طویل زمانہ اس کا متحمل نہیں ہے جیسا کہ فنِ حدیث اور طبقات رواۃ کو جاننے والوں پر مخفی نہیں ہے۔

دوسری سند مورخ صاحب فتوح کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے۔ اولاً صاحبِ فتوح محمد بن عمر واقدیؒ قابلِ اعتبار ہی نہیں ہے۔ امام بخاریؒ، ابن المبارکؒ، ابنِ نمیرؒ اور اسمٰعیل بن زکریا اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں۔ امام ابن معینؒ اس کو ضعیف اور لیس بشیء کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ وہ کذاب تھا۔ محدث بندارؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے جھوٹا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام اسحاق بن راہویہؒ اور ابوحاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ جن چار مشہور کذابوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جعلی حدیثیں بنا بنا کر بہتان باندھا ہے ان میں ایک واقدی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ:

کتب الواقدی کلها کذب۔ واقدی کی تمام کتابیں خالص جھوٹ ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص۳۶۴ تا ص۳۶۶ محصلاً وملتقطاً)

وثانیاً اس کی سند میں ابنِ جریجؒ ہیں۔ جو اگرچہ ثقہ تھے مگر تکمیل خواہش کے لئے حیلہ کے قائل تھے، چنانچہ

اُنہوں نے نوّے عورتوں سے نکاح متعہ کیا تھا اور اس کو جائز سمجھتے تھے (میزان الاعتدال ج ۲ ص۱۵۱) علاوہ ازیں امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریج، موضوع جعلی اور من گھڑت روایات بھی نقل کر دیا کرتے تھے اور روایت لینے میں ثقہ اور غیر ثقہ کی کوئی تمیز نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً)

وثالثاً۳ یہ روایت ابن جریجؒ کی محمد بن شہاب زہری سے ہے، اور امام ابن معینؒ فرماتے ہیں، کہ ابن جریجؒ فی الزہری لیس بشیٔ، کہ ابن جریجؒ کی امام زہریؒ سے روایت محض ہیچ ہے۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریجؒ حاطب لیل تھے۔ (تہذیب ج ۶ ص۴۰۴)۔

ورابعاً۴ ابن جریجؒ مشہور مدلّس تھے (دیکھئے میزان ج ۲ ص۱۵۱ و تہذیب ج ۶ ص۴۰۶) اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریجؒ قبیح التدلیس تھے۔ ان کی تدلیس سے پرہیز کرنا ضروری ہے (تہذیب ج ۶ ص۴۰۵) اور یہ روایت مدلّس ہے۔

یہ ہے امام سمرقندیؒ کی قوی سند۔ اور اسی لئے ہم نے اس پر قدرے تفصیل سے کلام کیا ہے تیسری سند میں ایوبؒ، سعدؒ، حمیعؒ یہ تمام راوی مجہول ہیں۔ یہ کون تھے اور کیسے تھے؟ کچھ معلوم نہیں۔ جو اس کی صحت کا مدعی ہے اس پر ان کی تعیین اور توثیق ضروری ہے۔ یہ سب کی سب سندیں نہایت کمزور اور مخدوش ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان پر دین کے کسی مسئلہ کی بنیاد رکھی جائے۔ اور اسی واسطے کتب حدیث میں اس روایت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور امام سمرقندیؒ کو بھی صاف لفظوں میں اقرار ہے کہ حدیث کی مشہور (بلکہ غیر مشہور) کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں:

من جاء الیوم بحدیث لا یوجد عند الجمیع لا یقبل (توجیہ النظر ص۲۱۹، فتح المغیث ص۱۶، مقدمہ ابن الصلاح ص۱۰)۔

کہ جس شخص نے آج کوئی حدیث پیش کی جو کہ تمام محدثین کرامؒ کے نزدیک نہ ہو (اور جس کو انہوں نے ذکر نہ کیا ہو) تو وہ روایت ہرگز قبول نہیں کی جاسکتی۔

قطع نظر سند کے اگر درایۃً بھی اس پر غور کیا جائے تو اس روایت کا بطلان واضح ہو جاتا ہے، بچند وجوہ:

اوّل: یہ روایت کسی رافضی کی ایجاد ہے اس لئے کہ یہ حیلہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور ہارون الرشید کی طرف تو منسوب کیا گیا ہے لیکن حضرت علیؓ کا نام تک نہیں لیا گیا اور مروان کی مخالفت کا خاص طور پر

ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے عناد کے طور پر اس مبارک حیلہ سے انکار کیا تھا۔

دوم : اس جعلی روایت، میں یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہ کے عہدِ خلافت میں نماز و روزہ وغیرہ کی لوگوں میں یوں بے پروائی ہوتی رہی کہ ان کو ایسے لوگوں کے بخشوانے کیلئے حیلۂ دورانِ قرآن تجویز کرنا پڑا۔ اور اس سے سمجھنے والے خود سمجھ سکتے ہیں کہ پھر ان کی خلافت، خلافتِ راشدہ کہلائے گی یا غیر راشدہ؟

سوم : جبیبہ اور قلاب کا کتبِ رجال اور تاریخ میں کہیں ذکر نہیں مل سکا۔ لیکن حیرت ہے کہ ایک انصاریؓ کے لئے بھی یہ حیلہ ہوا۔ کیسے باور کر لیا جائے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابی نے نماز اور روزہ میں کوتاہی کی، اور اس کی تلافی حیلۂ دورانِ قرآن سے کی گئی۔ جب کہ حضرات صحابۂ کرامؓ مسلم اور کافر کے درمیان فرق ہی نماز پڑھنے نہ پڑھنے کو سمجھتے تھے پھر رجل من الانصارؓ کا کیا مقام ہوگا؟

چہارم : حضرت عمرؓ کے آخری ایامِ خلافت میں سرکاری طور پر قرآن کریم کتابی شکل میں یکجا جمع کر دیا گیا تھا، پھر کیا وجہ ہے کہ مَالِیَ سے عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ کی جزء تک ہی یہ ہیرا پھیری ہوئی اور سارا قرآن کریم نہ پھرایا گیا؟

پنجم : اگر اس حیلہ کی اصل حضرت عمرؓ سے ہوئی اور عہدِ عثمانیؓ اور رشیدی میں یہ مشہور ہو گیا، تو حضرات محدثین کرامؒ اور فقہاءِ عظامؒ تک یہ کیوں نہ پہنچا؟ یہ کوئی عجیب شہرت ہے کہ حضرات ائمۂ دین کے کان تک اس سے ناآشنا ہوں اور یہ حیلہ مشہور کا مشہور بھی رہے؟

ششم : اوجد دوران القرآن عمرؓ میں لفظ دوران اس کے جعلی ہونے کا قرینہ ہے اور اسی طرح لفظ اوجد بھی کیا یہ کوئی سائنس کی ایجاد تھی کہ اس کے لئے لفظ اوجد بولا گیا اور اَمَرَ یا حَکَمَ عمرؓ وغیرہ کے الفاظ ترک کیسے گئے یا یہ کوئی ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم یا سام میزائل کی ایجاد تھی؟ یہ الفاظ اور ترکیب ہی اس واقعہ کے کوہستانی ایجاد ہونے کی واضح دلیل ہے الغرض روایتی اور درایتی قرائن اس روایت کے جعلی اور بے اصل ہونے پر دال ہیں۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب لکھتے ہیں کہ امیر المؤمنین فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے سوا اور حضرات سے روایات بے سروپا اس مبحث میں مذکور ہیں سب باطل و افتراء ہیں نہ یہ عبارت فتاویٰ سمرقندیہ میں ہے۔ اس پر افتراء ہے اور بے چارہ افتراء کرنے والا عربی عبارت بھی باقاعدہ نہ بنا سکا اپنی ٹوٹی پھوٹی جاہلانہ خرافات کو صحابہؓ و ائمہؒ کی طرف منسوب کیا۔ الخ۔ (العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ ج ۴ ص ۲۰۲)

درۃ البررہ میں امام محمدؒ کی کتاب الحیل کے حوالہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ :

قال الامام محمد اسہل طریقتہ ان یبیع الوارث علی الفقیر مصحفا صحیحا قابلا للقرأۃ بغبن فاحش ثم یہب الفقیر لہ ثم وثم حتی یستتم اعل اللہ یجعلہ فدیتہ فی مقابلۃ الصوم والزکوۃ والمنذورات الخ	حضرت امام محمدؒ نے فرمایا کہ سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ میت کا وارث ایک صحیح اور قابل قرأت قرآن کریم کا نسخہ فقیر پر بھاری رقم کے عوض (حیلہ کرتے ہوئے) فروخت کر دے۔ پھر فقیر وارث کو ہبہ کرے پھر وہ فقیر کو دے۔ حتیٰ کہ نماز، زکوٰۃ اور منذورات وغیرہ کا حساب مکمل ہو جائے۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کا فدیہ بنا دے۔

مگر اس عبارت سے بھی مدعیٰ ثابت نہیں ہوگا۔ اوّلاً اس لئے کہ کتاب الحیل امام محمدؒ کی تالیف ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ملا ابو محمد عبد القادر القرشی الحنفیؒ (المتوفی ۵۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ :

قال ابو سلیمان الجرجانیؒ کذبوا علی محمدؒ لیس لہ کتاب الحیل انما کتاب الحیل للوراق۔ (جواہر المضیہ ج ۲ ص ۲۰۸)	امام ابو سلیمان جرجانیؒ کہتے ہیں کہ لوگوں نے امام محمدؒ پر جھوٹ کہا ہے۔ کتاب الحیل ان کی نہیں ہے۔ کتاب الحیل تو وراق کی لکھی ہوئی ہے۔

جب کتاب الحیل ہی امام محمدؒ کی نہیں تو اس حیلہ کی اُن کی طرف نسبت کیسے صحیح ہے؟ خصوصاً جبکہ ان کی مشہور کتابیں جو ظاہر الروایۃ کا مدار ہیں اس سے بالکل عاری ہیں۔

وثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ مخلوق تو غبن فاحش کو قبول نہ کرے اور جب خدا تعالیٰ سے معاملہ ہو، تو فقیر کو غبن فاحش پر قرآن دیا جائے۔ یہ مکر اور خداع کیوں؟

کارہا باخلق آری جملہ راست ۔۔۔ باخدا تدبیر وحیلہ کے روا است

مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں :

"عرض : اسقاط کی حالت میں چند سیر گندم اور قرآن کریم دیا جاتا ہے، اس میں کل کفارا ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ ارشاد : جتنی قیمت قرآنِ عظیم کی بازار میں ہے، اُتنے کا کفارہ ادا ہو جائے گا"۔ (احکامِ شریعت حصہ سوم ص ۱۴۵)۔

مفتی احمد یار خاں صاحب لکھتے ہیں کہ "پنجاب میں جو عام طور پر یہ مروّج ہے کہ مسجد سے قرآن پاک

کا ایک نسخہ منگایا، اُس پہ ایک روپیہ رکھا اور چند لوگوں نے اُس کو ہاتھ لگایا، پھر مسجد میں واپس کر دیا اس سے نمازوں کا فدیہ ادا نہ ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی کوئی قیمت ہی نہیں، لہٰذا جب قرآن شریف کا نسخہ خیرات کر دیا، سب نمازوں کا فدیہ ادا ہوگیا۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ اس میں اعتبار تو قرآن کے کاغذ لکھائی چھپائی کا ہے۔ اگر دو روپیہ کا یہ نسخہ ہے تو دو روپیہ کی خیرات کا ثواب ملے گا۔ ورنہ پھر وہ مال دار جن پر ہزارہا روپیہ سالانہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ کیوں اتنا خرچ کریں۔ صرف ایک قرآن پاک کا نسخہ خیرات کر دیا کریں۔ غرضکہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے"۔ بلفظہٖ (جاء الحق ص۲۶۶)۔

اور فتاویٰ نور الہدیٰ میں ہے کہ "مصحفے درست وتمام بیارند کہ در ملک آں اسقاط کنندہ باشد باکسے بہ بخشد وقبول کند" الخ (ص۲۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم اسقاط کنندہ کی ملک میں ہو اور جتنی قیمت اس کی بازار میں ہو اتنی ہی قیمت کے عوض میں وہ کسی فقیر کی ملک کر دیا جائے۔ اور یہ جو حیلۂ دورانِ قرآن کے قائل ہیں وہ اس کی قید بھی لگاتے ہیں کہ:

ان دوران القرآن لازم عند الافلاس و عدم قدرة اداء الفدیة۔ (المجموع للرقعات)۔ — دورانِ قرآن اُس وقت لازم ہے جب کہ کوئی مفلس ہو، اور فدیہ کی ادائیگی پہ قدرت نہ رکھتا ہو۔

مگر صوبہ سرحد اور اسی طرح دیگر بعض علاقوں میں یہ رسم اتنی عام ہے کہ امیر و غریب اور شاہ و گدا سب کے لئے دورانِ قرآن کیا جاتا ہے اور اس حیلہ در حیلہ کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ اصل حقیقت کی جھلک ہی نظر نہیں آتی۔ تمام مسلمانوں کا عموماً اور علماء کرام کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ وہ جملہ بدعات سے اور خصوصاً دورانِ قرآن کی رسم سے خود بھی اجتناب کریں اور اپنے مسلمان بھائیوں کو بھی اس رسم کی قباحت سے روشناس کریں۔ ؏ بر رسولاں بلاغ باشد و بس!

غرضیکہ حیلۂ دورانِ قرآن کا صحیح اور معقول ثبوت نہ تو کسی عقلی دلیل سے ہے اور نہ نقلی سے۔ نہ خیر القرون میں اس کا ثبوت اور رواج تھا اور نہ ذمہ دار حضرات فقہاء کرام اور حضرات محدثین عظامؒ اس سے آگاہ ہیں۔ اور جنہوں نے یہ روایت نقل کی ہے، فنِ اسماء الرجال کے ماتحت اُن کی نقل کسی صورت میں معتبر نہیں ہے۔

اس لئے علماءِ کونش وچھلی واگرور وملکری وڈیشان ومتاکوٹ وتندھاڑ والائی وکوہستان ودرہ پگہ ٹمنگ وسچاں اور رش وغیرہ سے علی الخصوص یہ دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ اس رسمِ بد کو بند کرنے میں پیش قدمی کریں۔ ان میں اہلِ علم اور اہلِ فہم اور انصاف پسند حضرات کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ وہ اس پر پوری توجہ کریں، اور دیگر مختلف علاقوں کے علماء اہلِ حق سے بھی گذارش ہے، کہ وہ بھی اس رسمِ قبیح سے گریز کریں اور اس کو بند کرنے میں انتہائی کوشش فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ آمین ثم آمین!

عبدالنبی اور عبدالرسول وغیرہ نام رکھنا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر نام ہے (وہ جسمیں لفظ عبد کی اللہ کی طرف اضافت ہو مثلاً) عبداللہ اور عبدالرحمٰن وغیرہ اور پھر وہ نام جن میں محمدؐ کا نام ہو مثلاً محمد ابراہیم اور محمد اسمٰعیل وغیرہ۔ لفظ عبد ایک مشترک لفظ ہے، عبد کے معنی عابد کے بھی آتے ہیں اور خادم وغلام کے معنی بھی آتے ہیں۔ جب اس کی اضافت غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد خادم اور غلام ہوتی ہے جیسے صَالِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ۔ لیکن نام اور تسمیہ کے موقع اور محل پر عموماً یہ لفظ عبادت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور ایسے موقع پر اس کے متبادر معنی یہی ہیں، اسلئے ایسا نام ایہامِ شرک سے خالی نہیں ہے جس سے احتراز کرنا نہایت ضروری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

ومنها انهم كانوا يسمّون ابناءهم عبد العزّٰى وعبد شمس ونحو ذالك الى ان قال فهذه اشباح وقوالب للشرك نهى الشارع عنها لكونها والبا له والله اعلم۔ (حجۃ اللہ ج ا ص ۶۳)

اقسامِ شرک میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام عبدالعزیٰ اور عبد شمس وغیرہ رکھتے تھے (پھر فرمایا) کہ یہ نام شرک کے قالب اور اس کے سانچے ہیں، اس لئے شارع نے ان ناموں سے منع کیا ہے۔

فائدہ: نسائی شریف میں اس کی تصریح ہے کہ عُزّٰی ایک عورت (پری) تھی جس کی لوگ پرستش کیا کرتے تھے۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو

حضرت خالدؓ بن الولید نے قتل کیا تھا۔ (تفسیر ابنِ کثیر ج ۴ ص ۲۵۴)۔

امام ابنِ حجر مکیؒ لکھتے ہیں کہ:

ویحرم ملك الاملاك لان ذٰلك لیس لغیر اللّٰه وکذا عبد النّبی وعبد الکعبة او الدّار اوعلیؓ او الحسن لایهام الشّرك۔ (شرح منہاج ج ص)	کسی کا شہنشاہ نام رکھنا حرام ہے کیونکہ یہ نام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسی طرح عبد النبی اور عبد الکعبہ اور عبد الدار اور عبد العلیؓ اور عبد الحسنؓ نام بھی صحیح نہیں ہیں کیونکہ ان میں ایہامِ شرک ہے۔

لفظ علیؓ چونکہ اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے اور قرآن کریم میں اَلْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ وغیرہ آیا ہے تو اگر کسی کی مراد حضرت علیؓ نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہو تو عبد العلی نام بلا کراہت جائز ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ:

واما ما اشتهر من التسمیة بعبد النّبی فظاهره کفر الا ان اراد بالعبد المملوك (شرح فقہ اکبر ص ۲۳۵ طبع کانپور)	عبد النّبی نام جو مشہور ہے بظاہر یہ کفر ہے مگر یہ کہ عبد سے مملوک مراد ہو تو پھر کفر نہ ہوگا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کفر نہیں تو جائز ہو گیا بلکہ یہ بہرحال ناجائز ہوگا۔ چنانچہ خود ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یجوز نحو عبد الحارث ولا عبد النّبی ولا عبرة بما شاع فیما بین النّاس۔ (مرقات ج ۹ ص ۱۰۶)	کہ عبد الحارث، اور عبد النّبی نام رکھنا جائز نہیں ہے اور لوگوں میں جو یہ نام رائج ہیں، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اور شاہ عبد العزیز صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شرک چنانچہ در عبادت و قدرت می شود ہمیں قسم شرک در تسمیہ ہم میشود ایں قسم نام نہادن شرک در تسمیہ است ازیں ہم احتراز لازم است۔" (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۵۶)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

"پرستش آنست کہ سجدہ کند یا طواف نماید یا نام او را بطریق تقرب ورد سازد یا ذبح جانور بنام

او کند یا خود را بندۂ فلانے بگوید و ہر کہ از مسلمانان جاہل یا اہلِ قبور ایں چیز بالعمل آرد فی الفور کافر میگردد واز مسلمانی مے برآید" (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص۳۳)

نوٹ : جو جانور غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو جس میں تقرّب کی نیّت شامل ہو، وہ بہر حال حرام ہے گو وقتِ ذبح اس پر بسم اللہ پڑھی جائے۔ چنانچہ شاہ عبد العزیز صاحب نے تفسیرِ عزیزی میں اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تفسیر میں اس پر مبسوط بحث کی ہے اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا کہ "خواہ وقتِ ذبح نامِ خدا بگیرد یا نہ"۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص۱۵۶) - راقم الحروف نے اس پہ الگ کتاب لکھی ہے۔ اگر طبع ہو گئی، تو غیر اللہ کے نام پر جانور نامزد کرنے کے جملہ گوشوں پر سیر حاصل بحث اس میں موجود ہے۔ و التوفیق بید اللہ تعالیٰ۔ مستقل کتاب تو ابھی تک طبع نہیں ہو سکی البتہ تنقیدِ متین میں اس مسئلہ کی بقدرِ ضرورت مدلل بحث آچکی ہے۔

مولانا عبد الحی صاحب لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ :

سوال : عبد النّبی یا مانند آں نام نہادن درست است یا نہ ؟

جواب : اگر اعتقاد ایں معنی است کہ ایں کس عبد النّبی نام دارد و بندۂ نبی است عین شرک است واگر عبد بمعنی غلام مملوک است آں ہم خلافِ واقع است واگر مجازاً عبد بمعنی مطیع و منقاد گرفتہ شود مضائقہ ندارد لیکن خلافِ اولیٰ است۔ روی مسلم عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یقولن احدکم عبدی ولا امتی کلکم عباد اللہ وکل نساءکم اماء اللہ ولکن لیقل غلامی وجاریتی وفتائی وفتاتی انتھٰی بلفظہٖ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص۹۵)۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

استفتاء : کسی کا نام عبد الرّسول یا عبد الحسین وغیرہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟ بیّنوا توجروا۔

ھو المصوب، ایسا نام جس میں اضافت عبد کی طرف غیرِ خدا کی ہو، شرعاً درست نہیں ہے اور اگرچہ صرف اس قسم کے نام رکھنے سے حکمِ شرک کا نہ ہو، بسبب احتمال اس کے کہ عبد سے مراد خادم و مطیع ہے مگر بوئے شرک سے ایسا نام رکھنا خالی نہیں ہے۔ قرآن و حدیث اس قسم کے نام رکھنے کی ممانعت پہ دال ہیں، اور علماء اُمّتِ محمدیہ نے بھی جا بجا اس کی تصریح کی ہے الخ بلفظہٖ (مجموعہ فتاویٰ جلد دوم ص۳۲)۔

مفتی احمد یار صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے کہ "یہ ممانعت کراہتِ تنزیہی کے طور پر ہے کہ عبدی کہنا بہتر نہیں بلکہ غلامی کہنا اولیٰ ہے" (بلفظہٖ جاء الحق ص۳۶۳) اور پہلے لکھا ہے کہ جب عبد کو اللہ کی طرف نسبت کیا جاوے گا تو اس کے معنی عابد کے ہوں گے اور جب غیر اللہ کی طرف نسبت ہوگی تو معنی ہوں گے خادم غلام۔ لہٰذا عبد النبی کے معنی ہوئے نبی کا غلام"۔ (ص۳۶۲)۔

ان دونوں عبارتوں کو ملا کر نتیجہ یہ نکلا کہ غیر اللہ کی طرف عبد کی نسبت کراہتِ تنزیہی سے خالی نہیں ہے، اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں کہ ایہامِ شرک سے خالی نہیں، گو شرک کا فتویٰ نہ لگایا جائے گا بقول مولانا عبد الحیؒ وغیرہ مگر فتویٰ نہ لگانے سے اس کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال ایسے موہمِ شرک نام سے بچنا روحِ اسلام کے عین مطابق ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کا کمال | مفتی صاحب لکھتے ہیں: "عبد النبی، عبد الرسول، عبد المصطفیٰ، اور عبد العلی وغیرہ نام رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح اپنے کو حضور علیہ السلام کا بندہ کہنا جائز ہے۔ قرآن و حدیث و اقوالِ فقہاء سے ثابت ہے"۔ (جاء الحق ص۳۶۱)

ایک طرف تو مفتی صاحب اس قسم کے نام کو مکروہ تنزیہی کی مد میں رکھتے ہیں اور دوسری طرف قرآن و حدیث اور اقوالِ حضرات فقہاء سے اس کو ثابت کرتے ہیں۔ جب قرآن و حدیث سے ثابت ہے تو پھر مکروہِ تنزیہی کیسا؟ پھر قرآن کریم کی آیت قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا (الآیۃ) سے یہ احتمال پیدا کرنا کہ حضور علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپ فرما دو، اے میرے بندو۔ یہ سراسر باطل اور قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کسی بشر کو یہ لائق ہی نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نبوت، کتاب اور حکمت دی ہو ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ (الآیۃ) کہ وہ لوگوں سے یہ کہے، کہ تم میرے بندے بن جاؤ (پارہ ۳۔ آل عمران رکوع ۸)۔ الغرض یہ معنی کرنا کہ یاعبادی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لوگوں کو اپنا بندہ فرما رہے ہیں، قرآن کریم کے سراسر خلاف ہے۔ باقی حضرت عمرؓ کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ فرمانا کہ کنت عبدہ وخادمہ بصورتِ صحتِ حدیث اس سے خادم اور غلام مراد ہے کیونکہ قد کنت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فکنت عبدہٗ وخادمہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی زندگی میں تھا۔ ورنہ معیت اور کنت عبدہٗ کی حاجت ہرگز نہ تھی، یوں فرماتے میں اب بھی آپ کا عبد اور بندہ ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں چونکہ حضرت عمرؓ نے ہر طرح آپ کی غلامی اور خدمت اختیار کی تھی، اس لئے انہوں نے یہ فرمایا۔ اس سے بندہ کا ترجمہ کرنا باطل ہے۔ رہا مولانا رومؒ وغیرہ کا ارشاد تو وہ خود قابلِ تاویل ہے اس پر فتویٰ کی بنیاد ہرگز نہیں رکھی جا سکتی۔ گزر چکا ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب بھی ایسے نام کو کراہتِ تنزیہی کی مد میں رکھتے ہیں مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ: "ہاں اگر اس زمانہ میں دیوبندیوں وہابیوں کو چڑانے کے لئے یہ نام رکھے تو بہت باعثِ ثواب ہے" بلفظہٖ (جاء الحق ص۳۶۱) مفتی صاحب کو عجیب وغریب محکمہ افتاء ہاتھ آیا ہے کہ جو چیز فی نفسہٖ مکروہِ تنزیہی بھی ہو، مگر چونکہ دیوبندیوں، وہابیوں کو چڑانا کارِ ثواب ہے لہٰذا یہ نام باوجود مکروہِ تنزیہی ہونے کے کارِ ثواب ہیں سبحان اللہ تعالیٰ! مفتی صاحب کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ ان کا مذہب تو دیوبندیوں وہابیوں کی مخالفت کرنا ہے، اگرچہ دیوبندی اپنے دعاوی پر ٹھوس دلائل بھی رکھتے ہوں، اور مفتی صاحب کے پاس بغیر کاغذ کی کشتی کے اور کچھ بھی نہ ہو، مگر مخالفت ضرور کرنی ہے ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کو خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور حق کی تلاش کا سرے سے خیال ہی نہیں، بلکہ صرف دیوبندیوں کی مخالفت سے ثواب کے متلاشی ہیں۔ شوق سے کیجئے مگر ایک وقت آنے والا ہے جس میں دودھ اور پانی اور کھری اور کھوٹی سب حقیقت بن کر سامنے آجائے گی ؎

باش کہ تا طبلِ قیامت زنند
آں تو نیک آید و یا اینِ ما

ابھی بہت کچھ بدعات قابلِ تردید باقی ہیں مگر کتاب کی طوالت کے خوف سے سرِدست انہیں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ایک عاقل اور منصف مزاج کے لئے ان میں کافی عبرت موجود ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ان پر ایک الگ کتاب لکھی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز

ایک حدیث شریف عرض کرکے ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں۔

امام عبدالرزاقؒ، معمرؒ سے اور وہ زیدؒ سے اور وہ حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں، وُہ فرماتے ہیں کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم عمل قلیل فی سنة خیر من عمل کثیر فی بدعة ومن استن بی فھو منّی ومن رغب عن سنّتی فلیس منّی۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ ص ۲۹۱ طبع بیروت)

آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم نے فرمایا کہ سُنّت کے مطابق تھوڑا سا عمل بھی اُس عمل کثیر سے بہت بہتر ہے جو بدعت کے طور پر کیا جائے۔ اور نیز فرمایا کہ جس نے میری سُنّت پر عمل کیا وہ میرا ہے اور جس نے میری سنّت سے اعراض کیا وہ میرا نہیں ہے۔

خاتمہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ اہلِ بدعت حضرات کے الزامی اعتراضات کے جوابات بھی ہدیۂ قارئین کرام کر دیئے جائیں تاکہ بحث مکمل ہو جائے، اور مسئلہ زیرِ نظر کا یہ پہلو بھی تشنہ نہ رہے۔

پہلا اعتراض:

قرآنِ کریم کا کتابی صورت میں جمع کرنا، اس پر اعراب لگانا اور موجودہ ترتیب کے ساتھ اس کو چھاپنا بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا ثبوت نہیں ہے۔

الجواب:

امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ:

وقد کان القرآن کتب کلّہ فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السوَر (اتقان ج ۱ صـ۵۷)

قرآن کریم سب کا سب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں لکھا گیا تھا لیکن ایک جگہ میں نہ تھا۔ اور سورتوں میں ترتیب بھی نہ تھی۔

صحیح روایت یہ ہے کہ سورتوں میں ترتیب تھی جیسا کہ بیان ہوگا۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

امام حارث محاسبیؒ کہتے ہیں کہ:

کتابۃ القرآن لیست بمحدثۃ فانہ صلّی اللہ علیہ وسلم کان یامر بکتابتہ (ایضاً صـ۵۸)

قرآن کریم کی کتابت محدث اور بدعت نہیں ہے اسلئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو لکھنے کا حکم دیا تھا۔

حضرت زیدؓ بن ثابت فرماتے ہیں کہ ہم مختلف رقعات سے قرآن کریم کو آپ کے سامنے جمع کرتے تھے

امام حاکمؒ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

فیہ الدلیل الواضح ان القرآن انما جمع فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (المستدرک ج ۲ ص ۶۱۱)

اس میں واضح تر دلیل موجود ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جمع ہو چکا تھا۔

اور حضرت ابنِ لبید انصاریؓ کی یہ روایت کہ وقد اثبت فی الکتاب (المستدرک ج ۱ ص ۹۹، قال الحاکمؒ والذہبیؒ صحیح) بھی اس کی بیّن دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کو کتابی صورت میں جمع کرنے پر رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور بخاری وغیرہ کی یہ حدیث تو آخر مشہور ہی ہے کہ حضرت عمرؓ کے مشورہ سے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں قرآن کریم جمع کرایا تھا (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۹۳ وغیرہ) اور قرآن کریم کی یہ موجودہ ترتیب حضرت عثمانؓ نے دی ہے اور اسی بنا پر ان کو جامع القرآن کے لقب سے خطاب کیا جاتا ہے (دیکھئے اتقان ج ۱ ص وغیرہ) مگر یہ یاد رہے کہ یہ ترتیب حضرت عثمانؓ کی خانہ زاد اور ایجاد بندہ نہ تھی بلکہ توقیفی تھی اور اس پر ان کے پاس ثبوت موجود تھا۔ چنانچہ امام ابن الحصارؒ کہتے ہیں کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب اور اسی طرح آیات کی ترتیب وحی کے مطابق قائم کی گئی ہے۔ علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں کہ سورتوں کی یہی ترتیب اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوحِ محفوظ میں ہے، اور اسی موجودہ ترتیب سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر سال قرآنِ کریم حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پیش کیا کرتے تھے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ:

کان القرآن علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرتبا سورہ وآیاتہ علی ھذا الترتیب (اتقان ج ۱ ص ۶۲)

قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کی یہی ترتیب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں تھی جو آج ہے۔

اور امام سیوطیؒ یہ فرماتے ہیں کہ:

ترتیب الآیات فی سورھا واقع بتوقیفہ صلی اللہ علیہ وسلم وامرہ من غیر خلاف فی ھذا بین المسلمین۔ (تفسیر اتقان ج ۱ ص ۶۰)

آیات کی سورتوں میں جو ترتیب ہے وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے اور آپ کی توقیف یعنی اطلاع دینے سے ہے اس میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الغرض قرآن کریم کا کتابی شکل میں وجود تو خود حضرت نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں تھا، اور

حضرات خلفاء راشدینؓ نے سرکاری طور پر اس کو جمع کر کے رعایا میں اس کی نشرو اشاعت کی تھی اور اسکی جمع و ترتیب پر تمام حضرات صحابۂ کرامؓ کا اتفاق تھا۔ چنانچہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ :

فھذا عمل لم ینقل فیہ خلاف عن احد من الصحابۃ۔ (الاعتصام ج ۲ ص۲۸۸) جمع قرآن کا یہ عمل ایسا ہے جس میں کسی ایک صحابیؓ کا اختلاف بھی منقول نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدینؓ اور صحابۂ کرامؓ کے عمل کو مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ بدعت کہتے ہیں تو یہ مبارک کام انہیں کو نصیب ہو۔

رہا اعراب کا معاملہ، تو اس میں کافی اختلاف ہے۔ محمدؒ بن اسحاق بن ندیمؒ (المتوفی ۳۸۰ھ) اور قاضی شمس الدین احمدؒ بن خلکانؒ (المتوفی ۶۸۱ھ) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب حجاج بن یوسف (المتوفی ۹۵ھ) نے لگوائے تھے۔ علامہ ابن خلکانؒ کے بیان میں اس کا بھی اختلاف ہے کہ حجاج بن یوسف کے حکم سے اعراب کس نے لگایا؟ ایک قول یہ ہے کہ نصرؒ بن عاصم نے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یحییٰؒ بن یعمر نے۔ لیکن کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے قرآن کریم کا اعراب ابوالاسود دئلیؒ نے لگایا جو حضرت علیؓ کے شاگرد رشید تھے (ماخوذ از حاشیہ الفلاح مضمون مولانا شبلیؒ المتوفی ۱۳۳۲ھ ص۱۹ ذوالقعدہ ۱۳۳۵ھ) اور محدث ابن جوزی کی کتاب تلقیح ص۱۴۶ میں اور حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۹ ص۳۷ میں اور حافظ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص۳۰۵ میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اعراب سب سے پہلے یحییٰؒ بن یعمر (المتوفی ۸۷ھ) نے لگایا تھا۔ بہرکیف حضرات صحابۂ کرامؓ کا دور تھا جس میں قرآن کریم پر اعراب لگایا گیا تھا۔ اگر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں بھی یہ تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کی وفات کے بعد حضرات صحابۂ کرام کا دور باقی رہا ہے کیونکہ حضرت محمودؓ بن لبید کی وفات ۹۶ھ میں اور حضرت محمودؓ بن ربیع کی ۹۹ھ میں اور حضرت ابوامامہ سہل بن حنیفؒ کی ۱۰۰ھ اور حضرت ہرماس بن زیاد باہلیؓ کی ۱۰۲ھ میں اور حضرت ابوالطفیلؓ کی ۱۱۰ھ میں وفات ہوئی ہے (دیکھئے علی الترتیب، تقریب ص۳۴۸، تہذیب ج ۱ ص۶۳، البدایہ والنہایہ ج ۹ ص۱۹۰، تہذیب ج ۱۱ ص۲۸، تہذیب ج ۵ ص۸۳)۔ اور پہلے اس کی پوری بحث گزر چکی ہے کہ خیر القرون کا تعامل شرعی حجت ہے۔

لہ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں، نقطے اور اعراب، ہر دو ہمراہ حروف موضوع شدہ اند زیرا کہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اس کو بدعت کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے اور اس سے سرِمُو تجاوز کرنا درست نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض: جمعہ کے خطبہ سے قبل تقریر کرنا بدعت ہے مگر تم بھی کرتے ہو۔

الجواب: جمعہ کے خطبہ سے پہلے تقریر کا متعدد حضرات صحابہ کرام سے ثبوت ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے تقریر فرمایا کرتے تھے، اور اس میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ جب امام خطبہ دینے کے لئے آتا تو حضرت ابوہریرہؓ اپنی تقریر موقوف کر دیتے تھے۔ (مستدرک ج ۱ ص۱۰۸ و ج ۳ ص۵۱۲ قال الحاکم والذہبیؒ صحیح)۔

ابوالزاہریہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن بسر جمعہ کے دن خطبہ سے قبل وعظ کیا کرتے تھے جب خطیب خطبہ دینے کے لئے آتا تو وہ وعظ بند کر دیتے تھے (حاکم ج ۱ ص۲۸۸ وقالا صحیح)۔

حضرت تمیم داریؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے اجازت طلب کی کہ میں جمعہ کے دن تقریر کیا کروں گا۔ اور اس میں متعدد نصیحت آمیز واقعات بیان کروں گا۔ پہلے حضرت عمرؓ نے انکار فرمایا لیکن حضرت تمیم داریؓ کے اصرار پر انہوں نے اجازت دے دی کہ تم جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں، تقریر کر سکتے ہو۔ (اصابہ فی تذکرۃ الصحابہؓ ج ۱ ص۱۸۴)۔

تیسرا اعتراض: آپ کے زمانہ مبارک میں مسجدوں میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ لہٰذا مسجدوں میں روشنی کا انتظام کرنا بھی بدعت ہے حالانکہ تمہاری مساجد میں بھی روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔

الجواب: امام ابوداؤدؒ نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، باب السّرج فی المساجد۔ اور اس کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم بیت المقدس نماز کے لئے نہیں جا سکتے تو:

فابعثوا بزیت یسرج فی قنادیلہ — تم زیتون کا تیل بھیج دو تاکہ بیت المقدس کی قندیلوں میں روشن کیا جا سکے۔ (ابوداؤد ج ۱ ص۶۶)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بیت المقدس میں چراغ جلانے کے لئے تیل بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ ہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عاری بودن حروف از نقطہ و اعجام باوجود تشابہ صدر بلکہ گاہ تاحین نقط مصحف بودہ ست (اکسیر ص۷۸)۔

البتہ مسجدِ نبوی وغیرہ میں آپ کے زمانۂ مبارک میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ حضرت تمیم داریؓ نے سب سے پہلے مسجد میں چراغ جلایا اور روشنی کا انتظام کیا۔ (ابنِ ماجہ ص۵۶ وتہذیب ج ۱ ص۵۱۲)۔

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ کی اجازت سے حضرت تمیم داریؓ نے مسجد میں چراغ جلائے۔ (الفاروق ج ۲ ص۱۴۳)۔

فتوح البلدان ص۴۶ اور الاحکام السلطانیہ للماوردیؒ ص۱۵۴ اور مرآۃ الحرمین ج ۱ ص۲۳۵ لابراہیم رفعت باشاؒ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حرم محترم کے گرد دیوار کھنچوائی اور اس سے یہ کام لیا کہ اس پر رات کو چراغ جلائے جاتے تھے۔

فائدہ: مسجد میں جتنی روشنی کی ضرورت ہے اُس سے زیادہ چراغ روشن کرنے حرام ہے چنانچہ ابو حنیفہ ثانی علّامہ ابنِ نجیم الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یجوز ان یزاد علیٰ سراج المسجد لان ذٰلك اسراف سواء كان ذالك فی رمضان اوغیرہ الی ان قال وفی القنیۃ واسراج السرج الكثیرۃ فی السكك والاسواق لیلۃ البرأۃ بدعۃ وكذا فی المساجد۔ (البحرالرائق ج ۵ ص۲۱۵)۔

مسجد میں ضرورت سے زیادہ چراغ جلانے جائز نہیں ہیں کیونکہ یہ اسراف ہے، رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں۔ پھر فرمایا کہ قنیہ میں ہے کہ شب برأت میں کوچوں اور بازاروں میں بہت سے چراغ جلانا بدعت ہے اور اسی طرح مسجدوں میں بھی ضرورت سے زیادہ چراغ جلانا بدعت ہے۔

حضرات فقہاء احنافؒ کا تو یہ قول ہے۔ مگر چودھویں صدی کے مفتی جو بزعمِ خود حنفیت کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں یہ ارشاد فرماتے ہیں: "پنجاب اور یوپی و کاٹھیاوار میں عام رواج ہے کہ رمضان میں ختمِ قرآن تراویح کی شب میں مساجد میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ بعض دیوبندی اس کو بھی شرک و حرام کہتے ہیں یہ محض اُن کی بے دینی ہے مساجد کی زینت ایمان کی علامت ہے۔" (بلفظہ جاء الحق ص۲۹۵)۔

مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ ضرورت سے زیادہ چراغ جلانے کو دیوبندی ہی منع کرتے ہیں یا علّامہ ابنِ نجیم حنفیؒ وغیرہ بھی ان کے ہم نوا ہیں، اور کیا یہ بے دینی صرف دیوبندیوں کے حصّہ میں آئے گی یا علّامہ

ابنِ نجیمؒ وغیرہ احناف کو بھی اس بے دینی سے کوئی حصہ ملے گا؟ بیّنوا و توجروا۔ یہ یاد رہے کہ کسی دیوبندی نے ضرورت سے زائد چراغ جلانے کو شرک تو نہیں کہا البتہ فقہاء کرام کی پیروی میں بدعت ضرور کہتے ہیں۔ اور بدعت کا ارتکاب بھی ممنوع و حرام ہوتا ہے۔

لطیفہ: مفتی احمد یار خان صاحب نے اپنی معتبر و مستند تفسیر روح البیان شریف سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کے مینارہ پر ایسی روشنی کی تھی کہ بارہ میل مربع میں عورتیں اس کی روشنی میں چرخہ کاتتی تھیں الخ (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۹۱)۔

چوتھا اعتراض:

مسجدوں میں فرش اور چٹائی کا انتظام بھی بدعت ہے کیونکہ آپ کے زمانۂ مبارک میں ایسا نہیں ہوا اور تم لوگ بھی اس کا اہتمام کرتے ہو۔

الجواب:

یہ ٹھیک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجدوں میں چٹائی وغیرہ کا انتظام نہ تھا (دیکھئے میزان الاعتدال ج ۲ ص۲ وغیرہ) لیکن یہ انتظام حضرت عمرؓ کے عہد میں مکمل ہوا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ:

"فرش کا انتظام بھی اوّل حضرت عمرؓ ہی نے کیا لیکن یہ کوئی پُر تکلف قالین اور شطرنجی کا فرش نہ تھا بلکہ اسلام کی سادگی یہاں بھی قائم تھی یعنی چٹائی کا فرش تھا، جس سے مقصود یہ تھا کہ نمازیوں کے کپڑے گرد و خاک میں آلودہ نہ ہوں" - (الفاروق ج ۲ ص۱۴۳)

فائدہ: مسجد میں سب سے پہلے خوشبو جلانے کا باقاعدہ انتظام بھی حضرت عمرؓ نے کیا (خلاصۃ الوفا، ص۱۷۴)۔ اور مسجد میں سب سے پہلے پردے حضرت عثمانؓ نے نصب کئے تھے (مرآۃ الحرمین ج ۱ ص۲۳۵)۔

پانچواں اعتراض:

مسجدوں میں محراب بھی بدعت ہے کیونکہ آپ کے پاک زمانہ میں محراب نہ تھی اور تمہاری مسجدوں میں بھی محراب کا وجود ہوتا ہے۔

الجواب :

امام نوویؒ شرح مہذب ج ۳ ص۲۰۲ میں اور علامہ سمہودیؒ وفاء الوفا ج ۱ ص۳۶۷ میں لکھتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے وقت میں مسجد میں محراب کا وجود نہ تھا لیکن علّامہ بدرالدین عینی الحنفیؒ عمدۃ القاری ج ۲ ص۲۹۷ میں لکھتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے آکر کعبہ کی جہت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے لئے محراب بنائی تھی۔ اور علّامہ مقریزیؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گو محراب کا کچھ نقشہ پہلے تھا مگر محرابِ مجوّف (جوف دار طاق کی شکل میں جیسا کہ آج کل عموماً مسجدوں میں رواج ہے) خلیفہ راشد حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے بنوائی تھی۔ یہی علّامہ مقریزیؒ لکھتے ہیں کہ :۔

فاما محاریب الصحابۃؓ التی بفسطاط مصر والاسکندریۃ فان سمتہا یقابل مشرق الشتاء۔ (مقریزی ج ۲ ص۲۵۷)۔

مصر اور اسکندریہ کے دیہات میں حضرات صحابہ کرامؓ نے جو محراب بنائے، اُن کا رُخ اس طرف ہے جہاں سے موسم سرما میں سورج طلوع ہوتا ہے۔

اور امام قاضی خان الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ :

والمحاریب التی نصبتہا الصحابۃؓ والتابعون الخ (ج ۱ ص۳۳)۔

وہ محراب جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے بنائے ہیں (ان کو اسی حالت میں رہنے دو)۔

الحاصل علّامہ عینیؒ کی تحقیق کے موافق محرابیں آپ کے عہدِ مبارک میں موجود تھیں اور دوسرے محقّقین کی تحقیق کی رُو سے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین کے پاک ہاتھوں نے محراب بنائے تھے۔

چھٹا اعتراض :

آپؐ کے زمانہ میں مسجدوں میں مینار نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ بدعت ہیں حالانکہ تمہاری مساجد میں بھی مینار ہوتے ہیں۔

الجواب :

مینار اصل میں اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ ان پر اذان ہو اور دُور تک لوگ اذان کی آواز سُنیں۔

بڑے بڑے شہروں میں ایک سے زیادہ میناروں پر بیک وقت اذانیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ باب الاذان فوق المنارۃ (ج ا ص۷۷)۔ اور حضرت ابو برزہ اسلمیؓ (المتوفی ۶۵ھ) وغیرہ فرماتے ہیں کہ :

من السنۃ الاذان فی المنارۃ والاقامۃ فی المسجد۔ (الزیلعی ج ا ص۲۹۳ و مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۲۴ ج۱)
سنّت یہ ہے کہ اذان منارہ پر دی جائے اور اقامت مسجد میں ہو۔

اصولِ حدیث کا مسئلہ ہے کہ مطلق سنّت سے آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کی سنّت مراد ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام ج ۲ ص۳۹ میں بحوالہ اصابہ لکھا ہے کہ مصر کی مسجدوں میں مینار کا رواج نہ تھا حضرت مسلمہؓ بن مخلد انصاریؓ (المتوفی ۶۲ھ) نے تمام مسجدوں میں مینارے بنوائے۔ قاضی شوکانیؒ (المتوفی ۱۲۵۵ھ) فرماتے ہیں کہ مساجد میں مینار قائم کرنے کی اصل غرض تو یہ ہے کہ دُور کے آدمی اذان سُن سکیں، اور یہ ایک جائز مصلحت ہے الخ۔ (ارشاد السائل الی دلیل المسائل۔ بحوالہ نُقطۃ العجلان ص۹۷ نواب صدیق حسن خانؒ)۔

ساتواں اعتراض :

تمہارے مدارس میں جمعہ کے دن چھٹی ہوتی ہے، یہ بھی بدعت ہے۔

الجواب :

نمازِ جمعہ کے لئے خاص اہتمام کرنا قرآن سے ثابت ہے اور پھر جمعہ کے دن نئے یا دُھلے ہوئے کپڑے پہننا اور غسل و مسواک کرنا، پھر سب سے پہلے مسجد میں جا کر بیٹھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس لئے اگر مالا یتم الواجب الا بہ فھو واجب کے قاعدہ کے تحت جمعہ کی چھٹی کی جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ علاوہ ازیں عقد الفرید ج ا ص۴۹ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے فوج کو یہ حکم تھا کہ وہ ہمیشہ جمعہ کے دن مقام کرے اور پورے ایک شب و روز قیام رکھے، تاکہ لوگ دم لیں اور ہتھیاروں اور کپڑوں کو درست کرلیں۔

فائدہ : اسی طرح رمضان المبارک میں مخصوص عبادت دیگر بشیتر مشاغل سے فارغ ہو کر ہی

صحیح طور پر ادا کی جاسکتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر اسلامی مدارس میں ماہ رمضان کی تعطیلات ہو جاتی ہیں تاکہ طلباء کرام اپنے گھروں میں جا کر خاطر خواہ آرام کر سکیں اور روزے و تراویح اور اعتکاف وغیرہ کے لئے ان کو فراغت مل سکے۔ ہر آدمی اس عبادت کو بھی بغیر تعطیل اور مکمّل چھٹی کے ادا نہیں کر سکتا۔ کما لا یخفی۔

آٹھواں اعتراض :

مدارس کا قیام بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے زمانہ میں مدرسے نہ تھے حالانکہ سب سے زیادہ مدرسے اور مدرس اور طلبہ تمہاری ہی جماعت کے ہوتے ہیں لہٰذا تم بھی بدعتی ہوئے۔

الجواب :

فریقِ مخالف کا یہ استدلال بھی نہایت ہی لچر اور کمزور ہے۔ کیونکہ علمِ دین کی نشر و اشاعت جس طرح بھی ہو سکے اور جیسے بھی اور جہاں بھی ہو، یہ خود شریعت حقّہ کا منشا ہے۔ اس کے لئے جو صورت بھی اختیار کی جائے، درست اور صحیح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اصحابِ صُفّہ کیلئے (جو دُور دراز مقامات سے طلبِ علم کیلئے حاضر ہوتے تھے) اسی لئے مسجد کے علاوہ اس کے قریب ہی صُفّہ بنوایا تھا تاکہ طلبہ کے لئے سہولت رہے، اور ان کو کوئی دقّت پیش نہ آئے۔ امام ابو اسحاق غرناطیؒ لکھتے ہیں کہ :

واما المدارس فلم یتعلق بها امر تعبدی یقال فی مثله بدعة الا علی فرض ان یکون من السنّة ان لا یقرا العلم الا بالمساجد وهذا لا یوجد بل العلم کان فی الزمان الاوّل یبثّ بکلّ مکان من مسجد او منزل او سفر او حضر او غیر ذالك حتّٰی فی الاسواق فاذا اعدّ احد من النّاس مدرسة یعنی باعدادها الطلبة فلا یزید ذالك علیٰ اعداد لا له منزلا من منازله

بہر حال مدارس تو ان کے ساتھ امر تعبدی متعلق نہیں ہے۔ تاکہ یہ کہا جائے کہ یہ بدعت ہیں۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سنّت صرف یہ ہے کہ علم فقط مسجدوں میں پڑھا جائے تو الگ بات ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ علم تو زمانۂ اوّل میں بھی ہر جگہ پھیلایا جاتا تھا۔ مسجد میں بھی اور گھر میں بھی، سفر میں بھی اور حضر وغیرہ میں بھی حتّٰی کہ بازاروں میں بھی علم کی اشاعت ہوتی رہی۔ تو اگر کوئی شخص مدرسہ بنا دے اور مقصد یہ ہو کہ طلبہ کو آرام رہے تو اُس نے منزل اور دیوار

اوحائطا من حوائطه او غیر ذٰلك فاین مدخل البدعة ھاھنا؟ (الاعتصام ج ا ص۲۷۲)	وغیرہ کے علاوہ اور کیا زیادہ کیا ہے؟ تو اس میں بدعت کا دخل ہی کیا ہے؟ (محصلہ)

نواں اعتراض :

مدارس میں دورۂ حدیث وغیرہ کا نصاب مقرر کرنا اور امتحان لینا بھی بدعت ہے ۔

الجواب :

اہل عرب اور حضرات صحابہ کرام کی مادری زبان ہی عربی تھی - وہ صرف و نحو اور دیگر مبادی علوم کے حاصل کرنے کے بغیر بھی قرآن کریم اور حدیث شریف کو سمجھ سکتے تھے ۔ بخلاف عجمی لوگوں کے کہ ان کے لئے قرآن و حدیث وغیرہ تک اُس وقت تک ہرگز رسائی نہیں ہو سکتی، جبتک کہ وہ مبادی حاصل نہ کرلیں ۔ اسی ضرورت کے پیش نظر خلیفۂ راشد حضرت علیؓ نے ابو الاسود دئلی کو یہ امر ارشاد فرمایا کہ وہ اس طریق کا ایک علم ضبط کرے جس سے فہم قرآن میں مدد ملے اور غلطی واقع نہ ہو (دیکھئے متن متین ص۳ و اقتراح للسیوطیؒ ص۸۲ والبدایہ والنہایہ ج ۸ ص۳۱۲ وغیرہ) - اس لئے اگر طلبہ کے لئے قرآن و حدیث کے صحیح طور پر حاصل کرنے کے لئے کوئی نصاب حضرات سلف صالحینؒ نے تجویز کیا ہے تو صحیح ہے اور مالایتم الواجب الا بہ فھو واجب کے قاعدہ کے تحت مبادی کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے رہا امتحان کا سوال تو یہ بھی ہرگز بدعت نہیں ہے - امام بخاریؒ نے صحیح بخاری ج ا ص۱۴ میں ایک مستقل باب یوں قائم کیا ہے :

باب طرح الامام المسئلة علی اصحابه لیختبر ما عندھم من العلم ۔	باب امام کا اپنے ساتھیوں پر کوئی ایسا سوال وارد کرنا جس سے اُن کے علم کا امتحان ہو سکے ۔

پھر اس کے نیچے یہ روایت پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اپنے حضرات صحابہ کرامؓ سے یہ سوال کیا کہ ایسا درخت بتاؤ جس کے پتے نہیں جھڑتے وہ مسلم کی مثال ہے ۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے علم کے مطابق جنگل کے درخت گنوا دیئے ۔ مگر صحیح جواب سوائے حضرت ابن عمرؓ کے اور کسی کو نہ سوجھا ۔ لیکن حضرت ابن عمرؓ بھی کم سن ہونے کی وجہ سے خاموش رہے ۔ پھر آپؐ نے خود بتایا کہ

وہ کھجور کا درخت ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد نظیریں کتبِ احادیث میں امتحان کی موجود ہیں۔

دسواں اعتراض :

احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بدعت ہے۔

الجواب :

خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں حدیثیں لکھی جاتی تھیں حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں کسی کو معلوم نہیں۔ مگر ہاں عبداللہ بن عمروؓ کو، کیونکہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا (بخاری ج ۱ ص ۲۲ وغیرہ) حضرت ابوہریرہ کی کُل احادیث کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ۵۳۷۴ ہے اور تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ صحیفہ ابوہریرہؓ کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ طبع ہوا ہے جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے کتابی شکل میں جمع کیا تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے صحیفہ کا نام صادقہ کتبِ تاریخ میں آتا ہے۔ الغرض یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں حدیثیں نہیں لکھی جاتی تھیں اور کتابی شکل میں جمع نہ ہوتی تھیں، ایک سراسر بہتان ہے۔ اس پر منکرینِ حدیث کے رد میں ناچیز کی کتاب "شوقِ حدیث" کا مطالعہ کریں۔ اس کے مطالعہ کے بعد انشاء اللہ تعالےٰ اس مسئلہ کے اہم گوشے حل ہوجائیں گے اور منکرینِ حدیث اور ان کے ہم نوا بیخ پا ہوجائیں گے و ذٰلك بمنّه و توفیقه تعالیٰ صدق من قائل وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

گیارھواں اعتراض :

تنخواہ لے کر پڑھانا اور ختمِ بخاری کرنا بدعت ہے۔

الجواب :

پہلے پوری تفصیل درج کی جاچکی ہے کہ اگرچہ بعض حضرات متقدمین کا اس میں کچھ اختلاف تھا۔ مگر متاخرین نے (جن میں صاحبِ ہدایہ ج ۴ ص ۱۵ بھی ہیں اور فرماتے ہیں وعلیه الفتویٰ اور امام

قاضی خانؒ بھی جواز کا فتویٰ نقل کرتے ہیں (ج ۴ ص۴۹۷) - اور امام سرخسیؒ بھی ہیں اور فرماتے ہیں نفتی بالجواز (بحوالہ البنایہ ج ۳ ص۶۵۵) جواز کا فتویٰ دیا ہے - اور بحر الرائق وغیرہ کا حوالہ پہلے گذر چکا ہے اور حضرات خلفاء راشدینؓ خود بھی نماز و خطبہ اور قضا وغیرہ پر بیت المال سے روزینہ لیا کرتے تھے - اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہ نے باقاعدہ سرکاری طور پر ائمہ اور مدرسین اور مؤذنین کیلئے تنخواہیں مقرر کی تھیں - تفصیل گزر چکی ہے ، اعادہ کی ضرورت نہیں - باقی بیماری اور مصیبت وغیرہ کے وقت قرآن کریم اور بخاری شریف کا پڑھ کر اس پر اُجرت لینا بھی جائز ہے - حضرت ابو سعید الخدریؓ کی روایت اور حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارتیں پہلے عرض کی جا چکی ہیں - علامہ بدر الدین عینی حنفیؒ لکھتے ہیں یعنی کہ :

والرقیة نوع مداواة والمأخوذ علیها جعل و المداواة یباح اخذ الاجر علیها (البنایہ ج ۴ ص۶۵۴)

جھاڑ پھونک علاج کی ایک قسم ہے - اُس پر اُجرت لینا جائز ہے -

حضرات ! فریق مخالف کے اعتراضات اور بھی کافی ہیں - مگر ہم نے چند ایک بطور مُشتے نمونہ از خروارے آپ کے سامنے عرض کر دیئے ہیں - ایک عقل مند کے لئے ان میں کافی عبرت موجود ہے - یہ الگ بات ہے کہ مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ اس عدد سے اپنی گیارھویں ثابت کرنا شروع کردیں - رَأَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا -

یہ اعتراضات جو پیش کئے گئے ہیں محض عوام ہی کے نہیں بلکہ فریق مخالف کے بڑے بڑے محقق یہ اعتراضات اُٹھا رہے ہیں - چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ " کیونکہ دیوبند کا مدرسہ ، وہاں کا نصاب ، دورہ حدیث شریف ، تنخواہ لے کر مدرسوں کا پڑھانا ، امتحان اور تعطیلات کا ہونا ، آج قرآن پاک میں اعراب لگانا ، قرآن و بخاری چھاپنا ، مصیبت کے وقت ختم بخاری[1] کرنا جیسا کہ دیوبند میں پندرہ روپے لے کر کرایا جاتا ہے (یہ مفتی صاحب کا مفتیانہ اجتہاد ہے - ورنہ راقم الحروف بحمد اللہ تعالیٰ دیوبند کا خوشہ چین ہے ، وہاں پندرہ روپے کی کوئی تعیین نہیں ہے - حسن اتفاق کا معاملہ ہی جُدا

---

[1] نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ " ختم ایں کتاب مبارک برائے شفا ہیں بیمار و صون از نوازل و حوادث زمان مجرب است زیرا کہ در حکم رقیہ است و جواز رقی باحادیث ثابت بشرطیکہ دراں چیزے از شرک نباشد و در صحیح بخاری شرکی از اشراک ملیست اھ (ہدایۃ السائل ص۳۷۴)

ہے اور بغیر اُجرت ہے ہی ہم نے یار ہا وہاں ختم کیا ہے)۔ بلکہ سارا فنِ حدیث بلکہ خود احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بلکہ خود قرآن کا کاغذ پہ جمع کرنا، اس میں رکوع بنانا، اس کے تیس سیپارے کرنا وغیرہ وغیرہ سب ہی دینی کام ہیں اور بدعت ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ان میں سے کوئی کام نہ ہوا۔ بولو یہ حرام ہیں یا حلال ؟" (بلفظہٖ جاء الحق ص۲۱۲) - ان اعتراضات کے جوابات عرض کر دیئے گئے ہیں، ملاحظہ فرمالیں۔

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت امام الانبیاء سید الرسل خاتم النبیین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ یہی پہلو ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور معصیت کے راستہ سے ہرگز اس کو راضی نہیں کیا جا سکتا۔ (لما جاء فی الحدیث ان اللّٰہ لاینال فضلہ بمعصیۃ - مستدرک ج ۲ ص۴) - اور جس پہلو کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ترک کر کے اُمت کو بتایا ہے، ہمارے لئے بھی اس کا ترک کرنا ہی سنت ہوگا اور صرف اسی پہلو کو لینا اللہ تعالیٰ کی محبت کی دلیل ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے:

ان اللّٰہ یحب ان یوخذ برخصتہ کمایکرہ ان تؤتٰی بمعصیتہ رواہ احمد وابن خزیمۃ فی صحیحہ (فتاویٰ ابنِ تیمیہ ج ۱ ص۱۵)

تحقیق سے اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے کہ اسکی رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے۔

یہ روایت مسندِ احمد ص۱۰۸ ج۲ اور موارد الظمآن ص۲۲۸ اور ص۱۴۵ و درِ منثور ص۱۹۳ ج۱ میں حضرت ابنِ عمرؓ سے اور ص۲۲۸ میں حضرت ابنِ عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ہمیں حضرات صحابہ کرامؓ کی بے تکلف زندگی کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت مُلا علی قاریؒ نے حدیث اقلھا تکلفا کی شرح میں ان کی سادہ زندگی کا نقشہ کھینچ کر بتایا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ ذکر اور درود شریف مسجدوں یا گھروں میں حلقہ بنا کر بلند آواز سے نہ پڑھتے تھے۔ وہ اپنے اجسام کے لحاظ سے فرشی تھے لیکن اپنے ارواح کے اعتبار سے عرشی تھے۔ ظاہری طور پر تو وہ مخلوق کے ساتھ تھے مگر باطن کے رُو سے مخلوق سے جُدا ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ تھے (مرقات ج ۱ ص۲۰۶)

اور شاطبیؒ لکھتے ہیں :

واما ارتفاع الاصوات فی المساجد فناشئ عن بدعة الجدال فی الدّین (الاعتصام ج ۲ ص ۲۵۶)۔

یعنی مسجدوں میں آواز بلند کرنا، تو یہ دین کے اندر جھگڑا کرنے کے لئے بدعت گھڑی گئی ہے۔

اے مالک! تو بے نیاز ہے۔ تو اس حقیر کی ظاہری اور باطنی لغزشوں کو معاف کر دے۔ تیرے بغیر کون معاف کر سکتا ہے؟ اے خالق! تو جسمانی اور روحانی بیماری سے نجات دے، تیرے بغیر کون ہے، جس کے آگے ہم ہاتھ پھیلائیں؟ تیرے دروازہ کو چھوڑ کر اور کہاں جائیں تو ہی کارسازی فرما! ؎

دینا ہے اپنے ہاتھ سے اے بے نیاز دے
کیوں مانگتا پھرے ترا سائل جگہ جگہ

وصلّی اللہ تعالیٰ علیٰ سیّدنا صاحب لواء الفخر محمّد وعلیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وازواجہٖ وجمیع من تبعہٖ الیٰ یوم الدّین، آمین یا ربّ العٰلمین!

احقر العباد
ابو الزّاھد محمّد سرفراز خان صفدر خطیب جامع گکھڑ
و مدرّس مدرسہ نصرة العلوم جامع مسجد نور متّصل گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ
(الحنفی مذھبًا والحسینی مشربًا)
۲۶ ذوالحجہ ۱۳۷۶ھ، ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء
یوم الخمیس بوقت عصر۔ گکھڑ۔